لکھنؤ

سرفراز

ہر چند اہلِ جور نے چاہا یہ بارہا
ہو جائے محو یادِ شہیدانِ کربلا
باقی رہے نہ نام زمیں پر حسینؑ کا
لیکن کسی کا زور عزیزو نہ چل سکا
عباسؑ نامور کے لہو سے دُھلا ہوا
اب بھی حسینیتؑ کا علم ہے کھلا ہوا

(جوش ملیح آبادی)

ایڈیٹر: مصطفےٰ احسن رضوی



آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا آرگن

ہفتہ وار سرفراز لکھنؤ

دبیر نمبر

جلد ۵۵ | لکھنؤ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۶ء مطابق ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ | نمبر ۱

ایڈیٹر
مصطفیٰ حسن رضوی

(دبیر نمبر کے مرتب)
کاظم علی خاں

قیمت محترم نمبر:- پانچ روپیہ
چندہ سالانہ: ۱۶ روپیہ

سید انصار حسین پرنٹر و پبلشر
نے برائے آل انڈیا شیعہ کانفرنس
سرفراز قومی پریس میں چھپوا کر
دفتر سرفراز ۱۰۱/۱۰ ان محل روڈ
لکھنؤ سے شایع کیا

فہرست مضامین

جعفر علی خاں اثر لکھنوی مرحوم

مرزا دبیر کا ایک مرثیہ

زیرِ نظر مرثیہ میں کل اٹھارہ بند ہیں۔ کربلا کے مسافر کا لُٹا ہوا قافلہ شہادتِ امام حسینؑ کے بعد فوجِ یزید کی نگرانی میں اسیر و پابجولاں شام کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ راہ میں قلعۂ شیریں پڑتا ہے۔ فوج کی آمد آمد کی خبر پھیلتی ہے اسی کے ساتھ فرزندِ رسولؐ کا نام بھی آتا ہے۔ شیریں کو یقین ہوتا ہے کہ میرے آقا حسبِ وعدہ مجھے سرفراز کرنے اور مہمانی کا شرف بخشنے تشریف لاتے ہیں۔

(۱)

جب حرم قلعۂ شیریں کے برابر آئے
غل ہوا کعبے سے مولیٰ مع لشکر آئے
کہا شیریں نے کہ ارمانِ دلی بر آئے
میرے مولا مرے سلطاں مرے سر پر آئے
شانِ حق، نورِ خدا، قدرتِ باری دیکھو
جاؤ لوگو مرے آقا کی سواری دیکھو

چوتھے مصرع میں ایک ہی مفہوم کے الفاظ کی تکرار نے شیریں کے شوق و انبساط کی تصویر کھینچ دی۔ ہر لفظ سے ادب اور ادب کے ساتھ محبت ٹپکتی ہے۔ مسرت کی عالی ظرفی کا تقاضا ہے کہ اور لوگ بھی اس خوشی میں شریک ہوں اور شرف و سعادت حاصل کریں۔ بیت میں یہی خیال نظم ہے آخری مصرع کا طرز ایسا ہے کہ گویا امام کی سواری شیریں کی آنکھوں کے سامنے ہے اور کمالِ تزک و احتشام و وقار سے اُن کے گھر کی طرف آ رہی ہے۔ آرٹ کے لحاظ سے یہ اسلوب نہایت ضروری تھا کیونکہ بعد کی مایوسی کے اثرات کو اس نے دس گنا شدت کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔

(۲)

جن سے روشن ہے مدینہ وہ قمر آئے ہیں
جن کا معدن ہے نجف ہیں وہ گہر آئے ہیں
جن کا گھر عرش پہ ہے وہ مرے گھر آئے ہیں
(یہ خبر اُس کو نہ تھی نیزوں پہ سر آئے ہیں)
کہہ رہی تھی کہ چراغِ حرمین آتا ہے
اے مسلمانو مبارک ہو حسینؑ آتا ہے

پہلے تین مصرعوں میں انتہائے مسرت و شادمانی کا اظہار ہوتا ہے۔ شیریں اپنی قسمت پر غبطہ کر رہی ہے۔ سامعین کا ذہن چوتھے مصرع میں کسی قسم کے جذبہ کا متوقع ہوتا ہے مگر شاعر ایسی بات کہہ دیتا ہے جس کا گمان نہ تھا۔ قوی اور متضاد جذبات کے ناگہانی تصادم سے خوشی سے بھرے ہوئے دل کو ایسا دھچکا لگتا ہے کہ خیال کی رو بدل جاتی ہے نشاط کے بدلے شدید جذبۂ حزن و یاس طاری ہوتا ہے کلیجہ منھ کو آنا چاہتا ہے۔ آنسو آنکھوں کا راستہ ڈھونڈتے ہیں مگر روزن گھٹ گھٹ کے رہ جاتے ہیں۔ اُبھرنے

کی ایک آخری سعی کر کے دل ڈوبنے لگتا ہے اور اشک مچل مچل کے سسکیاں بھر بھر کے سو جاتے ہیں۔ ارمان ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مرجاتے ہیں کیونکہ غم کی شٹھر سے دل برف کا ٹکڑا بن گیا اور اشکوں سے روانی کی طاقت سلب ہو گئی۔

ڈرامیٹک آرٹ (فنِ تمثیل نگاری) کے نقطۂ نظر سے دیکھئے تو پُرکار شاعر سامعین کے ذہن کو آمادہ اور جذبۂ ہمدردی کو انگیختہ کرنے کی غرض سے ابتدا ہی میں اس دردناک حالت کا دھندلا سا خاکہ کھینچ دیتا ہے جو حقیقت سے مطلع ہونے پر شبریں کے دل کو ہوتی ہو گی تاکہ اختتام تک پہنچتے پہنچتے جذبات کا سیلاب اپنے ساتھ بہائے جائے اور ایسا معلوم ہو کہ واقعہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ پیش نظر ہے۔ کانوں سے سُن نہیں رہے ہیں بلکہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اسٹیج کی مدد سے بھی ایسی کیفیات طاری کر دینا کمالِ فن سمجھا جاتا ہے محض الفاظ سے تکمیل تو سحر بلکہ اعجاز ہے۔

(۳)

حیدری صف میں حسینی علم آتے ہوں گے
ہاشمی دبدبہ ہاشم کا دکھاتے ہوں گے
نوبتی داخلہ کا طبل بجاتے ہوں گے
خضر اس قافلہ کو پانی پلاتے ہوں گے
دل کو نورِ رُخِ مولےٰ سے تسلی ہو گی
کوہ پر طور کی مانند تجلی ہو گی

(۴)

میری بی بی کی امیرانہ سواری ہو گی
ناقے پر عرش کی مانند عماری ہو گی
مسندِ نور پہ کسریٰ کی وہ پیاری ہو گی
گھنا سب تحفہ تو پوشاک بھی بھاری ہو گی
بیر تیرا نور کی ہاتھوں میں کتنا دم ہوں گے [illegible]
نور تجلی [illegible] جا رہی ہیں [illegible] ہوں گی

(۵)

بی بی گودی میں سکینہؑ کو بٹھائے ہوں گی
کاندھے سے اصغرِ ناداں کو لگائے ہوں گی
چاند سے ٹکڑوں کو دامن میں چھپائے ہوں گی
دونوں پر گوشۂ دامن کو اڑھائے ہوں گی
یہ نہ معلوم تھا اصغرؑ نہیں اکبرؑ بھی نہیں
تاج و مسند تو کہاں مقنع و چادر بھی نہیں

بیر اذوق جہاں مجروح ہو گا مگر ذرا اعلان کر دوں گا۔ میرا یقین ہے کہ مرزا دبیر ہوں۔ تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں نہ صرف لفظ دامن کی تکرار ناگوار ہے بلکہ دونوں میں ایک ہی مضمون کی تکرار بھی ہے۔ علاوہ بریں چوتھے مصرعے میں لفظ پر کے ساتھ اڑھانا خلافِ زبان و روزمرہ ہے۔ دونوں کو گوشۂ دامن اُڑھائے ہوں گی یا دونوں پر گوشۂ دامن ڈالے ہوں گی۔ کہنا چاہیئے تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ چوتھے مصرعہ میں دامن کی جگہ چادر کہا ہو۔ کاتب نے کچھ کا کچھ لکھ دیا ہمیں دبیر کی منقصت منظور نہیں اور ایسی چھوٹی چھوٹی فروگزاشتوں سے اُن کے کمال پر حرف نہیں آتا۔ تاہم ناقد کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی جن کی تعداد قلیل ہے دکھاتے جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیں سے لغزش ہو جائے۔ متنبہ ہونے پر انشاء اللہ بطیب خاطر اعتراف کر لیں گے۔

(۶)

تھا خیال اُن کو کہ چوگرد تو بیادر ہوں گے
بیچ میں لشکرِ اسلام کے سرور ہوں گے
گھوڑے پر تا تو زینبؑ کے برابر ہوں گے
محمل کا اُٹھائے علی اکبرؑ ہوں گے
واں نہ محمل تھا نہ حشمت تھی نہ زیبائی تھی
سر شبیرؑ کے ہمراہ بہن آئی تھی

چوتھے مصرع سے حضرت زینبؑ کے احترام کے علاوہ

یہ بلاغت کی بلندی ہے کہ حضرت علی اکبرؑ محمل کا پردہ اٹھائے ہوئے ہیں کہ جب آقا رہے اور محمل میں پھوپھی کا دم نہ گھٹے۔

(۷)

کہتی تھی قاسمؑ و کبریٰ کی ہوئی ہے شادی
دولہا آقا کا بھتیجا ، دلہن آقا زادی
دل کی اس بیاہ کی میں نذر مبارکبادی
یہ نہ تھا علم کہ شادی میں ہوئی بربادی
گھونگھٹ اُلٹا جو دلھن نے یہ تماشا دیکھا
بیاہ کے تخت پہ نوشاہ کا لاشا دیکھا

بیت میں غضب کی مرثیت ہے لیکن ہم پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ لفظ "تماشا" کھٹکتا ہے۔ ایسے قیامت کے منظر کو تماشا کہنا بے محل اور خلاف ادب ہے۔ "نقشا" کہیں بہتر تھا۔ ع

گھونگھٹ اُلٹا جو دلھن نے تو یہ نقشا دیکھا

(۸)

شرکت آمد سادات کا سُن سُن کے بیاں
مرد و عورت ہوئے قریہ سے زیارت کو رواں
اور مدارات کا شیریں نے کیا یاں ساماں
فرش آنکھوں کا کیا جھاڑ کے پلکوں سے مکاں
ظرف دھو دھو کے رکھے آب و غذا کی خاطر
کھانے طیار کئے آلِ عبا کی خاطر

(۹)

مسند آراستہ کی سبطِ پیمبر کے لئے
کشتیاں چُن کے رکھیں عترتِ حیدر کے لئے
جھولا دالان میں ڈالا علی اصغرؑ کے لئے
لا کے گلدستے برابر رکھے اکبرؑ کے لئے
جام شربت کے بھرے ابنِ حسنؑ کی خاطر
گہنا پھولوں کا منگا رکھا دلھن کی خاطر

آٹھویں بند کے آخری تین مصرعوں اور پورے نویں بند میں بظاہر ضیافت مہمانداری کے ساز و سامان کی تفصیل ہے مگر اس کی تہہ میں جذبات کی ایک دنیا ہے۔ آنکھیں بچھانا محاورہ ہے یعنی انتہائے خلوص و تپاک سے پیش آنا "مکان کو پلکوں سے جھاڑنا" کہہ کر شاعر نے مبالغہ میں اور اضافہ کر دیا اور اسی کے بقدر اظہار خلوص میں ترقی ہوئی۔ جاروب سے پلکوں کی مشابہت ظاہر ہے۔ نیز یہ خوبی پیدا ہوئی کہ مکان پہلے جھاڑا جاتا ہے پھر فرش بچھایا جاتا ہے۔ آنکھوں کے فرش کے لئے مژگاں کی ہی جاروب موزوں ہے۔ ظرف دھو دھو کے رکھنے سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ صاف ستھرے نہ تھے بلکہ یہ مہمانداری کی چیز ہے جو گھر کے کونے کونے کا جائزہ لیتی اور موہوم گرد کو جاروب مژگاں سے جھاڑ کر آنکھیں بچھاتی ہے۔ ظرف دھونا بھی خیالی گرد سے پاک کرنا ہے۔ کھانا عبث جمع میں ہے۔ یعنی انواع و اقسام کے کھانے طیار کئے۔ نویں بند میں یہ دکھایا ہے کہ شیریں اپنے معزز مہمانوں کی کیسی مزاج داں اور مرتبہ شناس تھی۔ سب سے زیادہ احترام امام حسینؑ کا ہے۔ اُن کے واسطے مسند بچھائی۔ عترت رسول کے لئے کشتیاں سجیں۔ شیر خوار علی اصغرؑ کے لئے جھولا ڈالا علی اکبرؑ نوجوان ہیں۔ اُن کے لئے پھولوں کے گلدستے چنے۔ جوانی اور پھولوں دونوں کی دنیا رنگ و بو ہے۔ دونوں میں ربط ہے۔ دبیر کی لطافت احساس اور حسنِ انتخاب تعریف سے مستغنی ہے۔ ذوق کو رہبر بنائیے اور مزے لیجئے۔ اسی طرح قاسم "بنے" کے لئے شربت کے جام اور ان کی دلہن کے لئے پھولوں کے زیور کی تخصیص میں نفسیات کے عجیب عجیب نازک اور پر اسرار مسائل کی طرف اشارہ ہے۔ تفصیل میں دبیر کے نیاز کردہ آبگینوں کو ٹھیس لگنے کا ڈر ہے۔

اب کیا اہتمام رہ گیا؟

(۱۰)

رونق دی سامنے دروازے کے پردے کی قنات
اور چلائی ہمسائیوں کو وہ خوش اوقات

صاحبو جوڑ کے ہاتھوں کو یہ کہتی تھی یہ بات
جب اُترنے لگیں سادات رفیع الدرجات
بانو مردوں کا تو دروازے سے بڑھنا دینا
اپنے لڑکوں کو بھی کوٹھوں پہ نہ چڑھنے دینا

"رفیع الدرجات" شیریں کی زبان سے اچھا معلوم نہیں ہوتا خصوصاً تیسرے مصرعے کے بعد میں جس میں بے حد نرمی اور گرمی ہے۔

(۱۱)

دفن زہرا کی تو تربت بھی نہ ہو گی ظاہر
دختریاں رات کو نکلی تھیں جنازہ لے کر
ساتھ اولاد کے مردوں میں فقط تھے حیدر
یا حسین اور حسن پیٹتے تھے سینہ و سر
رہ گئی صبح کو پیاری جگر زینب سے
شمس طالع نہ ہوا دن پہ حکم رب سے

اس اہتمام کے بعد جو بے حد افتخار و اشتیاق کا ترجمان ہے یہ خبر سن کر شیریں کے دل پر کیا گزری ہوگی؟

(۱۲)

ناگہاں رات میں برپا ہوا اک شور و شر
سن کے شیون کو ہوا دل شق ہوئی تیغ ستم
دیکھنے کو جو گئے تھے حشم شاہِ امم
تھے تڑپتے ہوئے مرد اور تھے خاک اڑاتے باہم
سخت بے چین ہوئی طالبِ آرام حسین
دل پہ انگشتِ شہادت سے لکھا نام حسین

دوسرے شعر کی تخاطب قابلِ دید ہے۔ بیت میں ایک خاص رسم کو موقع کے لحاظ سے ہر ادائی کے ساتھ نظم کر دیا کہ جان اندر خطرہ زوال کی وقت دل پر انگشتِ شہادت سے یا علی لکھتے ہیں۔ گھوڑے کی سواری کو "جنازہ روان" کہتے ہیں۔ گھوڑے پر سوار ہونے سے پہلے اس کی گردن پر انگلی سے یا علی لکھتے ہیں (یا لکھتے تھے)

خواب پریشاں سے حفاظت کے لئے سوتے وقت سینہ پر یا علی لکھتے ہیں۔ یہ سب لکھنا انگشتِ شہادت کی جنبش سے ہوتا ہے۔ شیریں انگشت سے "یاحسین" لکھ کر اپنے خوف زدہ دل کو تسکین دیتی ہے۔ دبیر کی یہ نزاکتِ تخیل یہ تصرف داد سے بے نیاز ہے۔

(۱۳)

بولی شوہر سے خبر لاکر یہ غل ہے کیسا
کس پہ آفت پڑی گھر کس کا لٹا کون موا
رونے والوں کو مری سمت سے جا کر سمجھا
بدشگونی نہ کرو آتا ہے ابن زہرا
یہ محل شکر کا ہے وقت مناجات کا ہے
داخلہ آج بر آوردۂ حاجات کا ہے

ساتھ ہی یہ خیال ہوتا ہے کہ جس پر آفت پڑا ہے میری بدشگونی ماننے سے رونا پیٹنا کیوں بند کرنے لگے لہٰذا شوہر سے کہتی ہے کہ ان کو یقین دلاؤ۔

(۱۴)

عقدے کھل جائیں گے جب ہونٹ ہلا دیں گے حسین
گر کسی پیارے سے بچھڑے ہو ملا دیں گے حسین
مر گیا ہوگا جو کوئی تو جلا دیں گے حسین
جام صحت کا مریضوں کو پلا دیں گے حسین
ایک شبیر کو اللہ نے کیا کیا بخشا
رخِ یوسف، کفِ موسیٰ، دمِ عیسیٰ بخشا

چھٹے مصرع سے فارسی کا یہ مطلع بے اختیار یاد آ جاتا ہے ؎

حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

حسنِ یوسف کے بدلے رخِ یوسف، یدِ بیضا کی جگہ کفِ موسیٰ کہنے سے مصرع الگ نہیں ہو جاتا ایسے موقع پر انھیں الفاظ کو دہرا دینا تصرف کرنے سے بہتر ہے تاکہ

عورتوں کا بین صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھیں گر ترجمہ ہے۔

(۱۵)

ایک عورت نے یہ باہر سے پکارا ناگاہ
اے شیریں ترے ارمان ملے خاک میں آہ
گھر کا گھر ہو گیا خاتون قیامت کا تباہ
وارث آل عبا مر گیا انا للہ
ہم زیارت کو گئے تھے سو یہ محشر دیکھا
نے تری حضرت زینبؑ کو کھلے سر دیکھا

"نے" کا حرف خاص ہے اور اس دو حرفی لفظ میں وسیع معنی پنہاں ہیں گویا وہ عورت شیریں سے کہتی ہے کہ تم نے تو کہا تھا کہ مولیٰ کی سواری بڑی شان و شوکت سے آ رہی ہے اور یہاں صورت حال اور ہی کچھ ہے۔ اس لفظ سے شیریں کے قول کی تردید کے ساتھ حیرت اور مایوسی کا بھی اظہار ہے۔ جس سے تردید کا لہجہ نرم ہو گیا اور ہمدردی شامل ہو گئی۔

"ایک عورت نے یہ باہر سے پکارا ناگاہ"
کوتاہ نظر اعتراض کر دیں گے کہ جب آواز دینے والا نامحرم مرد نہ تھا بلکہ عورت تھی تو باہر سے پکارنا کیا معنی؟ لیکن اس طرح نہ صرف واقعہ کی اہمیت بلکہ ڈرامائی اثر کم ہو جاتا۔ عورت اس قدر بے تاب اور گھبرائی ہوئی تھی کہ دروازے کے باہر ہی چلانے لگی اور شیریں یہ خبر بد سن کے ایسی بدحواس ہوئی کہ دیوانہ وار گھر سے نکل پڑی۔

(۱۶)

بے تحاشا وہ یہ کہتی ہوئی دوڑی باہر
خاک منہ میں ترے کس منہ سے یہ دی ہے خبر
کون زینبؑ جسے دیکھ آئی ہے تو ننگے سر
وہ پکاری کہ حسین ابن علیؑ کی خواہر
اک نقطہ میں ہی نہیں دیکھ کے سب آئے ہیں

ولیماں باندھ کے گردن میں حلقہ ہے پیں

(۱۷)

جس کا بابا ہے علیؑ شیر خداوند زینبؑ
جس کا جد فخر رسولان بداوند زینبؑ
جس کا اک بھائی ہے شاہ شہداوند زینبؑ
جس پہ تھے شبر و شبیر فداوند زینبؑ

وہ زینبؑ نہیں حاشا یہ تری زیادتی ہے
بھائی مارا گیا اللہ سے تو یاری ہے

"اللہ سے زیادتی ہے" اس ٹکڑے نے حضرت زینبؑ کے کیریکٹر کو کس شان سے نمایاں کیا اور کوئی عورت ہوتی تو اپنے بھائی کے قاتلوں کو بددعا دیتی یا ہر کس و ناکس سے امداد کی طالب ہوتی مگر زینبؑ فقط اپنے اللہ سے فریادی ہے وہ بھی ان مظالم پر نہیں جو خود ان پر گزرے بلکہ بھائی کے بے گناہ قتل پر

(۱۸)

بخدا حضرت زینبؑ تو انہیں کہتے ہیں ہم
نوج میں اور ہی القاب ہیں زہراؑ کی قسم
کوئی "بھائی مولیٰ" کہتا ہے کوئی کشتۂ غم
کوئی کہتا ہے عزادار شہنشاہ امم
نوج جو چاہتی ہے لعین سے کہہ جاتی ہے
دیکھ کر اک سر پُرخوں کو وہ رہ جاتی ہے

آخری مصرع کی شرح تو ایک دفتر درکار ہے۔ پھر بھی اس خوبی سے مطلب ادا نہ ہو گا جو ان لفظوں میں محفوظ ہے۔ ع

"دیکھ کر اک سر پُرخوں کو وہ رہ جاتی ہے"

علیؑ کی بیٹی جس کے سر سے چادر سرک جائے تو شرم سے آفتاب نہ نکلے سر برہنہ کس بے حرمتی سے شہر بہ شہر پھرائی جاتی ہے۔ مقدور بھر نثار ہے دوحانیت تائب ہے۔ پھر بھی سب کچھ سنتی ہے، برداشت کرتی ہے اور اُف نہیں کرتی اس

لئے کہ بھائی نے جس عظیم کام کا بیڑا اٹھایا تھا (کہ حق باطل کے سامنے نہ جھکے) بنا بنایا بگڑ نہ جائے۔ حسینؑ نے محض انسانی طاقتوں سے حق کی حمایت میں باطل کا مقابلہ کیا۔ الوہی امامت کو دخل نہیں دیا تاکہ اسلام نہ صرف وسیلۂ نجاتِ اخروی بلکہ بہترین اخلاق، بہترین تہذیب، بہترین نظامِ عمل ثابت ہو۔ انسان پر ایک وقت میں جتنی مصیبتیں پڑ سکتی تھیں جمع ہو گئی تھیں مگر اس خدیوِ حق کے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہیں ہوئی۔ تنہا حسینؑ سے یہ کارِ نمایاں سرزد ہوتا تو تنہا آزمائش میں پامردی و پا ثباتی دکھاتے تو ان کی مثال ہمت افزا ہونے کے عوض ہمت شکن ثابت ہوتی۔ ایسے سورما مانے جاتے جن کی تقلید ناممکن ہے (بدقسمتی سے ایسی ذہنیت کے لوگ پھر بھی پیدا ہو گئے) مگر اس مختصر جماعت میں جس نے روزِ عاشورا ہمت و استقلال کا ایسا شاندار مظاہرہ کیا کہ ہر طبقے اور ہر حیثیت اور عمر کے لوگ شامل تھے۔ اور ہر پایہ کے شخص کے لئے درخشاں مثال موجود ہے۔ یہ دعوتِ عمل مردوں تک محدود نہیں بلکہ عورتوں کے لئے بھی ہے ادھر مردوں میں حسینؑ اور ان کے عزیز و انصار ہیں جن میں حُر کا غلام بھی ہے تو ادھر عورتوں میں زینبؑ سی بی بی اور فضہ سی کنیز ہے اور جو بھی حق پرستی و وفا شعاری کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے بساط بھر قربانیاں کیں اور صرف اسلام کے احیا اور بقا کی خاطر جو ہے راستی اور حق پرستی کا علمبردار ہے۔

(۱۹)

پیٹ کر منہ کہا شیریں نے کہ ہیں جیسے خطا
سب پہ ٹھیک تو دیتی ہے نہیں فرق ذرا
پھر غضب ہو تو ہی شک میرا ہے بتا کہ بجا
کون لوٹے گا پیمبر کی نواسی کو بھلا
کھول دیتے تھے علیؑ صاحبِ تقصیر کے ہاتھ
باندھ سکتا ہے کوئی خواہرِ شبیرؑ کے ہاتھ

شیریں اس عورت کو طیش میں کہہ چکی تھی: خاک منہ میں ترے! اب اس کی معذرت کرتی ہے۔ پھر اپنے اشتباہ کی وجہ بیان کرتی ہے کہ حضرت زینبؑ پیمبرؐ کی نواسی ہیں اور علیؑ ایسے جواد تھے کہ صاحبِ تقصیر کے بندھے ہاتھ کھول دیتے تھے۔ اس عقدہ کشائی سے اپنے قاتل کو بھی محروم نہ رکھا۔ پھر شبیرؑ سا جاں نثار بھائی امامِ عصر موجود ہے کس مسلمان کو ایسی گستاخی کی جرأت ہوئی ہو گی یا غیرت گوارا کرے گی کہ زینبؑ کے ہاتھ باندھے۔ یہ عورت حضرت زینبؑ کے ایک بھائی کو شاہِ شہدا کہہ چکی ہے۔ (بند نمبر ۱۷۔ مصرع نمبر ۳) ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ شیریں اسی لفظ کو پکڑ لیتی ہے۔

(۲۰)

کون بھائی مری بی بی کا ہے شاہِ شہدا
ہے لقب شبر و شبیر کا سید میں فدا
مرتضیٰ کہتے تھے عباسؑ کو شمشیرِ خدا
اور جو زینبؑ کے ہیں بھائی لقب ان کے ہیں جدا
نہ یقین ہونے کا باعث بڑا ہے یہ بھینا
کہنے اور سننے میں کچھ فرق پڑا ہے بھینا

اور بعض نسخوں سے (دیگا) بروزن فاع! غور ہونا چاہئے مرزا دبیر نے فع یا فعل نظم کیا ہے جس سے فصحا احتراز کرتے ہیں (بند میں دو مصرع نمبر ۴) تو واؤ کا اخفا خاص طور پر محلِ نظر ہے کیونکہ معنی میں بھی اہمال پیدا کرتا ہے۔

(۲۱)

یاد ہے جب کہ ستی شاہِ عجم کی سرکار
لوٹنے والے مسلمان، عجم تھے کفار
پر ردائے دخترِ کسریٰ کی نہ چھینی زنہار
اب یہ اندھیر زمانے میں پڑا کیا اک بار
بنتِ زہراؑ کی نہ کی مرتبہ شناسی ہے ہے
ننگے سر احمدِ مرسل کی نواسی ہے ہے

...اندھیرا ہوتا ہے نہ کہ اندھیر پڑا۔

بات سے بات نکال کر سلسلہ قائم رکھنا مرثیہ نگاری میں کمال بجلی کا ثبوت ہے۔ حضرت شہربانو (دختر کسریٰ) کا ذکر آگیا۔ شبیرؑ کو خیال ہوا کہ پوچھوں وہ بھی اس قافلے میں ہیں۔ اگر نہیں ہیں تو اس قافلے کا حسینی قافلہ ہونا مشتبہ ہے۔

(۲۲)

شہربانو بھی بھلا واں تجھے آئی تھی نظر
بولی وہ جھوٹ میں کیا ہے کہ کہوں اے مضطر
حال زینبؑ سے میں بیحال ہوئی رو رو کر
نہ خبر اپنی رہی پھر پوچھوں جو بانو کی خبر
رہ گیا مجھ سے کہ پرسہ۔ جو وطن میں ہوں گی
اور جو یاں ہیں تو گرفتار رسن میں ہوں گی

(۲۳)

کہا شبیرؑ نے کہ بس بس ہوا دل کو آرام
دائماً پہلوئے زینبؑ میں ہے بانو کا مقام
ہر یہ بی بی ہے کوئی بنت علیؑ کی ہمنام
اس کی مشکل کو بھی آسان کرے ربِ انام
جان کی خیر ہو بچھڑا ہوا بھائی مل جائے
نام زینبؑ کے تصدق میں رہائی مل جائے

مگر دل کو تسکین نہیں ہوتی اور تصدیق کرنی ضروری ہوتی ہے۔

(۲۴)

آن کی طرح روانہ ہوئی پھر وہ ناچار
ہر قدم کہتی تھی یارب یہ غلط ہوں اخبار
پر جو مقتل میں آئی تو یہ دیکھا اک بار
تیغیں کھینچے ہوئے پھرتے ہیں طلایہ کے سوار
نوبتیں بجتی ہیں ہر سمت خوشی ہوتی ہے
ایک بی بی ہے وہ سر کھولے ہوئے روتی ہے ٹ

(۲۵)

ایک لشکر ہے کسی لوٹ کے گھرے میں پڑا
اک طرف لوٹ کے اسباب پہ پہرا ہے کڑا
روک ٹوک آمد و شد میں ہے تشدد ہے بڑا
دل اسی مال سے ہے لشکر جنگی کا لڑا
کفر و بدعت ہے شریعت نہیں اسلام نہیں
سب تجمل ہے یہ رونق کا کہیں نام نہیں

آخری تین مصرعوں میں اس وقت کے عام مسلمانوں کا پورا نقشہ ہے۔ مال دنیا کی حرص۔ کفر و بدعت ظاہری طمطراق مگر نور ایمان کی جھلک نام کو نہیں۔

(۲۶)

نقرئی اور طلائی ہیں علم۔ بو قلموں
اور پھریرے ان پر رقم نام یزید ملعون
بوق و نقارہ و قرنا و دہل حد سے فزوں
نیزہ و گرز ہیں آلودہ ہے مقتولوں کا خون
اک علم نیچے ہیں مشکیزہ بندھا خاک پہ ہے
کہکشاں نور سے اس کے تجمل افلاک پہ ہے

چوتھے مصرع میں ان لوگوں کے کیرکٹر کا لب لباب ہے سپاہی اپنے اسلحہ جات زبراق رکھتا ہے۔ مگر ان کمینوں نے اپنے آلات حرب کو خون آلودہ چھوڑ دیا ہے تاکہ ڈینگ ہانکنے اور فخر کرنے کا موقع ملے کہ ہم نے حسینؑ اور انصار حسینؑ کا خون بہایا۔ ان کے دل میں چور ہے کہ ان کی بات کا یقین نہ آئے گا لہٰذا ثبوت میں پیش کرنے کو یہ اسلحہ خون آلودہ رہنے دیئے ہیں۔

ٹ ایک قلمی مرثیے میں یہ مصرع اس طرح رقم ہے ع
بال کھولے ہوئے اک بی بی کھڑی روتی ہے
(اثر)

(۲۷)

جشن ہے، رقص ہے اور انجمن آرائی ہے
دور ساغر کا تہ گنبد مینائی ہے
کہیں صرافہ و بزازہ کی زیبائی ہے
گرم بازار ہی ہر ذلت و رسوائی ہے
اہل لشکر طرب و عیش کا دم بھرتے ہیں
سر کٹے نیزوں پہ تسبیح خدا کرتے ہیں

آخری مصرع ایسے عیش کو ابد الآباد تک ذلیل و مردود اور ان خون خوار انسانوں کو درندوں سے بدتر ثابت کرنے کو کافی ہے۔

(۲۸)

دو رسے تھامے ہوئے ہاتھوں میں کئی سو کفار
گرد ہیں قیدیوں کے ظلم و ستم پر طیار
دم بدم ہے یہی قدغن کہ اسیرو ہشیار
غل نہ کرنا ابھی سوتے ہیں ہمارے سردار
خاک جو بالوں پہ ڈالو گے تو تم جانو گے
منھ سے آواز نکالو گے تو تم جانو گے

بیت میں اہل لشکر کے جبر و تشدد اور اسیروں کی مظلومی و بے کسی کی دل ہلا دینے والی تصویر ہے۔ انتہا یہ ہے کہ اسیروں کو سر پر خاک ڈالنا منع ہے۔ مبادا اڑ کر یہ دھول ان کے سرداروں کے دماغ تک پہنچ جائے۔ رونا کیا آواز نکالنا گناہ ہے کہ ان کے عیش و آرام میں خلل نہ پڑے۔ یہ لوگ نماز گزار بھی نہیں کیونکہ دن چڑھ گیا مگر سو رہے ہیں۔ رات کو شغل شراب و کباب رہتا ہے اور دن چڑھے تک سو کر خمار اتارا جاتا ہے۔

(۲۹)

کوئی کہتا ہے بڑے شیر کو مارا میں نے
نہ کیا قتل سے سقے کے کنارا میں نے
ایک کہتا ہے کہ بدعت کی گوارا میں نے
سر بمشکل نبی تن سے اتارا میں نے
کوئی کہتا ہے عجم اور عرب کو مارا
اس نبی زادے کو کیا مارا کہ سب کو مارا

(۳۰)

یہ سخن قہر کا شیریں نے سنا دل جس دم
سر سے ہوش اڑ گئے رکنے لگا سینے میں دم
بے حواسی سے کیا قصد سوئے اہل حرم
چلی آہستہ بچاتی ہوئی آواز قدم
بیبیاں آمد شیریں سے خجل ہونے لگیں
بال بکھرا دیئے رخساروں پہ اور رونے لگیں

"سر سے ہوش اڑنا" میں نہیں سمجھا۔ "ہوش اڑ گئے" کافی تھا یا محاورے کی حدود میں "سر سے ہوش ہوئے" کہہ سکتے تھے۔ آخری مصرع غیرت حیا، بیکسی اور مجبوری کی ایسی تصویر ہے جس کا جواب مشکل سے ملے گا۔

(۳۱)

یک بیک کانپ کے بانوئے عجم چلائی
کہو لوگو میں کہاں جاؤں وہ شیریں آئی
ابھی خوش ہو کے سکینہ مری قسمت لائی
اب یہ جانو کہ شہنشاہ عالم کی پائی
اس کی خدمت کے سدا ذکر رہا کرتے تھے
بابا گھر جانے کو شیریں کے کہا کرتے تھے

(۳۲)

ہو یقین ہے کہ شہ دیں نے اسے شاد کیا
کربلا چھوڑ کے شیریں کا گھر آباد کیا
اس کے آنے نے مجھے فکر سے آزاد کیا
بعد مدت مرے بابا نے مجھے یاد کیا
تحفہ و ہدیہ مرے واسطے لائی ہے یہ
قبلہ و کعبہ کی بھیجی ہوئی آئی ہے یہ

ایک کمسن بچی کے خیالات کی کیسی سچی ترجمانی ہے۔

(۳۳)

بال بکھرائے ہوئے یوں منہ کو چھپاؤ اماں
کہیں ہر جائے نہ یہ آس کو بلاؤ اماں
جلد شبیر کو صدا اپنی سناؤ اماں
بھیا اکبر کی خبر پوچھنے جاؤ اماں
پیچھے پیچھے تو یہاں بندی تمھاری آئی
آگے آگے مرے بابا کی سواری آئی

"تمھاری بندی" روزمرہ ہے۔ یہاں اس نے حضرت سکینہ کا باپ سے روٹھنے کا مفہوم بھی اضافہ کیا کہ حسینؑ کی لاڈلی سکینہؑ کو یقین ہو گیا ہے کہ بابا کو میری محبت نہیں رہی۔ علی اصغر کو پانی پلانے لے کر چلے گئے اور مجھے شمر کے طمانچے کھانے کو تنہا چھوڑ گئے۔ آئندہ بند میں اس کی وضاحت ہے۔

(۳۴)

کربلا میں مرے بابا نے نہ پایا پانی
لاکے شبیر کے گھر اصغر کو پلایا پانی
ایک ہم ہیں کہ کہیں ہاتھ نہ آیا پانی
وائے تقدیر کہ سقا بھی نہ لایا پانی
کھانے مہمانی کے اس تشنہ دہن نے کھائے
ہاں طمانچے علی اصغرؑ کی بہن نے کھائے

بیت میں بے پناہ مرثیت ہے۔ علی اصغرؑ کی طرح یہ بھی بھوکی پیاسی تھیں۔ وہ سیر ہوئے مگر ان کی بہن کی قسمت میں آب و غذا کے بدلے شمر کے طمانچے تھے۔ "علی اصغر کی بہن" اس ٹکڑے میں جو طنز و نشتریت ہے اُس کا کیا ٹھکانا ہے۔

(۳۵)

جا کے تسلیم شہ دیں کو کروں گی جس دم
نیل رخساروں کے دکھلاؤں گی کانوں کا ورم
شمر بے رحم کو بلواؤں گی واں میں پر غم
اور چچا سے یہ کہوں گی تمھیں حضرت کی قسم
ڈھونڈیا شمر ستمگر کو خدارا اے عمو
اس نے برقع مری اماں کا اتارا عمو

ماں بیٹی کا مکالمہ یقیناً شاعر کے تخیل کی پیداوار ہے تاہم یہ بھی نہیں کہ حضرت سکینہ کے کردار کی صحیح ترجمانی ہے بلکہ وجدان کی رہبری نے اس کردار کو مقتضائے فطرت کے موافق بھی ثابت کر دیا ہے۔ حضرت سکینہ کمسن ہیں اور بچوں کی طرح رشک کا مادہ ان میں بھی ہے۔ خصوصاً جہاں ماں باپ کی محبت کا سوال آ جائے وہ بھی ہوتی ہیں کہ بابا نے ہم سے زیادہ علی اصغر کا خیال کیا۔ مگر اس رشک میں تلخی نام کو نہیں باپ کی محبت بدستور قائم ہے تاہم دل دکھا ہے شکوہ ضروری ہے مگر الفاظ میں نہیں رخساروں کے نیل اور کانوں کا ورم دکھایا جائے گا۔ یہ نشان زبان حال سے فریاد کریں گے کہ بابا تم جس چہیتی بیٹی کو چھاتی پر سلاتے تھے اُسے بے رحموں کے نرغے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ علی اصغر کو ساتھ لیا وہ اُنھیں کیا خبر کہ علی اصغر کا گلا ناوک حرملہ کے تیر کا نشانہ ہو گیا اور اس نے کیا قصور کیا تھا کہ میرا دھیان نہ رکھا۔ بابا تم نے پھر کے بڑے بڑے صدمے اُٹھائے۔ اس قسم کا طرز عمل دوسرے شریف خاندانوں کی لڑکیوں کا بھی ہو سکتا ہے جن کی عمر چھ سات برس کی ہو مگر یہ شرف خاندان رسالت کے ہی نونہالوں کا ہے کہ اپنے آزار پہنچانے والوں کو سزا دلوانے کی خواہش ہرگز نہیں کرتے ہیں مگر سکینہؑ کو جو اپنی ماں سے محبت ہے وہ اس کی روادار نہیں کہ اُن کی اہانت ہو اور یہ خاموش رہیں لہٰذا شمر کو اپنے نامدار چچا عباس سے سزا دلوانا چاہتی ہیں وہ بھی اس وجہ سے نہیں کہ خود اس بے دردی سے چھینے کہ کان لہو لہان ہو گئے یا اس بے رحمی سے طمانچے مارے کہ رخساروں پر اب تک نیل پڑے ہیں بلکہ اس پاداش میں کہ ماں کے سر سے ردا اُتار لی۔

دل یوں اُٹھتا ہے کہ ایسے خانوادہ کی لڑکی کا ایسا ہی
شعار ہونا چاہیئے۔ کردار نگاری کے ایسے شاندار نمونے جہاں تک
ہم لوگوں کا تعلق ہے شاید ہی کسی ملک یا زبان کی شاعری نے
پیش کئے ہوں :-

(۳۶)

کہا بانو نے میں واری نہ یہ کہہ چلا کر
شہر بانو کو نہ مارے کہیں پھر جھنجھلا کر
اپنے بچھڑے نہیں حضرت جو ملیں گے آکر
ننھا بھائی تو ہوا تیر سے گلے پر کھا کر
ابھی کیا جانیے کس کس سے خجل ہونا ہے
ننگے سر دیکھے گی شیریں مجھے یہ رونا ہے

(۳۷)

یہ بیاں تھا کہ گزر سامنے شیریں کا ہوا
بوئے سادات کی بو آتی ہے یاں صاف علی
قیدیو! نام و نسب جلد کہو بتادو اپنا
علوی ہو کہ بنی فاطمہ و آلِ طٰہٰ
پر یہ حیران ہوں جلوہ کہاں سادات کہاں
آلِ یٰسین کہاں نشۂ بدذات کہاں

(۳۸)

ہائے کچھ میری سمجھ میں نہیں آتا یہ حال
کل سے اتراتی تھی یاں آتا ہے زہرا کا لال
مری ہمسائیاں آئی تھیں پئے استقبال
دیکھ کر تم کو پھریں یاں سے وہ کھولے ہوئے بال
حالت سادات کی ہے شانِ غریبی تم میں
کوئی زینب کی بھی ہمنام ہے بی بی تم میں

(۳۹)

پاؤں ننگے میں نکل آئی ہوں شائقِ امام
ٹھنڈا ہوتا ہے وہاں گھر میں ضیافت کا طعام
بولیں بانو کوئی زینب کا نہیں یاں ہمنام
سبھی قیدی، سبھی مظلوم، سبھی ہیں ناکام
تیرا مہماں ہے صادق وہ جو گھر آئے گا
ذبح کر ڈالے گا گر کوئی تو سر آئے گا

چوتھے مصرع کی اندری خستگی۔ ٹوٹے دل کی فریاد ہے۔

(۴۰)

جانِ شیریں میں نہ باقی رہی سُن کر یہ بیاں
سب کو تھک تھک کے لگی دیکھنے ہو کر حیراں
اور پکاری کہ اس آواز کے شیریں قرباں
صدقے میں، بول رہی ہو مری شہزادی کہاں
سخن بانوئے شبیر کا انداز ہے یہ
مادرِ سیّد سجاد کی آواز ہے یہ

(۴۱)

پاؤں پر گر کے کہا سر تو اُٹھاؤ بی بی
ہائے کیا ہو گیا یہ جلد سناؤ بی بی
میرے آقا تو سلامت ہیں بتاؤ بی بی
علی اکبر کی ہوں مشتاق دکھاؤ بی بی
لو گنہگار نہ فرماؤ میں قربان گئی
علی اکبر کی تمھیں ماں ہو میں پہچان گئی

(۴۲)

کہا بانو نے کہ کیوں کر تجھے آیا باور
ہے غضب لوٹے ہیں ناموسِ امامِ اطہر
لٹ گئے آلِ نبیؐ کیا جو پھری در در
مر گیا کیا علی اکبر جو ہوئی ننگے سر
کیا نہ اپنی تھی وہ ایمان کہ پھر قید ہوئی
کیا ہوئی تھی نہ مسلمان کہ پھر قید ہوئی

استفاد بالکنایہ نے استفہامیہ انداز بیان سے مل کر اس
بند کو تاثیر کا طلسم بنا دیا ہے :-

(۴۳)

خواب میں فاطمہؑ نے اُس کو مسلمان کیا

[illegible] نے اسے ایمان کیا
یا در زینب کے گریں بیٹھ کے قرآن کیا
کس نے لوٹا اسے کس نے اُسے ویران کیا
طوق و زنجیر گنہگار کو پہناتے ہیں
یا عزادار شہِ ابرار کو پہناتے ہیں

آج کل یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ہر مسلمان صاحبِ ایمان بھی ہے کاش جس فرق کی طرف مرزا دبیر نے اشارہ کیا ہے، ہمارے پیشِ نظر رہے تاکہ نیکوکاری اور اخلاق و حسنِ سلوک کو وہی اہمیت دیں جس کے وہ مستحق ہیں اور نفس کے بندے ہو کر نام کے اسلام یا زبانی ولائے اہلبیتؑ اظہار کو اپنی بدکاری اور معصیت کوشی کا پردہ پوش نہ بنائیں۔

(۴۴)

سرِ اکبرؑ کے پھر اُٹھ اُٹھ کے کئے نظارے
اور چلائی کہ اے چشمِ نبیؐ کے تارے
حکم کیا ہے مجھے بولو علی اکبرؑ پیارے
کھو دیئے آپ نے مر کر مرے رتبے سارے
ننگے سر بلوے میں پہنے ہوئے زنجیر ہوں میں
زاری شیریں سے کہوں زوجۂ شبیرؑ ہوں میں

(۴۵)

در پردہ دل اُس سے کچھ اظہار کروں یا نہ کروں
تیری ماں ہونے کا اقرار کروں یا نہ کروں
یہ روا ہے تو میں انکار کروں یا نہ کروں
کچھ سوال اُس سے میں ناچار کروں یا نہ کروں
مر گئے سبطِ نبیؐ اب مجھے کیا ہے درکار
رانڈ بیٹی کے لئے ایک ردا ہے درکار

کس قدر دلخراش بند ہے۔ کیا نادر طریقہ اس امر کے اظہار کا نکالا ہے کہ ہاں اے شیریں میں تیری شہزادی بانو بی ہوں جسے اسلام کے نام لیوا غداروں نے اس حال کو پہنچا دیا۔

(۴۶)

سرِ ہم شکلِ نبیؐ خم ہوا شرمانے لگا
اس طرح تڑپا کہ جو نیزہ بھی تھرّانے لگا
دیکھ کر بانوئے شبیرؑ کو غش آنے لگا
سرِ پُر نور فصاحت سے یہ فرمانے لگا
شرفِ عزتِ ذاتی کہیں کم ہوتا ہے
اماں چلّا کے نہ روؤ مجھے غم ہوتا ہے

جسد سے علیحدہ سر تڑپ نہیں سکتا۔ دبیر کی صناعت نے اس مشکل پر بھی عبور حاصل کیا اور ناممکن کو اس طرح ممکن بنا کر دکھا دیا کہ نیزہ تھرّانے لگا لہٰذا یقین ہوا کہ سر جو نیزے پر تھا تڑپنے لگا۔ ہر چند سر کو تڑپتے نہیں دیکھا۔

(۴۷)

منہ پہ چلّا لیا شیریں نے یہ کر کے شور و شین
ہائے خاتونِ قیامت کے پسر ہائے حسینؑ
رو کے پُرسا کہا بانو سے یہ با شیون و شین
مجھ کو دکھلا دو سرِ سبطِ رسول الثقلین
ساتھ سر فوجِ حسینی کے تمام آئے ہیں
دیکھوں کس طرح مرے گھر میں امام آئے ہیں

(۴۸)

ہاتھ شیریں کا پکڑ کر اُٹھی بانوئے حزیں
گئی روتی ہوئی سرہانے شہیداں کے قریں
اٹھ اُٹھا کر کہا لے دیکھ لے تو اے شیریں
جس کی زلفیں ہیں بندھی نیزے سے اور شق ہے جبیں
تیرا مطلوب ہے اللہ کا یہ طالب ہے
یہ حسینؑ ابن علیؑ ابن ابی طالب ہے

آہ زلفیں ہر چند کہ شتابزدگی سے نیزے سے نہیں باندھی گئی تھیں بلکہ یہ سر اطہر اتنا پارہ پارہ تھا کہ زلفوں کو باندھے بغیر نیزے پر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

... ...

(۴۹)

غور سے اس نے نظر کی جو سرِ شہ کی طرف
دیکھا سر پیٹتے ہیں سر کے قریں شاہِ نجف
فاطمہؑ کہتی ہیں بیٹے ہے مرے مظلوم خلف
گرد نیزے کے ملائک بھی ہیں باندھے ہوئے صف
انبیا جتنے ہیں سر کھولے ہوئے روتے ہیں
اوصیا سب سرِ پُرخوں پہ فدا ہوتے ہیں

(۵۰)

اس نے انگشتِ شہادت سے اشارہ یہ کیا
السلام اے شہِ مظلوم غریب الغربا
السلام اے پسرِ فاطمہؑ زہرا شیرِ خدا
السلام اے وطن آوارہ و شاہِ شہدا
تیرے لشکر تیرے دربار کے صدقے شیریں
تیری اُلفت تیری سرکار کے صدقے شیریں

شاعر کے صحیح احساس کا اندازہ اور قدر کیجیے کہ زوجہ شیریں جو بلند آواز سے بین کر رہی تھی جب سرِ حسینؑ کے گرد انبیا و اوصیا و ملائک کا مجمع دیکھتی ہے تو اس کی رقت سلب ہو جاتی ہے اور دھاڑیں مار مار کر رونے کی بجائے صرف انگشتِ شہادت سے اشاروں میں کہتی ہے کہ السلام الخ

عقیدے سے ہٹ کر بھی دیکھئے تو شاعر کے کمال میں فرق نہیں آتا جب اس نے ایک ماحول پیدا کر لیا تو شاعرانہ صداقت اور بلاغت یہی ہے کہ اسی کے مطابق تخیل کا رُخ پھیرے۔ ملٹن یا ڈانٹے یا دوسرے شاعر جنھوں نے مافوق الفطرت امور کی مصوری کی ہے اسی سے مشہور ہیں کہ جس دنیا کے خلاف ہوتے اسے ویسی ہی مخلوق سے آباد کیا جو اُس کے لئے موزوں تھی۔

غیر مذہب کا شخص نہ مانے گا کہ سرِ حسینؑ کے گرد ایسا مجمع تھا مگر قربانی کی عظمت، روح کی جسم پر، حق کی باطل پر فتح کا منکر نہیں تو ضرور تسلیم کرے گا کہ یہ شہیدِ محترم فی الواقع اسی قابل ہے کہ روحانیوں میں بھی جو اولو العزم ہیں اس کے پروانے بنیں۔

(۵۱)

میں ترے آنے کے قربان ابا عبداللہ
واہ کیا جاہ ہے کیا شان ابا عبداللہ
خوب میرے ہوئے مہمان ابا عبداللہ
بالِ زینبؑ کے پریشان ابا عبداللہ
مع لشکر مع ناموسِ پیمبر آئے
عین وعدے پہ حضور آئے پہ مر کر آئے

اس بند کے گھٹے ہوئے مگر متنوع جذبات کی کون تعریف کر سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر لفظ کی قیمت ایک پارۂ دل سے ادا کی جا رہی ہے اور آخری مصرع تو خونِ تمنا میں ڈوبا ہوا ہے۔ منظر کی دل ربا خستگی اور جراحت ریزی اور بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ عظیم روحوں کی موجودگی میں جذباتِ غم و الم کا اظہار صرف ڈبڈبائی حسرت بھری آنکھوں تھراتے ہوئے ہونٹوں یا نہ دبنے والی اور بند بند ہلا دینے والی سسکیوں کے ذریعہ سے ہو رہا ہے۔

(۵۲)

تم تو جنت کو سدھارے میں بلاؤں کس کو
مر گئے فاقے سے تم کھانا کھلاؤں کس کو
آپ پیاسے موئے شربت میں پلاؤں کس کو
آپ نیزے پہ ہیں مسند پہ بٹھاؤں کس کو
دست و پا جو منے کا طور بھی یہاں نہیں
اے مہمان ترے پاؤں نہیں ہات نہیں

خدا کی پناہ کیسے خونی جذبات کا تلاطم ہے۔

یہ فغاں سنتے ہی کانپا سرِ سلطانِ اُمم
اور شیریں کی طرف نیزۂ پُرخوں بہ اَلم
بیڑیاں تھام کے اُٹھے پئے تعظیمِ حرم

کیا شیریں نے کربلا دیکھی ہے اے پُرغم
راکبِ دوشِ رسول الثقلین آتا ہے
ہاتھ پھیلا، سرِ پُرخونِ حسینؑ آتا ہے

آپ شاید کہیں کہ لفظِ نغاں سے میرے اس دعوے کی تردید ہوتی ہے کہ شیریں نے سر اطہر کو اشاروں میں مخاطب کیا کیونکہ نغاں کے معنی چیخنے چلانے اور فریاد کرنے کے ہیں میں عرض کروں گا کہ بند نمبر ۵۰ میں صاف طور پر لفظ اشارہ درج ہے "اشارہ کیا" کی شرح تمام عبارتِ مابعد ہے جب اشاروں میں اظہارِ مدعا ہو سکتا ہے اور عرض ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اگر اس کی نوعیت فریاد کی ہو تو ایسے اشارہ کو فریاد و نغاں سے کیوں نہ تعبیر کیا جائے دل بھی نغاں کرتا ہے خواہ نغاں الفاظ یا صورت میں منتقل نہ ہو اور سننے والا سُن بھی لیتا ہے۔ یہ درست ہے تو حسینؑ اپنی کنیز کی خاموش نغاں کیوں نہیں سُن سکتا۔

علاوہ بریں آپ ہی کوئی صورت نکالیے کہ اگر پہلا تصفیہ درست ہے یعنی شیریں نے جو کچھ کہا اشاروں میں کہا تو اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ اس دردبھرے مجموعۂ خیالات کو جو اشاروں یا زیرِ لب ادا ہو نغاں نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے اگر اشاروں کی زبان ہو سکتی ہے تو نغاں لے آمدِ صدا بھی ہو سکتی ہے۔ اگر اشاروں کی زبان سمجھی جا سکتی ہے تو ایسی نغاں بھی سُنی جا سکتی ہے (میں نے اعجازِ امامت کو توجیہہ سے عمداً علیحدہ کر دیا)۔

(۵۴)

دونوں ہی پھیلائے ہوئے دستِ تمنا شیریں
آیا نیزے سے تڑپ کر سرِ پاکِ شہِ دیں
بیٹھی آغوش میں سر لے کے وہ بالائے زمیں
لے کے عارض کی بلائیں کہا سمجھی میں حزیں
میرے گھر میں جو قدم رنجہ نہ سرور نے کیا
گود میں آ کے سرافراز مجھے سر نے کیا

مطلع احباب سے خوش ہے دلِ محزون اپنا

وہ نغاں یا بین جس میں صورت و الفاظ کو دخل ہے اب آئی ہے کیونکہ منظر و ماحول سب بدل گیا اور اب مرکزِ خیال و نظر یہ سرِ پُرنور اور صرف یہ سرِ پُرنور ہے۔

(۵۵)

پھر کیے بین کہ ہے ہے مرے آقا ہے ہے
مر گئے شیرِ خدا احمدؐ و زہراؑ ہے ہے
زیب ایواں رہی نے رونق دنیا ہے ہے
ہائے ویراں ہوئے یثرب و بطحا ہے ہے
آلِ حیدرؑ کے لیے پانی نہیں، تربت نہیں
شہدا کے لیے مرقد نہیں، تابوت نہیں

(۵۶)

گھر میں آئے جو تو منھ سے بھی بولو آقا
پانی لاؤں رخِ پُرنور کو دھلوا لو آقا
شیر زہراؑ کی قسم ہونٹوں کو کھولو آقا
ہم سخن خادمۂ خاص سے ہو لو آقا
ہائے تم ذبح ہوئے خرچ بھی مقتول ہوئی
ہائے آقا نہ ضیافت مری مقبول ہوئی

(۵۷)

معجزے سے ہوا گویا یہ سرِ سبطِ رسولؐ
میں نے اور میرے خدا نے تری دعوت کی قبول
بارک اللہ نبیؐ کہتے ہیں احسنت بتولؑ
اب ضیافت ہے ہماری یہی اے زار و ملول
فاتحہ پیاسوں کا شربت پہ دلانا شیریں
پانی تھوڑا سا سکینہؑ کو پلانا شیریں

(۵۸)

بس دبیرؔ اب نہ بیاں کر تو بیانِ شیریں
زندگی تلخ ہے سُن سُن کے نغانِ شیریں
ہوئی شیریں نے غمِ شاہ میں جانِ شیریں
شکر کر حق نے تجھے بخشی زبانِ شیریں ۵۰

اُن کے مضمون سے لڑتا نہیں مضمون اپنا

قاضی عبدالودود

مرگِ دبیر

"مرگِ دبیر" کے عنوان سے عصرِ اول کے محقق قاضی عبدالودود صاحب کا ایک مفید مضمون معاصر پٹنہ حصہ اول میں برسوں قبل شائع ہوا تھا۔ قاضی صاحب سے سرفراز کے دبیر نمبر کے لیے مضمون کی استدعا کی گئی تھی لیکن موصوف کی علالت کے پیشِ نظر نیا مضمون ممکن نہ تھا۔ اب معاصر پٹنہ کی فائل سے یہ مضمون قارئینِ سرفراز کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ معاصر کی فائل کے لیے میں ذاتی طور پر ڈاکٹر نورالحسن صاحب ہاشمی کا ممنون ہوں۔ موصوف نے سرفراز کے دبیر نمبر کے لئے ایک پیغام بھی ارسال فرمایا ہے جو شایع کیا جا رہا ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب کے مضمون میں حواشی کے تحت معاصر پٹنہ میں بعض اندراجات غالباً سہوِ کتابت کے باعث حذف ہو گئے ہیں۔ میں مجبوراً مضمون کو من و عن نقل کر کے پیش کر رہا ہوں۔ اگرچہ مضمون کے آخر میں بعض حواشی غائب ہیں۔ قاضی عبدالودود صاحب کا یہ مضمون دبیر پر کام کرنے والے محققین و ناقدین کے لیے اپنے دامن میں افادیت کے بہت سے گوشے رکھتا ہے۔

— کاظم علی خاں
ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

۱۰ مارچ ۱۸۷۵ء لغایت ۳۰ جون ۱۸۷۵ء کے اودھ اخبار میں مرزا دبیر کی وفات یا اُن کے اخلاف کے متعلق جو نظم و نثر چھپی تھی، وہ بعض چیزوں کو چھوڑ کر درج ذیل کی جاتی ہے۔

(۱) "جناب مرزا دبیر صاحب کی وفات۔ ہیہات۔ ہیہات ہیہات ہیہات" یا "صد ہزار حیف کہ اقلیمِ سخن لٹ گئی! آفتابِ کمال غروب ہو گیا، مرثیہ گوئی کا خاتمہ بالخیر (کذا) ہوا، یعنی افصح الفصحا ابلغ البلغا سحبانِ زمان طوطیِ ہندوستان، شاعرِ بے نظیر جناب مرزا دبیر نے بقضائے الٰہی امیس ہو کر ستر سال اپنے جسمِ ناتواں کو گھلا دیا اور آخر کار چند روز بے آب و دانہ رہ کر امراض ورم وغیرہ میں اس عندلیبِ معانی نے گلزارِ قدس کا راستہ لیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اس واقعۂ حسرت ناک سے تمام لکھنؤ میں کہرام مچا ہے، ہر ایک مسکین جان پر ایک سخت صدمہ ہے کہ جس کا بیان قلمِ اندوہ رقم سے نہیں ہو سکتا۔ واضح ہو کہ منگل کی اخیر شب کو یعنی ۲۹ محرم کو یہ حادثہ واقع ہوا۔ تمام علما و امرا اور ہزارہا اشخاص لکھنؤ کے اس خبرِ وحشت اثر کو سن کر جوق جوق جنابِ مغفور کے مکان پر چلے آتے ہیں، روتے ہیں، پیٹتے ہیں، چلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت کرے۔

کا بھی وقت دینا رقم ہوگی۔ ایسے شہنشاہِ سخنوری کے اٹھ جانے کو (کذا) بھی اس وقت تاب تحریر اور طاقت تقریر نہیں ہے۔ ہائے ہائے کیا شخص مرگیا:

سالہ مختصر سوانح عمری حضرت دبیر مغفور: ....

میرزا سلامت علی ..... دبیر فنِ مرثیہ گوئی میں .... لاجواب تھے، تمام ہندوستان میں آفتاب تھے۔ سوا اس کے عابد شب زندہ دار تھے اور صائم روزگار۔ پندرہ سولہ برس کا سن تھا کہ شوق انواع سلام اور مرثیہ گوئی کا ہوا اور اصلاح .... میاں دلگیر شاعر بےنظیر سے لی، بعد ازاں مرثیہ گوئی وغیرہ میں نام عالی پیدا کیا۔ میاں دلگیر صاحب ایسا شاگرد پاکر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ سوا اُن کے اور کسی کو زل لگا کرنہ بتاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ایسا نام پیدا کیا کہ سرکاروں میں پہنچے۔ نواب اصغر علی خاں جنت آشیاں ... والد ... نواب ممتاز الدولہ بہادر کے ملازم ہوئے - - - - - . . . . اور یہی وجہ اور قدامت ہے کہ نواب ممتاز الدولہ بہادر آج تک مانتے اور اپنا ملازم قدیم جانتے تھے، بلکہ ... تعظیم فرماتے تھے اور اپنے برابر بٹھاتے تھے اور بھی سرکاروں میں اُن کی عظمت و رفعت ہونے لگی، اور بہار احباب و آرام اور کمبود باشان شکوہ (کذا) ان کو .... بہ دل و جان مانتے تھے۔ بادشاہان ... اودھ نے ان کی نہایت قدر دانی کی نصیر الدین حیدر .. سے تا .. واجد علی شاہ ... سب نے مہربانی کی، چنانچہ ۱۲۹۱ھ میں مرزا صاحب کلکتہ تشریف لے گئے، واجد علی شاہ کی خدمت میں عرضی داشت بھیجی اور یہ شعر بادشاہ نے دست خط فرمایا:

"گر بسر و چشم من بیائی بر قلب نہم کہ کیمیائی"

جب مرزا صاحب پہنچے جس مکان میں تھے اُس کے دوسرے درجے تک ... واجد علی شاہ آئے اور پیشوائی کرکے لے گئے اور اس قدر تعظیم و تکریم فرمائی کہ جیسے کوئی برابر والے کی عزت و توقیر کرتا ہے، اپنے مرثیہ ... میں شاہ اودھ نے بہت سے بند اُن کی تعریف کے پڑھے، چنانچہ یہ مصرع ارشادات حضرت سے ہے۔

"میں بچپنے سے عاشق نظم دبیر ہوں"

اُس وقت مرزا صاحب نے کھڑے ہو کر یہ مصرع پڑھا:

"تعظیم کلام کو دبیر اُٹھا ہے" شاہ اودھ نے فرمایا کہ آپ بیٹھ جائیں، اور بعد خاطر داری بےشمار ... پانچ سو روپے بطور دعوت عطا فرمائے، درمثل سال گزشتہ امسال بھی عظیم آباد سے مرزا صاحب نے عرضی بھیجی تھی جس پر چھ پانچ سو روپے ... عطا فرمائے۔

بہتر سال کا سن تھا۔ طاقت جواب دے چکی تھی، امسال عظیم آباد میں تشریف لے گئے اور قریب تاریخ شائقین و سامعین بہت جمع تھے، مرثیہ طولانی بہت زور و شور سے پڑھا، اُس وقت سے اختلاج قلب شروع ہوا۔ ریل پر اپنے گھر آئے۔ دس دن تک نہایت علیل رہے۔ ۲۵ر محرم کو رونق افزائے دارالبقا ہوئے۔ گروہ مومنین خواص و عوام جنازے کے ہمراہ تھا، گریہ و بکا سے سب کا حال تباہ تھا۔ نواب ممتاز الدولہ بہادر نے شریک ہو کر عزت افزائی فرمائی ... مرزا اوج نے قریب دس بارہ رباعیوں کے حسب حال اپنے اور وفات پدر بزرگوار پڑھیں۔ کہرام پڑ گیا۔ عجب مضامین عالی تھے۔ گویا مرزا دبیر ... پڑھ رہے تھے، تمام شہر کو اُن کی مرثیہ گوئی میں جو ... شبہ تھا وہ قع اور رفع ہو گیا۔ ہر صغیر و کبیر کی زبان پر ... تھا کہ الولد سر لابیہ ... نواب ممتاز الدولہ بہادر نے مرزا ... اوج کو گلے لگایا، اور کل طلب فرمایا ہے، یقین صادق ہے کہ خلعت عطا فرمائیں گے مرزا دبیر کچھ فقط لکھنؤ میں نامور نہ تھے، حیدرآباد، عظیم آباد، سندھ بلکہ تمامی ہندوستان میں حتیٰ کہ کربلائے معلی تک بھی مشہور تھے۔ اب یہی دعا ہے کہ خدا مرزا اوج کو سلامت رکھے۔" ... ن ... لکھنؤ میں ایک نامی گرامی شاعر ہند ...

منور علی شہ خنداں تشریف لائے ہوئے ہیں۔ ذوق کے شاگرد رشید اور مستوطن لکھنؤ ہو گئے ہیں، آپ ہی کی وجہ سے ایک صحبت خاص مشاعرے کی جناب منشی مظفر علی خان بہادر* کے صاحبزادوں کے اہتمام سے دربار میں منعقد ہوئی تھی۔ ایک [illegible] آپ کا مطبع اودھ اخبار میں چھپا ہے اور دیوان عن قریب چھپے گا، چونکہ اسی عرصے میں مرزا دبیر نے انتقال فرمایا پس حضرت خنداں نے ایک نہایت عمدہ قطعۂ تاریخ کہہ کر بھجوایا جس کو ہم درج اخبار کرتے ہیں۔ وھو ھذا

تاریخ الم دبیر ۱۲۹۱ھ

دبیر سخنور چو رفت از جہان
سخن شد سیہ پوش ماتم تمام
سراپائے خود را فرا [illegible]
فصاحت بلاغت لطافت کلام

مختصر سوانح عمری مرزا دبیر کی لکھی گئی تھی، اُس میں ایک غلطی ہو گئی کہ بجائے ضمیر کے شاگرد دل گیر** کی لکھا ہے اور کچھ حال اور بھی باقی رہ گیا تھا، وہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کو ایک بڑا توسل سرکار ملکہ زمانیہ اور نواب سلطان عالیہ دختر نواب ملکہ زمانیہ سے بھی تھا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے کا سلوک اُن حضرتوں نے کیا تھا اور آج تک ممتاز الدولہ بہادر سلوک فرماتے ہیں۔ جب مرزا صاحب کے انتقال کا وقت آیا، پانچ بجے صبح کی نماز پڑھی اور حال ابتر ہونے لگا، اُس وقت میاں اوج نے پوچھا کہ مجھ کو کس کے سپرد کیا، فرمایا تمھیں خدا کو سونپا اور انتقال کیا۔ اور بس کہ بروز سوم حال طبیعت داری میاں اوج صاحب کا بہ خوبی۔ دریافت ہو گیا کہ اکثر رباعیات تصنیف فرما کر [illegible] دو رباعیاں بھی درج اخبار کرتے ہیں۔

ناکام کو کامیاب کر دیتا ہے
وہ غیب سے فتح یاب کر دیتا ہے
کافی ہے اُسی کی مہربانی اے اوج
جو ذرّے کو آفتاب کر دیتا ہے

کیوں خواب میں زندگی بسر کرتا ہے
کس فکر میں شام کو سحر کرتا ہے
طالع ہوئی صبح بج گیا طبل رحیل
بیدار ہو کارواں سفر کرتا ہے

بے رخصت دوست گر نہ تجھ کو دیکھوں
فردوس میں سربلند تجھ کو دیکھوں
اے دوست یہ آرزو فقط باقی ہے
آنکھیں ہو جائیں بند تجھ کو دیکھوں

رو رو کے بجا ہے دیں اگر دم اپنا
تھا سلخ کو غرّۂ محرم اپنا
ان کا ماتم تو کیا کریں گے اے اوج
ہاں آج سے ہم کریں گے غم اپنا

شادی کو ملال سے بدل کر اُٹھنا
اسپند کی شکل غم سے جل کر اُٹھنا
عبرت کی جگہ ہے رحلت اہل کمال
منصف ہے تو دونوں ہاتھ مل کر اُٹھنا

---

* مرزا آزاد اسیر، اسیر کے بیٹے حکیم اور افضل شاعر تھے۔

** مگر قطعۂ لطافت میں شاگرد دلگیر و ضمیر۔ لطافت کے والد امانت دلگیر کے شاگرد تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دبیر کی شاگردی دلگیر کی کیا حقیقت ہے۔ (قاضی عبدالودود)

شہ رہا
دستاں اپنا جو ہر نہ رہا
روشن ہے کلام کی بقا سے اے اوج
آئینہ رہا مگر سکندر نہ رہا

دل کو دنیا سے ہیں اُٹھانے والے
اس شمع کو مر گئے ہیں بجھانے والے
ہم بھی آتے ہیں رشک مرکب اپنا
اے غمکدۂ جہاں سے جانے والے

ہر نقطہ بشکلِ غم بہ دتا ہے
ہر دائرہ بن کے چشم نم روتا ہے
سطریں کاغذ کی صف پہ ہیں سوگ نشیں
ماتم میں دبیر کے قلم روتا ہے

شب کو صحبت سے بے ملال اُٹھے ہیں
کاندھوں پہ سحر کو خستہ حال اُٹھے ہیں
آتے ہیں کبھی ہیں بزم میں ہو کے بلند
کیا کیا دنیا سے باکمال اُٹھے ہیں

شعلہ سینے سے ہر زماں اُٹھتا ہے
نالۂ خوں بار خوں نشاں اُٹھتا ہے
اے آتشِ غم بس اب کلیجے کو نہ پھونک
مجلس بے چین ہے دھواں اُٹھتا ہے

ایک قطعۂ تاریخ مرزا انیس مرحوم کے ایک عزیز نے نہایت عمدہ تحریر فرمایا ہے جس کی تمام شہر میں تعریف ہے اُس کو ہم آیندہ چھاپیں گے۔

[19] عبدالعلی آسی مدراسی کا قطعہ (آسی نے دبیر کے قطعۂ تاریخ وفات انیس پر جو اعتراضات کیے تھے

اُن کا جواب بھی اس اخبار میں دیا تھا:

اے وائے بے نظیر زمانہ دبیر نیز
ہم از پے انیس شدہ انتقال اند
صد حیف صد دریغ و صد افسوس صد الم
ناخن زنست بر رگ دلہا ملال اند
بے او کمال مرثیہ گوئی بست در زوال
بودند آبروئے نظم و سخن مقال اند
گر پیر چرخ چرخ زند صد ہزار سال
در عالم مثال نیارد مثال اند
متن قضا کشش نبود زیر بار شرح
چوں مہر روشن بعالم کمال اند
چوں از غم شہادت سلطان تشنہ لب دشت
ماہ محرم آمدہ آخر تا ل اند
پرسیدم از دبیر فلک حال رحلتش
پیوستہ آں بہ رحمت حق گفت سال اند

تاریخ وفات از طبع رسا فکر آسمان پیما سید ہدایت اللہ خاں صاحب ... ہدا اللہ منجم یکتا نبیرہ نواب مخبر الدولہ بہادر رشید الممالک سید ماشاء اللہ خاں بہادر اسد جنگ عزیز مرزا صاحب مغفور:

وا دریغا از قضائے آسمان در ہم شکست
رنگ بزم ماتم آل پیمبر بے دبیر
حیف آں شیرازہ بند مجمع احباب رفت
دفتر مجموعۂ ماتم شدا بتر بے دبیر
مرگ خلاق مضامین انتقال شاعریست
جان ہر مضمون نو گردید مضطر بے دبیر
بستہ باب سید نیا نخل منشی تصدر
خاک بر سر کافشاند ہر سخنور بے دبیر
ماہ چوں کا خور شد دل سرد از صبح وصال
آتشے در سینہ دارد مہر انور بے دبیر

چاک جیب صبح شد از پنجۂ خورشید غم
شب سیہ معجز زماتم کرد بر سر بے دبیر
بر فلک کرد بیاں نالاں دمِ مردم بر زمیں
گشت برپا در دو عالم شورِ محشر بے دبیر
صفحۂ چرخ از سوادِ ماتمش از بس سیاہ
نقطۂ غم در نظر آید ہر اختر بے دبیر
بس کہ رسمِ سوگواری عالمی را برگرفت
جامۂ نیلی فلک ہم کرد در بر بے دبیر
صورتِ بسمل تپاں اہلِ عزا در ماتم اند
ہر نفس در سینہا صد ضربِ خنجر بے دبیر
بس کہ در دل شعلۂ داغِ غم از سر کشد
اشک در ہر چشم سوزد مثلِ اخگر بے دبیر
روز روشن تیرہ شد در دیدۂ اہلِ نظر
اے کہ شد مکسوف در سے مہرِ انور بے دبیر
تشنۂ مدحِ شہِ کرب و بلا بد تا وفات
می خورد تنہا علی کے آبِ کوثر بے دبیر
سالِ تاریخش چو جستم از فلک آمد ندا
سدرہ بے روح القدس بیشد و منبر بے دبیر

قطعۂ تاریخ نتیجۂ قلم منشی محمد مرزا جان صاحب ... محمود :-

فلک کے یاد رہیں گے ہمیں یہ جور و ستم
کہ ایک رنج سے ہے رنج دوسرا توام
خوشی کسی کو ہو خاک اس سرائے فانی میں
نہیں ہے دم کا بھروسا یہاں خدا کی قسم
انیس کا مرثی قعدہ ہی سے صدمہ تھا
ہوا اخیر محرم دبیر کا ماتم
جو شاعری میں یہ بے مثل لاجواب تھے وہ
اسی سے ہو نہیں سکتا کسی کا وصف رقم
وہ اپنے رنگ میں یکتا یہ اپنے طرز میں فرد
گھٹا بڑھا نہیں سکتا ہے ذرا بھی قلم
جہان ہو گیا اہلِ کمال سے خالی
کہ لکھنؤ میں ہوئے ہیں یہ حادثے پیہم
جو نصف نصف لکھیں پڑھ کے مصرعِ تاریخ
عیاں ہر ایک کو ہو جائیں دونوں سالِ الم
عدد حساب میں دونوں سنوں کے پورے ہوں
نہ تعمیہ ہے نہ ہے تخرجہ نہ بیش نہ کم
لکھی فلک کی شکایت میں اس طرح تاریخ
غمِ انیس میں ہے ہے دیا دبیر کا غم

یہ غم وہ ہے کہ جس کو غم روتا ہے
مجلس میں امام کا علم روتا ہے
لکھتا ہوں جو سالِ رحلت اُن کا محمود
محفل میں دبیر کو قلم روتا ہے
سنہ ۱۲۹۲ھ

قطعۂ تاریخ وفات. از طبع عالی سید حسن صاحب لطافت خلعت اکبر امانت :-

صائبِ وقت انوری عصر سحبانِ جہاں
دعبلِ دوران حسانِ زماں مرزا دبیر
صاحبِ عز و شرف تاجِ آلِ مصطفےٰ
تھے فرزدق مرتبہ روح القدس کے ہمصفیر
مرد میدانِ سخاوت مرثیہ گوئے حسین
زاہد و عابد محبِ خاص شاہِ قلعہ گیر
سمتِ ملکِ جاوداں اس دارِ فانی سے گئے
داغ بر دل خاک بر سر غم سے ہیں برنا و پیر
روز سہ شنبہ تھا اور سلخ محرم وقتِ صبح
ماتم شہ میں ہوئے یہ ماہِ غم کے ساتھ اخیر
کربلا کا ذکر تھا رونے رلانے سے غرض
خاکِ پاک کا لبد اشکِ عزا سے تھی خمیر

تھا دور میں کب تھا دبیر سا جوش و خروش
تھے عام اس دور میں سب سے بجز غم خلد مد
مجلسیں سنسان ہیں وہاں ہیں ماتم سرا
اٹھ گئے وہ گریہ نہ وہ شہرہ نہ وہ جم غفیر
ہر طرح اللہ نے ان کو کیا تھا اہل دل
تھے بہ رجوع قلب سے شاگرد دبیر و ضمیر
صبح دم جنت میں پہنچی روح مانند نسیم
قصر گلزار جناں میں ہو گئے زیب سریر
واقعہ یہ سن کے فکر سال جب مجھ کو ہوئی
آئی ہاتف کی صدا یہ مادہ ہے بے نظیر
ہاں الم سے سر اٹھا تاریخ لکھ بے تخرجہ
باغ بے بلبل ہے ہندوستان لطافت بے دبیر
۱۲۹۲ھ

قطعہ از منشی سید باقر علی اصغری، حیرت صاحب

دیواں :-

در بزم لب لعل چو بگشود دبیر
جز مدحت شہ زباں نہ فرسود دبیر
حقا خضر سخنوری بود بلا ہر
میدان زبیع مدح پیمود دبیر
روشن کن مجلس عزائے زہرا
در باغ جناں چو رفت زا بود دبیر
ایں مصرع زباں شمع می خواند بہ بزم
مصباح شبستان علیؑ بود دبیر

دیگر تاریخ از طبع رسا مورخ یکتا منشی محمد فدا علی فارغ مرادآبادی

"گئے اس دارالانشا سے دبیر زود رس ہے ہے"
۱۲۹۲ھ

"مرزا دبیر سحر بیاں مر گئے افسوس"
۱۲۸۱ فصلی بنگلہ

انتیسویں کو ماہ محرم کی چرخ نے
کیا لکھنؤ میں فتنۂ ماتم بپا کیا
یعنی کہ نقش ہستی مرزا دبیر کو
حرف غلط کی طرح سے بالکل مٹا دیا
فارغ نے پوچھا دل سے کہ ہے کوئی اس کا مثل
تو اس نے یہ جواب اسے برمحل دیا
حق تو یہ ہے کہ آپ ہی اپنا تھا وہ نظیر
ہاں منہ بھی مدعی کا کسی نے نہیں دیا
لیکن ہمارا قول یہی ہے کہ بالیقین
طے ہو گیا دبیر محقق پہ مرثیہ
۱۲۹۲ھ

منظور ہو تو مصرع تاریخ یوں بھی ہے
طے ہو چکا دبیر محقق پہ مرثیہ
۱۲۹۲ھ

مرزا دبیر مر گئے ہیہات ناگہاں
۱۲۹۲ھ
دبیر کیا گیا مجلس سے مرثیہ ہی گیا
۱۲۸۲ فصلی

مومنو باعث گریہ نہ رہا اب کم کہ
سینہ کوبی کے عوض بس جانکاہی
سال تاریخ سنو فارغ خستہ تن سے
مرثیہ ہی گیا ہم پائے دبیر رازی
۱۲۹۲ھ

"دبیر عطارد منش حیف شد"
۱۲۹۲ھ "خواندہ آسماں زبیر سطر اجل"
۱۲۹۲ھ

جستم بہ فن مرثیہ گوئی نہ یافتم
جز ذات او سہیم و عدیل و دگر نظیر
تاریخ و نام نامی او دبیر گوش کن
افسوس روح زادہ سلامت علی دبیر

شد دبیر پاک ذات از دار الانشائے فنا
سنہ ۱۲۹۲ھ

شد دبیر پاک بیں از دار الانشائے الم
سنہ ۱۲۸۲ فصلی

دبیر فدوی آل عبا سوئے فردوس
گرفتہ نقد رزاں شد رواں پئے پابوس
چو خواہی مادہ سالِ مرگ اے فارغ
بگو دبیر عطارد رقم بمرد افسوس
سنہ ۱۲۹۲ھ

لبِ بکا سے کہیں کس طرح ہ سالِ وفات
دبیر کیا گیا عالم سے مرثیہ ہی گیا
سنہ ۱۲۹۲ھ

چند تاریخی مادے: جب سے دبیرِ مرثیہ گو مر گئے سنہ ۱۲۹۲ھ پورا کیا دبیر نے دادی مرثیہ سنہ ۱۲۹۲ھ جلوۂ مرثیہ تمام ہوا سنہ ۱۲۹۲ھ ذاکر سید زین بودہ دبیر سنہ ۱۲۹۲، روح ملک مرثیہ بودہ دبیر سنہ ۱۲۹۲ھ، انجمن افروز مرثیہ گویاں بودہ سنہ ۱۲۹۲ھ، بودہ ے دل دبیر چرخ دبیر سنہ ۱۲۹۲ھ۔

یکم ۲ تاریخ ۲۳ صفر کو مرزا دبیر کا چہلم ہوا۔ مجلس میں صدہا رئیس اور شاہزادے اور امیر و امراء جمع تھے۔ مرزا اوج نے اوّل رباعیات تو تصنیف پڑھیں، تمام محفل میں وجد کا عالم تھا۔ بعدہٗ قطعۂ تاریخ وفات پڑھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ بعینہٖ مرزا صاحب پڑھ رہے ہیں اس کے بعد حضرت امام زین العابدین کے دربار میں تشریف لے جانے اور حاکم کے انصاف نہ کرنے کا حال پڑھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ بعینہٖ مرزا صاحب پڑھ رہے ہیں۔ اُس وقت گویا قیامت برپا ہو گئی تھی۔ آخر ش مرثیہ نہ پڑھ سکے

خاک بر سر کن صبا در ماتمِ سلطانِ نظم
حیف شد برباد اقلیمِ بلاغت بے دبیر

نیست آں بسم اللہ دیباچۂ معنی دفتر
ہست اکنوں ابتر اجزائے طلاقت بے دبیر
بگر اندر بوستاں بر سرو نخل ماتم است
در چمن نرگس سراپا چشمِ حیرت بے دبیر
غیر مشکل طالبِ دیدار را شام و سحر
اندریں فرقت سرا یک لحظہ راحت بے دبیر
نے دل مہجور را آرام بے وصلِ حبیب
نے مذاقِ زندگانی را حلاوت بے دبیر
منشی چرخ بریں ایں مصرع تاریخ خواند
آسماں بے مہر و بے بیم فصاحت بے دبیر
سنہ ۱۲۹۲ھ

قطعاتِ تاریخ وفات مرزا دبیر ریختۂ قلم افصح الفصحا ابلغ البلغا حضرت مولانا حکیم محمد لطف اللہ صاحب:-

آں میرزا دبیر کہ در نظمِ مرثیہ
یکتائے عصر بود برنگِ دُر صدف
چوں مہر در نشیمنِ خاور گرفت جا
بر شکلِ ماہ یافت بہ بُرجِ جناں شرف
بہر تلاشِ مادۂ تاریخِ مرثیہ دو
فکرم دوید لطف چو ہر سو بہر طرف
شاہِ نجف بگفت بہ طرز نشاں دہی
شد جائے گیر زیر نجف در رنگِ نجف
"۱۲۹۲ھ"

اُن کا ایک فارسی قطعہ مادۂ تاریخ: "زیر نجف در نجف شد جاگیر سنہ ۱۲۹۲ھ"

تاریخ کے کئی قطعے اور کئی مادے تاریخ اس شمارے میں بھی ہیں جن میں سے بعض مادے یہ ہیں:

"منبر ہے بے دبیر کے ماتم کا ڈھیر آہ" سنہ ۱۲۹۲ھ
"مرگِ دبیر سے ہوئی کہنہ قلم یتیم" ۱۲۸۲ فصلی
"باغ میں بو نہیں بستاں میں دبیر آہ" ۱۲۹۲ھ

[illegible] نظم ہے بے ربط اور روشن بیانی ہے دبیر"
۱۲۹۲ھ

اس شمارے میں سید عابد علی عابد (قصبہ بہادر پور متعلقہ بدایوں یو.پی) کا ایک قطعۂ تاریخ اور ایک مادۂ تاریخ اور محمد حسین فائز بناری کا قطعۂ تاریخ بھی ہے

فائز:-

زہد و ورع و اتقا و خلق و فیض و علم و نظم
از غم بے وارثی گشتند مضطر بے دبیر
از فراقش ہست دل صد پارہ ہر تسبیح را
بر زمیں سجادہ افتادہ یکسر بے دبیر
رفت خاقانی زشروان انوری از خاوران
شد بملک شاعری دیوان و دفتر بے دبیر
طوس بے فردوسی و شیراز بے سعدی تباہ
گنجہ ویراں بے نظامی شد ابتر بے دبیر
مصرع تاریخ رحلت فائز محزوں نوشت
اوج گردوں بے عطارد فوق منبر بے دبیر
۱۲۹۲ھ

[۲۴] تاریخ ہفدہم ماہ حال مجلس مولود شریف داروغہ میر واجد علی صاحب[۲۶] کے یہاں ہوئی اول داروغہ صاحب نے مولود شریف از تصنیف کے ۱۲ بند پڑھے مصرعۂ مولود یہ تھا:-

"دنیا میں کس کے نور کا یارب ظہور ہے"

اور بعد اس کے خلف الرشید مرزا دبیر نے کہ ایک مولود بڑی دھوم دھام کا کہا تھا اور جس کا تمام لکھنؤ میں شہرہ تھا، پڑھا، مجلس میں صدہا رئیس اور امیر اور شہزادے جمع تھے۔ بند اول:-

گردش ہے آج ساغر صہبائے نور کی
لہریں چھلک رہی ہیں شراب طہور کی
عنبر فشاں شمیم ہے گیسوئے حور کی
جھونکے نسیم کے ہیں کہ موجیں سرور کی
روشن زمیں ہے نور رسالتمآب سے
ذرے ملا رہے ہیں نظر آفتاب سے

جناب میاں عشق صاحب اور جناب مونس بھی تشریف فرما تھے نہایت تعریف فرماتے اور کل امرا شہزادہ (کذا) اور رئیسوں کی زبان پر کلمۂ تعریف جاری تھا اور اکثر ذی کمال مثل منشی ظہیر الدین[۲۷] کہ فن شاعری میں یکتا ہیں اور خواجہ بادشاہ[۲۸] صاحب پسر خواجہ وزیر و حکیم صاحب وغیرہ صاحبزادگان حضرت اسیر و سید حسن[۲۹] صاحب کے فرزند لطافت و فصاحت کہ یہ سب شاعر بے نظیر ہیں مداح تھے اور فرماتے تھے کہ کیوں نہ ہو کس باپ کا بیٹا ہے۔ عجب طرح کا مولود تھا کہ ایسا مولود نہ ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ صفائی بندش اور مضامین بھی نہایت عمدہ تھے اور ہر شخص کا قول تھا کہ ان کے کلام میں دونوں رنگ ہیں۔ مرزا دبیر اور میر انشاء اللہ خاں[۳۰] کا۔ خدا نظر بد سے بچائے۔"

[۳۱] قطعۂ شیخ فدا حسین فدا خوش نویس مطبع شاگرد پیارے صاحب رشید:

گئے جہاں سے افسوس کیسے حق آگاہ
ہر ایک شخص کا ہے حال جن کے غم میں تباہ
فدا یہ میں نے سنی منشی فلک کی ندا
غم دبیر سے پیدا ہیں اشک کلک سیاہ

حواشی

۲۵ ۱۰ مارچ ۱۸۷۵ء = ۲ صفر ۱۲۹۲ھ روز چہارشنبہ

۲۶ یک شنبہ ۷ مارچ کے اودھ اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاریخ ۲۸ محرم کے مطابق تھی اس لئے مشکل کوئی یہ تھی، انتیس نہیں۔

۲۷ ناصر لکھتا ہے: "امرا میں صاحب اعزاز فریدوں نسب

ممتاز الدولہ مدبر الملک مرزا حسین علی خاں بہادر تہور جنگ تخلص ممتاز خلف الصدق ناصر الدولہ نواب اصغر علی خاں ابن محمد علی شاہ بادشاہ۔ کلام اُن کا بہ تواسطہ سحر بخش کا منظور نظر۔ اگر اصغر علی خاں باپ کی زندگی ہی میں مر گئے ہوتے تو اودھ کے بادشاہ ہوتے اور ان کے بعد ممتاز الدولہ ان کے جانشین۔

۲ہ سوانحات سلاطین اودھ جلد ۱ صفحہ ۲۶۶ میں ہے کہ افتخار الدولہ میر امام عہد غازی الدین حیدر میں دیوان ہوئے تھے۔ یہ مسلمان ہو گئے تھے اور کربلا معلّی میں "بعد مجاورت چند سال" ربیع الاول ۱۲۵۸ھ میں اُن کا انتقال ہوا تھا۔

۳ہ تاج الدین حسین خاں یا سبحان علی خاں سے مراد

۴ہ تذکرہ نوح و دیدہ میں دبیر کا ترجمہ ثابت (غالباً مصنف حیات دبیر) سے لکھوایا گیا ہے۔ اس میں پورا شعر یوں ہے:

"بچپن سے ان کے دام سخن میں اسیر ہوں
میں کمسنی سے عاشق نظم دبیر ہوں"
صفحہ ۱۵۷

۵ہ ولادت ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۲۱۸ھ ختم خانہ

۶ہ و ۷ہ و ۸ہ خندان، حیرت، عابد، ندا کا ترجمہ ان تذکروں میں نہیں جو اس وقت سامنے ہیں۔

۹ہ ملکہ زمانیہ زوجہ نصیر الدین حیدر شاہ اودھ سلطان عالیہ بیگم ان کی بیٹی ممتاز الدولہ کی زوجہ۔

۱۰ہ قتیل صریحاً غلط، دبیر چاہیے۔

۱۱ہ یہ صاحب دیوان انشا، انشا خاں کے پوتے اور مسیح اللہ خاں انشا کے سوتیلے بھائی کے پوتے تھے۔ دبیر کے سسرالی رشتہ دار ممکن ہے، خود ان سے بھی قرابت ہو۔

۱۲ہ مخبر الدولہ ہی سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بعض نے مخبر الدولہ سے لکھا ہے، سید الممالک کی کوئی سند نہیں ملی۔ اسد جنگ کلیات انشا کے ایک نسخہ میں ہے۔

۱۳ہ مجھے یاد نہیں کہ یہ قطعہ دیوان بہار میں ہے یا نہیں۔

۱۵ہ مرزا جان محمود شاگرد صبا سخن شعرا صفحہ ۴۲۱
محمود کے نکالے ہوئے مادے ختم فاتحہ میں بھی ہیں۔

۱۷ہ میں نے یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ مادوں سے سنین مطلوبہ نکلتے ہیں یا نہیں۔

۱۹ہ فارغ کے لیے آثار الشعراء دیکھیے۔

۲۰ہ فسوس اور افسوس ایک ہی ہیں۔

۲۱ہ "سپے" یعنی "سپہ"۔

۲۲ہ دواں؟

۲۳ہ لطف اللہ ایک مشہور عالم تھے، غالباً یہی۔

۲۴ہ عرش کی حیات تسلیم میں محمد حسن صفحہ

۲۷ہ اودھ اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ تسخیر تخلص تھا۔ غزل میں اسیر اور مرثیے میں دبیر و مشیر کے شاگرد تھے۔ بشیر کی ایک مثنوی میں اُن کا ذکر ہے، اور کلام اودھ اخبار ۱۸۷۵ء میں موجود۔ ان کا شمار علمائے لکھنؤ میں تھا۔

۲۸ہ ظہیر بلگرامی۔

۲۹ہ سفیر تخلص

۳۰ہ سید آغا حسن صحیح نام امانت تخلص

۳۱ہ دبیر کی شادی انشا کی نواسی سے ہوئی تھی۔

کچھ کام کی یہ آہ نہیں واہ نہیں
ارشاد خدا سے کوئی آگاہ نہیں
کثرت ہو کہ قلت ہو مجالس میں دبیر
ناحق ہے جو قربتہً الی اللہ نہیں

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی ایم۔اے
پی ایچ۔ڈی

(نگارزان حیات "شہید اعظم نمبر" ۱۳۹۱ھ سے
نقل کیا گیا)

اَبوابُ المصائب

شمالی ہندوستان میں اُردو نثر کا آغاز فضلی کی دہ مجلس یا کربل کتھا سے ہوتا ہے لیکن فضلی کی زبان کو ہم محض تبرکاً ہی اُردو کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فضلی کی اُردو درااصل وہ فارسی ہے جس میں کہیں کہیں ہندی کا پیوند لگا کر اُردو کا لقب عطا کر دیا گیا ہے۔ زبان کی رنگینی اور بیان کا اغلاق قدم قدم پر یہ اشارہ کرتا ہے کہ دہ مجلس کی زبان دراصل فارسی ہے جسے زبردستی اُردو کا قالب دے دیا گیا ہے۔ ایسی حالت میں چاہیئے نثر اُردو کی تاریخ میں دہ مجلس کو کتنی ہی اہمیت کیوں نہ حاصل ہو لیکن موجودہ حالت اور کیفیت کو پیش نظر رکھنے کے بعد دہ مجلس کا اُردو سے رشتہ قائم کرنا فدا دشوار معلوم ہوتا ہے۔

دہ مجلس کے بعد جو دوسری تصنیف ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ میر محمد حسین تحسین کی نوطرز مرصع ہے۔ لیکن اس زبان کی رنگینی کے ساتھ ہی فارسی اسلوب نگارش کی اس حد تک پابندی کی گئی ہے کہ اُسے بھی اُردو اور فارسی کی درمیانی کڑی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ نوطرز مرصع کی زبان ایسی ہے کہ میر امن کو اسے باغ و بہار کی شکل میں اُردو کا قالب دینا پڑا۔

مذکورہ بالا دونوں کتابوں کو محض اردو نثر کی تاریخ تکمیل کے لئے یا یہ ثابت کرنے کے لئے کہ دور محمد شاہی میں اردو نثر وجود میں آچکی تھی، یاد کیا جاتا ہے ورنہ نہ تو اُن کی زبان یا انداز بیان وہ ہے جسے موجودہ اردو سے کوئی مطابقت ہو اور نہ اُن کے نتیجہ میں مستقبل کے لکھنے والوں کو کوئی ایسی رہنمائی نصیب ہوئی جس کے نتیجے میں اُردو میں نثری تصانیف وجود میں آسکیں۔ اردو میں نثر نگاری کا حقیقی آغاز انیسویں صدی کے آغاز سے کلکتے میں ہوا۔ ۱۸۰۱ء میں میر امن نے باغ و بہار لکھی۔ ۱۸۰۲ء میں حیدری نے آرائش محفل لکھی اور فورٹ ولیم کالج میں دس بارہ سال میں کئی کتابیں لکھی گئیں۔ شمالی ہند میں اب بھی فارسی کا اثر تھا کہ ادبی حلقوں نے فورٹ ولیم کالج میں لکھی جانے والی کتابوں کو کوئی اہمیت نہیں دی اور ان کتابوں کے اسلوب نگارش کو اُردو کا ادبی اسلوب تسلیم نہیں کیا گیا۔ شمالی ہند میں اُردو نظم ضرور ترقی کرتی رہی لیکن نثر کو در خور اعتنا نہیں تصور کیا گیا۔ نثر میں کتاب لکھنا در کنار خط لکھنا بھی خلاف شان سمجھا جاتا تھا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب لکھ کے فارسی کا طلسم توڑا اور یہ ثابت کیا کہ اُردو نثر بھی اُن تمام مرصع کاریوں کی متحمل ہو سکتی ہے جن پر ایرانی نثر نگاروں کو ناز تھا۔ سرور کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے دلوں پر چڑھے ہوئے قفل کھولے، اُردو نثر کی جانب سے جو تعصب

داغوں میں مرچہ نہ لبستہ ہوئے تھے انھیں دور کیا اور اپنے انداز نگارش، حسن بیان اور دلکشی اور تاثیر کے سہارے یہ منوا لیا کہ اردو نثر بھی فارسی نثر کی ہم پلہ بننے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔

سرور کے اس اجتہاد فکر کی ضرور داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے جس وقت شمالی ہند میں اردو نثر نگاری کی بنیاد ڈالی اس وقت ان کے سامنے کوئی ایسی کتاب نہیں تھی۔ جو اُن کے لئے نمونہ کا کام دے سکتی۔ فورٹ ولیم کالج میں لکھی جانے والی کتابیں ضرور ان کے سامنے تھیں لیکن ان میں باغ و بہار کو چھوڑ کے باقی محض ادنیٰ درجہ کی ایسی درسی کتابوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ جو غیر ملکیوں کو عام فہم اور سہل ہندوستانی سکھانے کے لئے لکھی گئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ سرور کے لئے اُن سے متاثر ہونے کا کوئی سوال ہی نہ تھا چنانچہ انھوں نے اپنے لئے ایک ایسی طرز اختیار کی جس کے وہ خود ہی موجد تھے اور خود ہی خاتم بھی۔ یہ صحیح ہے کہ بعض حضرات نے اسی انداز نگارش کی نقل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن کوئی اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ یہ طرز دراصل سرور سے شروع ہو کر انھی پر ختم ہو گئی۔

سرور کی فسانۂ عجائب شمالی ہند میں اردو کی پہلی تصنیف ہے۔ یہ کتاب سنہ ۱۲۴۲ھ میں نصیر الدین حیدر فرماں روائے اودھ کے دورِ حکومت میں لکھی گئی۔ چنانچہ مقدمہ میں شاہ اودھ کی شان میں ایک نظم ہے جس کا مطلع ہے

تا ابد قائم رہے فرماں روائے لکھنؤ
یہ نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ

سرور کی فسانۂ عجائب کے بعد فقیر محمد خاں گویا کی بستانِ حکمت کو اردو کی دوسری نثری تصنیف قرار دیا جاتا ہے چنانچہ رام بابو سکسینہ اور دوسرے تمام تاریخ نگاروں کی بھی یہی رائے ہے کہ فسانۂ عجائب کے بعد بستانِ حکمت دوسری تصنیف ہے جو سنہ ۱۲۵۱ھ میں تیار ہوئی۔

یہاں ہم ایسی اردو تصنیف کا تعارف کرانا چاہتے ہیں جو بستانِ حکمت سے چھ سال پہلے سنہ ۱۲۴۵ھ میں تیار ہوئی لیکن چھپ جانے کے باوجود ابھی تک ادبی دنیا اس سے ناواقف ہے، اس کتاب کا نام "ابواب المصائب" ہے۔

ابواب المصائب مشہور عالم مرثیہ گو مرزا سلامت علی دبیر کی نثری تصنیف ہے جو ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے کتاب کے خاتمے پر خود مرزا صاحب کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ موجود ہے جس کے آخری تین شعر ملاحظہ ہوں۔

غور کردم بسال تالیفش
کہ از آئین فرقہ شعر است
ناگہاں خرج خرج آمدہ عقل
از چپ و راست زادہ مژدہ رساست
گفت با من کہ سال تاریخش
مصحف طاق چشم اہل فراست
۱۲۴۵ھ

ابواب المصائب بھی نصیر الدین حیدر کے دورِ حکومت میں لکھی گئی ہے چنانچہ دیباچہ میں یہ عبارت موجود ہے:

"ارباب عقل کو معلوم ہو کہ طریقہ ارباب تصنیف اور اصحاب تالیف کا یہ ہے کہ جب کوئی کتاب تازہ تصنیف کرتے ہیں تو تعریف بادشاہ عصر کی منجملہ واجبات جانتے ہیں علی الخصوص بادشاہ اُس عصر کا کہ جمیع خوبیوں سے آراستہ اور نیکیوں سے پیراستہ ہے ؎

وہ کون شاہ خلائق پناہ ظل اللہ
بنام نائب مہدی دیں سلیمان جاہ
سخی و عادل و فیاض و مالک اقلیم
کریم ابن کریم و رحیم ابن رحیم

ہے سونے کھاتا ہے یوں سوالِ فقیر
کہ بعینہ ختم تھی یوسف پہ خواب کی تعبیر
حق گر آبا و اجداد اس بادشاہ سلیمان جاہ
و دارا دربان سکندر دربان یوسف عہد
نوشیروان عصر ابوالنصر قطب الدین بادشاہ
غازی نصیر الدین حیدر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ
کے بانی خیر و حسنات تھے چنانچہ نہر آصفی بنائی
ہوئی جناب نواب آصف الدولہ مرحوم
قریب نجف اشرف کے مثل چشمۂ کوثر جاری
ہے از ایں قبیل ہر ایک کی ذات بابرکات
سے بنیاد فیض یادگار آفاق ہے۔ الحمد للہ
کہ ہمارے بادشاہ عصر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ
کو جناب احدیت نے فخر سلاطین سلف اور
رشک بادشاہان عصر پیدا کیا ہے کہ ازل
سے آج تک کسی نے بنائے تعزیہ داری
تا اربعین نہ کی تھی الا اس بادشاہ خلائق پناہ
نے یہ رسم حسنات مقرر فرمائی اور اس طرح
سے ہزارہا امور حسنات اور آثار برکات ذات
مجمع حسنات سے بنیاد پذیر ہوئے اور ہوتے
ہیں ؎

حق تعالیٰ اسے رکھے آباد
بہ محمدؐ و آلہ الامجاد
عہد کا نہیں ہمیشہ یاد رہیں
حکم میں اس کے ہفت کشور ہو"

معتمد کی مذکورہ بالا عبارت اس کا ثبوت ہے کہ الباب المصائب اسی دور میں لکھی گئی تھی جس دور میں فسانۂ عجائب تصنیف کی گئی تھی۔ دونوں کتابیں نصیر الدین حیدر کے عہد میں لکھی گئی ہیں۔ البتہ فسانۂ عجائب کو تقدم حاصل ہے۔

مرزا دبیر صاحب نے یہ کتاب اس وقت لکھی تھی جب شاعر کی حیثیت سے وہ بالکل نومشق تھے اور محض شاگردِ ضمیر کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ وہ محض چھوٹے چھوٹے مرثیے کہتے تھے اور میر ضمیر کی پیش خوانی کیا کرتے تھے۔ تعجب ہے کہ اس زمانہ میں انھیں نثر میں کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ اسے محض ان کے اجتہادِ فکر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں مزید قابل ذکر بات یہ ہے کہ الباب المصائب اس وقت لکھی گئی جب خود میر ضمیر بھی اتنے بڑے شاعر نہیں مانے جاتے تھے جتنے بڑے بعد میں ثابت ہوئے۔ میر ضمیر کو بالاتفاق جدید مرثیے کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ مرثیہ میں تمہید، رخصت، آمد، سراپا، رجز، رزم، تلوار اور گھوڑے کی تعریف، شہادت اور بین کی ترتیب میر ضمیر نے قائم کی اور اس طرح وہ مرثیہ وجود میں لائے جس پر انیس اور دبیر کی شہرت کا محل کھڑا ہوا اور خود میر ضمیر ایک بلند پایہ شاعر اور مجدد فن تسلیم کئے گئے۔ یہ نیا مرثیہ الباب المصائب کی تصنیف کے بعد ــــ ۴ سال بعد وجود میں آیا چنانچہ میر ضمیر خود فرماتے ہیں ؎

جس سال کہی رخصت ہم شکل نبیؐ کے
سن بارہ سو انچاس تھے ہجری نبوی کے
آگے تو یہ انداز سخن تھے نہ کسی کے
اب سب یہ مقلد ہوئے اس طرز نئی کے
دن میں کہوں، شب میں کہوں یہ ورد ہے میرا
اس طرز میں جو جو کہے شاگرد ہے میرا

گویا وہ مرثیہ جو ضمیر اور انیس اور دبیر کی شہرت کا سبب بنا ۱۲۴۹ھ میں وجود میں آیا اور الباب المصائب اس سے چار سال قبل ۱۲۴۵ھ میں لکھی جا چکی تھی۔ جب ان کا ایک بلند پایہ مرثیہ گو تسلیم کیا جانا تو دور کنار، خود مرثیہ گوئی کی وہ طرز بھی وجود میں نہ آئی تھی جو آگے چل کر ان کی شہرت کی اساس بنی۔

خالص ادبی نقطۂ نظر سے الواب المصائب کی بڑی اہمیت ہے یہ کتاب اُس وقت لکھی گئی جب شمالی ہند کے مصنّفین کے سامنے اُردو نثر کا ایک ہی نمونہ تھا اور وہ تھا فسانۂ عجائب کا اندازِ نگارش' ویسے بھی عربی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم کے نتیجے میں مقفیٰ و مسجع عبارتوں کا چلن عام تھا اس لئے مرزا دبیر بھی اگر مقفیٰ و مسجع عبارتیں لکھتے تو لکھ سکتے تھے۔ بلاشبہ وہ اُن پر عبور رکھتے تھے لیکن اُنھوں نے سہل اور سادہ زبان میں اپنی تصنیف مکمل کرکے ایک بڑی جدت' تنوع اور اجتہادِ فکر کا مظاہرہ کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ وہ دوسروں کی تقلید کے بجائے اپنی راہ خود متعین کرنا جانتے ہیں۔

الواب المصائب کی زبان نہایت سہل' سادہ اور پُرتاثیر ہے اور خاص طور پر جہاں جہاں مصائب جنابِ سید الشہداء بیان کئے گئے ہیں زبان اُس میں اتنی مرثیت پیدا کردی گئی ہے کہ پڑھتے پڑھتے آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

ادب کی دنیا میں سہل نگاری اور سادہ نگاری کی ایجاد کا شرف مرزا غالب کو عطا کیا جاتا ہے لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ مرزا غالب نے اُردو نثر میں کوئی کتاب نہیں لکھی ہے۔ اُنھوں نے دوستوں کو خط لکھے تھے اس لئے نہیں لکھے تھے کہ اُنھیں کتابی شکل میں چھپوا کر اُردو نثر نگاری کی ایک راہ معین کرنی مقصود تھی۔ یہ تو محض ایک اتفاق کی بات ہے کہ اُن کے خطوط جمع کرکے کتابی شکل میں چھاپ دیئے گئے اور دنیا اُن کے حُسنِ نگارش' طرزِ ادا اور لطفِ بیان سے اتنی متاثر بلکہ مسحور ہوگئی کہ غالب کو ایک شاعر کے ساتھ ہی ایک صاحبِ طرز نثر نگار بھی تسلیم کرلیا گیا اور لوگ یہ کہنے لگے کہ اُردو میں سلیس' شستہ' رواں اور سہل نثر کے آغاز کا سہرا غالب کے سر ہے۔ الواب المصائب کو سامنے رکھنے کے بعد میرے لئے اس دعویٰ کو تسلیم کرنا بہت مشکل ہے۔ بلاشبہ غالب کے خطوط سہل نگاری و سادہ نگاری کا ایک نادر نمونہ ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غالب نے ۱۸۵۰ء سے اُردو میں مراسلت شروع کی اور الواب المصائب اس سے ۲۵ سال پہلے منصۂ شہود پر آچکی تھی اور اس میں مرزا دبیر نے وہی سہل اور شگفتہ زبان استعمال کی ہے جسے آج قبولِ عام کی سند حاصل ہے۔

بلا خوفِ تردید یہ کہا جاسکتا ہے . . . . . کہ اگر فسانۂ عجائب رنگین اسلوبِ نگارش اور مقفیٰ و مسجع عبارت کا اوّلین نمونہ ہے تو مرزا دبیر کی الواب المصائب شمالی ہندوستان کی نثری تصانیف میں سہل اور سادہ طرزِ نگارش کا نقشِ اوّلیں ہے۔

الواب المصائب کو دلچسپ اور پُرتاثیر بنانے کے لئے جگہ جگہ اشعار کا سہارا لیا گیا ہے اور اشعار ایسے موزوں ہیں کہ اصل عبارت کا جزو معلوم ہوتے ہیں۔ اشعار زیادہ تر مثنوی کے طرز میں ہیں لیکن کہیں کہیں قطعات و رباعیات سے کام لیا گیا ہے۔ ہر چند اشعار میں زورِ بیان کی خاص طور پر نمود ہے بقیہ اشعار عام طور پر سادے اور بیانیہ ہیں۔

الواب المصائب کئی حیثیتوں سے ایک اہم تصنیف ہے جس وقت الواب المصائب لکھی گئی اُس وقت تک کوئی شیعہ عالم اُردو میں کتاب نہیں لکھتا تھا۔ جنابِ غفراں مآب مولانا دلدار علی صاحب نے "عماد الاسلام" اور "شہابِ ثاقب" ضرور لکھی تھی جو مذہبِ شیعہ کی اہم تصانیف شمار کی جاتی ہیں لیکن یہ کتابیں اُردو میں نہیں تھیں جس وقت الواب المصائب لکھی گئی اُس وقت سلطان العلماء اور اُن کے برادرانِ محترم شیعوں کی مذہبی قیادت کررہے تھے۔ ان حضرات کی بھی ساری تصانیف عربی و فارسی میں ہیں۔ دراصل شیعہ اربابِ علم اُردو میں کتاب لکھنا کسرِ شان تصور کرتے تھے۔ ایسی حالت میں مرزا دبیر صاحب نے اُردو میں ایک مذہبی تصنیف پیش کرکے واقعی بڑی علمی جرأت کا مظاہرہ کیا ہے اور ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ شمالی ہند میں الواب المصائب

[illegible] کتاب ہے جو اُردو میں لکھی گئی۔

ابواب المصائب ایک طرح سے ذاکری کی کتاب ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات بیان کئے گئے ہیں اور ان میں جگہ جگہ ربط دے کر حضرت سیدالشہداء کے مصائب درج کئے گئے ہیں۔ اس طرح سے اسے مجالس میں خواندگی کے قابل بنا دیا گیا ہے۔ آج ذاکری کی کتابیں عام طور پر ملتی ہیں اور مختلف ذاکرین کے مسودے چھپتے رہتے ہیں۔ ابواب المصائب کو ان سب کتابوں کا پیشرو کہا جا سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ فضلی کی دہ مجلس بھی ذاکری یا روضہ خوانی کی کتاب ہے لیکن وہ دراصل روضۃ الشہدا کا ترجمہ ہے۔ ابواب المصائب اس کے برعکس ایک باقاعدہ تصنیف ہے جو ذاکری کے قواعد پر مرتب کی گئی ہے اور اس اعتبار سے اُردو میں فنِ ذاکری کی پہلی کتاب کہی جا سکتی ہے۔

ابواب المصائب کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عہدِ نصیرالدین حیدر میں ذاکری کی طرز کیا تھی؟ نواب آصف الدولہ کے عہد سے جناب غفران مآب کی مساعی کے نتیجے میں لکھنؤ عزاداری کا مرکز بن چکا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس زمانے میں مجالس میں عام طور پر مرثیہ خوانی ہوتی تھی اور نثر میں خواندگی کا رواج بہت کم تھا جناب غفران مآب نے اپنے امام باڑے میں ذاکری کا سلسلہ شروع کیا تھا اور خود عاشورے کے روز اپنے امام باڑے میں سہ پہر کو مجلس پڑھا کرتے تھے۔ اس رسم کو اُن کے صاحبزادگان نے بھی جاری رکھا تھا۔ مرزا دبیر صاحب غفران مآب کے جانشین جناب سلطان العلماء کے معاصر تھے اس لئے وہ ضرور جناب سلطان العلماء کی تقریریں سنتے ہوں گے اور اُن سے متاثر بھی ہوئے ہوں گے۔ اس لئے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ابواب المصائب میں ذاکری کی جو طرز ملتی ہے وہ وہی ہوگی جو اس دور میں رائج ہوگی۔ اگر یہ قیاس درست

ہے تو ابواب المصائب کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے کہ ہمیں اس کتاب کی مدد سے فنِ ذاکری کے ابتدائی دور کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

ابواب المصائب میں جو اندازِ ذاکری ہمارے سامنے آتا ہے وہ "حدیث خوانی" اور "نثر خوانی" کا مرکب کہا جا سکتا ہے۔ ذاکری کے یہ دونوں فن اب ختم ہو چکے ہیں۔ ابواب المصائب اس حد تک "حدیث خوانی" کی کتاب کہی جا سکتی ہے کہ اس میں حضرت یوسف کا قصہ چلتا رہتا ہے اور جگہ جگہ ربط دے کر مصائب سیدالشہداء بیان ہوتے جاتے ہیں۔ یہ بالکل "حدیث خوانی" والی تدریجی ذاکری ہے۔ لیکن اُسے اس اعتبار سے مکمل حدیث خوانی بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں جگہ جگہ اشعار چسپاں ہیں۔ اور نثر کا مکملہ نظم سے کیا جاتا ہے جو "نثر خوانی" کا دستور ہے۔ "نثر خوانی" اس طرزِ ذاکری کو کہتے ہیں جس میں نثری تقریر میں جا بجا نظم کا پیوند لگا ہوتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کے زمانے میں "حدیث خوانی" اور "نثر خوانی" کی جداگانہ اصناف ایجاد نہیں ہوئی تھیں ورنہ ابواب المصائب میں یہ دونوں طرز یکجا جمع نہ ہوتے بعد میں یہ دونوں الگ الگ اصناف اُبھرے چنانچہ مرزا صاحب نے شاگرد اور اپنے دور کے ہندوستان کے سب سے بڑے ذاکر مولوی میر سید علی صاحب مرحوم کی مجالس علویہ میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خالص حدیث خوانی ہے۔ نثر خوانی مطلق نہیں ہے۔ لکھنؤ میں حدیث خوانی اور نثر خوانی کے فنون نے جو ترقی کی ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ لیکن جس وقت ابواب المصائب لکھی گئی ہے اُس وقت یہ دونوں فن ایک دوسرے سے ملے ہوتے تھے اور ہونا بھی چاہیے تھا۔ اس لئے کہ یہ عزاداری اور ذاکری کا بالکل ابتدائی دور تھا۔ بعد میں عزاداری میں ترقی ہوئی تو ذاکری کی بھی نئی نئی طرزیں ایجاد ہوئیں اور انھیں میں

حدیث خوانی اور نثر خوانی بھی شامل ہیں۔

ابواب المصائب اس اعتبار سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ یہ اردو کے تفسیری ادب کے سلسلے میں شیعوں کی پہلی کاوش ہے۔ اس وقت تک کسی شیعہ عالم نے اردو میں نہ قرآن پاک کا ترجمہ کیا تھا اور نہ تفسیر لکھی تھی۔ مرزا صاحب نے ابواب المصائب میں سورۂ یوسف کی تفسیر لکھی ہے اور اس اعتبار سے ابواب المصائب جہاں ذاکری کی کتاب ہے، وہیں تفسیر کی کتاب بھی کہی جا سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسے مکمل تفسیر تو نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن بہر حال تفسیر و ترجمۂ کلام پاک کے سلسلے میں اسے شیعوں کی پہلی کاوش ضرور کہا جا سکتا ہے۔ ابواب المصائب کی اشاعت کے بعد ہی شیعہ علماء اس جانب متوجہ ہوئے۔ چنانچہ پہلے تو امجد علی شاہ کے عہد حکومت میں مولانا سید علی صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ نے ۱۲۶۳ھ میں قرآن پاک کا وہ نادر ترجمہ کیا جو اپنی مثال آپ کہا جا سکتا ہے۔ یہ ترجمہ ۲۰×۲۶ سائز کے ۷۹۶ صفحات پر شایع ہو چکا ہے اور اتنی سہل اردو میں ہے جسے 'ہندوستانی' کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ تاج العلماء نے اپنے استاد مرزا دبیر کے تتبع میں سورۂ یوسف کی تفسیر بھی لکھی ہے جس میں توریت کی اصلی عبرانی عبارتوں سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ غرض ابواب المصائب کئی حیثیتوں سے ایک تاریخی تصنیف ہے۔

احسان ناشناسی ہوگی اگر اس موقع پر یہ نہ عرض کروں کہ مجھے ابواب المصائب کا یہ نسخہ سالک مسلک اوج و دبیر حضرت استاذی سید سرفراز حسین خبیر اعلی اللہ مقامہ نے عطا فرمایا تھا۔ نسخہ مطبوعہ ہے اور اسے میں نے مہاراشٹر کالج بمبئی کی لائبریری میں محفوظ کرا دیا ہے جہاں ذوق تحقیق رکھنے والے حضرات اس کا مطالعہ فرما سکتے ہیں۔



سلام

(جناب مرزا گوہر آغا گوہر لکھنوی نبیرۂ مرزا دبیر)

نذرِ علیؑ نہ مرحب و عنتر سے پوچھئے
گر پوچھنا ہے یہ درِ خیبر سے پوچھئے

کس طرح سوئے چین سے حیدر سے پوچھئے
یہ شامِ ہجر فرشِ پیمبر سے پوچھئے

یہ عمر کیا بتائے گا خندق کی جنگ میں
ضربت ابنِ ود کے ہاں پر سے پوچھئے

عرشِ علا پہ بھائی کو دیکھا کہاں کہاں
معراج میں نگاہِ پیمبر سے پوچھئے

قوت کو حرملہ کی بتائے گی خود کماں
ناوک کا توڑ گردنِ اصغر سے پوچھئے

دی اپنی جان کس طرح عین شباب میں
نیزے کا گھاؤ سینۂ اکبر سے پوچھئے

کیونکر کوئی بتائے بہتر کی جنگ کو
یہ معرکہ یزید کے لشکر سے پوچھئے

پائی رہائی نار سے الفت میں شاہ کی
کس طرح چمکا حُر کے مقدر سے پوچھئے

جو گر گیا تھا ماتمِ سرور میں آنکھ سے
قیمت کو اس کی حشر میں گوہر سے پوچھئے

سبطِ محمد نقوی

خاندانی شاعری اور دبیر و انیس

لاریب کہ مرزا دبیر مرحوم ایک خانوادۂ شاعری کے مورث بھی ہوئے اور ایک دبستانِ شاعری کے بانی بھی۔ خود اُن کی چوتھی پشت میں آج تک شاعری اور مدح گستری کا سلسلہ باقی ہے اور اُن کا دبستان آج مدحِ اہلبیتؑ میں جو خدمات انجام دے رہا ہے وہ کسی دوسرے دبستان سے کم نہیں اس لئے اگر 'خاندانی شاعر' کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کے اخلاف میں بالفصل یا بلافصل کئی پشتوں تک شعر گوئی کا سلسلہ رہے تو بلا شک مرزا سلامت علی دبیر مرحوم کو خاندانی شاعر تسلیم کیا جانا چاہیئے۔

لیکن اگر 'خاندانی شاعر' سے مراد یہ ہوتی ہو کہ اسے اپنے اسلاف کی چند پیڑھیوں سے شعر گوئی کی روایت ملے یعنی "خاندانی شاعر" کا مطلب "پشتینی شاعر" سے ہو تو مرزا صاحب مرحوم کے لئے یہ وصف ثابت کرنے میں اُن حضرات کو تحقیقی جد و جہد کرنی چاہیئے جو اُن کے خاندانی شاعر ہونے کے مدعی ہیں۔ کیونکہ اسلافِ دبیر کی نسبت یہ حضرات ابھی تک کوئی ایسا انکشاف نہیں کر سکے ہیں جو چھوٹی بڑی کڑیوں کو جوڑتا ہوا اور اس دائرہ میں اُن بزرگوں کو شامل کرتا ہو جنھیں "حیاتِ دبیر" کے عقیدت مند مصنف میر افضل حسین ثابت لکھنوی مرحوم نے شامل نہیں سمجھا۔ خلاصۂ گزارش یہ ہے کہ مدعی اپنے اسلاف کے کارناموں کی مسلسل روایت کی بنا پر صفت کا حامل ہو جسے یہ کہہ سکے "سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری" یا "بندہ موروثی مولا ہوں میں" یعنی "زور" میں یہ ہو۔ بیٹوں پوتوں پر نہیں۔

دوسری بات یہ کہ جو شخص 'نیا نظریہ' پیش کرے اُس نظریے کے مستند کو ظاہر کرے کیونکہ 'دعوائے بے دلیل قبول خرد نہیں' اگر مطالعہ مطلق ہو تو کسی کو کچھ بھی سمجھا یا کہا جا سکتا ہے لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اُردو شاعری میں دو مقابل یا حریف شعراء کا جو سلسلہ گزرا ہے جیسے میرؔ و سوداؔ' ناسخؔ و آتشؔ اُسی میں انیسؔ و دبیرؔ بھی ہیں جو ایک دوسرے کے حریف یا مقابل شاعر ہوئے ہیں اور ان کا مطالعہ ایک دوسرے کے تقابل میں ہوتا ہے اور اُن کی کسی مشترک صفت کا مطالعہ اُن کے مقابل کی اُسی صفت سے کر کے فضیلت معین کی جاتی ہے۔ یہ مفروضہ ایسا نہیں ہے جو محتاجِ استدلال ہو پھر بھی چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:۔

میر انیسؔ مرحوم کی پہلی سوانح عمری حیاتِ انیسؔ مولوی امجد علی اشہری مرحوم نے مولانا شبلی مرحوم کی فرمائش پر لکھی[1]

---

[1] حیاتِ انیس ص ۲

لیکن شبلی نے خود جس موضوع کا انتخاب کیا وہ موازنۂ انیس و دبیر تھا لیکن میں شاید ماضی بعید کے دھندلکوں میں پہنچ گیا ہوں۔ کچھ قریب آنا چاہیئے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب میر انیس مرحوم کے مرثیوں کی ایک منتخب جلد شائع فرمانا چاہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا نام "سبعہ معلقہ" رکھنا چاہتے تھے۔ اس ارادے کا تذکرہ دبستانِ دبیر کے جوہرِ قابل میر سرفراز حسین خبیر سے آگیا اور ثانی الذکر نے "سبع مثانی" مرزا صاحب کے منتخب مراثی کی جلد پہلے ہی شائع کردی اور میر صاحب کی جلد پروفیسر صاحب نے پھر روحِ انیس کے نام سے شائع کی۔ لیکن یہ بھی نسبتاً پرانی بات ہے۔ انھیں مرحوم مسعود صاحب نے کلامِ انیس کی ایک خاص ترتیب سے رزم نامۂ انیس مرتب کیا۔ خبیر صاحب مرحوم نے بھی تتبع کیا اور بکمال نیک نفسی اس کا اعتراف فرمایا اور اسی جذبۂ تقابل نے رزم نامۂ دبیر ایسا رزمیہ اردو ادب کو مہیا کیا۔ اردو اکادمی اترپردیش نے میر انیس مرحوم پر ایک مذاکرہ (سیمینار) کا اہتمام کیا تو ان سطور کے راقم نے اپنے ایک دانشور دوست کے مشورے سے مرزا صاحب مرحوم کے لئے بھی ایسی ہی تقریب کا مطالبہ کیا۔ میں نے بصیغۂ متکلم گفتگو شروع کردی ہے۔ جانتا ہوں کہ یہ معیوب ہے لیکن آپ باور فرمائیں کہ یہ صورتِ حال کا جبر ہے جسے برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ ظاہر صرف یہ کرنا ہے کہ ایک کرمفرما نے مجھ سے مرزا دبیر مرحوم پر مضمون کی فرمائش کی۔ میں نے کلامِ دبیر کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا ہے اس لئے ان پر لکھنا یوں بھی دشوار تھا جس قدر عجلت مطلوب تھی اس کے پیشِ نظر تو مشکل اور بڑھ گئی تھی۔ آخر میں یہی جذبۂ تقابل کام آیا۔ پروفیسر مسعود حسن صاحب مرحوم نے "میر انیس کے دو استاد" کے عنوان سے ایک مضمون تحریر فرمایا تھا جو "نذرِ عابد" میں شامل ہے۔ اس مضمون کی ایک آف پرنٹ براہِ ہمت افزائی مجھے بھی مرحمت فرمائی تھی۔ چنانچہ پروفیسر صاحب مرحوم کی تقلید و تتبع کے اظہار کے ساتھ "مرزا دبیر کے دو استاد" کے عنوان سے میں نے اپنے پریشان خیالات اور ناقص معلومات قلمبند کئے اور ایک باکمال مداحِ اہلبیت اور ان کے عالم اساتذہ کی یاد تازہ کرنے کا ثواب اور ایک مکرم دوست کی تعمیلِ فرمائش کا انبساط حاصل کیا اور ساتھ ہی ساتھ ایک نامور دانشور کے چراغ سے چراغ جلانے کا شرف بھی۔ جملہ یہ سب ایک طرح سے جگ بیتی ہے۔ سرفراز کی آپ بیتی یہ ہے کہ اس نے ۱۴۰۹ھ (۱۹۸۸ء) میں اپنا "محرم نمبر" "انیس نمبر" کی شکل میں پیش کیا اور اسی حوالے سے یہ دبیر نمبر قارئین گرامی کے پیشِ نظر ہے۔

اس کج بیانی سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس طرح کا تقابل یہ موازنہ راقم آثم کی رائے میں نامناسب ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ صورتِ حال کے منطقی مطالبے کی تعمیل و تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ خدا کرے اسی طرح چراغ سے چراغ جلتے رہیں۔

آیئے! اب ان دو باکمال حریفوں کی خاندانی شاعری کا مطالعہ خود ان کے کلام میں کریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم یہ یاد کرلیں کہ پختہ یا ادھیڑ عمر میں میر انیس مرحوم جب لکھنؤ پہنچے تو مرثیہ خوانی کے منبر پر مرزا دبیر مرحوم کا قبضہ تھا۔ میاں فصیح مرحوم زبان میں لکنت کی وجہ سے مرثیہ خوانی کرتے ہی نہیں تھے۔ میاں دلگیر مرحوم اگرچہ حیات تھے لیکن ان کا کیا ذکر ہے۔ مرزا صاحب کی طباعانہ جدتوں نے خود اپنے استاد میر ضمیر مرحوم کو فرسودہ کردیا تھا۔ تعلقات کی بدمزگی نے مقابلے کی کشاکش پیدا کردی تھی۔ ظاہر ہے کہ تازہ دم زور آور شاگرد نے [illegible] کے ضعیف استاد کو اس میدان میں پسپا کردیا تھا اور منبر کو اپنی جاگیرِ کمال بنالیا تھا۔ صاحب واقعاتِ انیس میر صاحب مرحوم سے روایت کرتے ہیں کہ:۔

"میر انیس مرحوم خود فرماتے تھے کہ جب
ہم نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا شروع کیا تو

... صاحب اس فن کے لکھنؤ میں نامور گزرے تھے۔ ایک میر ملاری صاحب جو یہیں رہتے تھے اور دوسرے مرزا سلامت علی دبیر مرحوم ہیں۔

یہ روایت معلوم نہیں احسن صاحب تک کس وسیلے سے وارد ہوئی، راقم کے لئے تو قابل قبول نہیں۔ میر ضمیر مرحوم کا بازار کتنا ہی سرد ہو گیا ہو۔ لیکن وہ میدان سے ہٹ گئے ہوں یہ ممکن نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ ملاری صاحب کتنے ہی مقبول ذاکر رہے ہوں نامی گرامی ہونے کے اعتبار سے اُن کا نام مرزا صاحب مرحوم کے نام کے ساتھ میر انیس مرحوم لیں یہ بھی محال ہی ہے۔ صورت حال یہ تھی کہ سربرآوردگی کے اعتبار سے مرزا صاحب مرحوم سب سے اول تھے کہ میر انیس مرحوم نے لکھنؤ میں قدم رکھا۔

اُس وقت لکھنؤ میں قوت کے دو ہی سرچشمے تھے' ایک دولت سرائے شاہی' دوسرے آستانۂ غفراں مآب رحمۃ اللہ اگرچہ ریزیڈنسی اُن سے زیادہ مؤثر تھی مگر طاقت کی اس گنگا جمنا کے نیچے سرسوتی کی حیثیت رکھتی تھی کیونکہ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے ان معرکوں سے اُس کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے اس سطح سے غائب تھی۔ ان دونوں طاقتوں کی حمایت بھی مرزا صاحب مرحوم کو حاصل تھی۔ اُن کی رسائی عہد غازی الدین حیدر شاہ مرحوم میں دربار میں ہو چکی تھی۔ خود فرماتے ہیں ؎

واجب ہے حمد و شکر جناب الٰہ میں
فضلِ خدا سے آیا ہوں کس بارگاہ میں
مجھ سا گدا اور انجمن بادشاہ میں
چرچا یہ لوگ کرتے ہیں اس وقت راہ میں
ذرے پہ چشم مہر ہے مہر منیر کو
حضرت نے آج یاد کیا ہے دبیر کو

نصیر الدین حیدر شاہ کے عہد میں تو وہ ملکہ زمانیہ مرحومہ کے باقاعدہ متوسلین میں شامل ہو گئے۔ مثنوی ممتاز ہے جو اسی توسل کی یادگار ہے' کی تمہید میں فرماتے ہیں :-

بفرمودۂ بیگم نامدار — کہ جس سے زمین و فلک کا وقار
دیا اُس نے حکم اطاعت شیم — کہ معراج کا حال تو کر رقم
بجا لایا فی الفور ارشاد خاص — اطاعت ہے سب اہل دل کا خواص

میر انیس کی لکھنؤ میں مستقل قیام کے لئے آمد کے وقت امجد علی شاہ زیب اورنگ سلطنت تھے۔ اُن کی مذہب پسندی اور دینداری مذہبی حلقوں میں بہت ممدوح تھی' مرزا صاحب مرحوم سے بطور خاص مدح سرائی کی۔ مرزا صاحب مرحوم نے مجموعہ مراثی دفتر ماتم جلد اول میں پہلا مرثیہ :- • طغرا نویس کن فیکوں ذوالجلال ہے" اس میں بادشاہ اور جناب سلطان العلماء، زبدۃ العلماء کا ذکر خیر ہے۔ اس مرثیہ کی شان نزول مولانا آغا مہدی صاحب قبلہ یہ بتاتے ہیں :-

> مدرسہ غفراں مآب علیہ الرحمہ میں ہمیشہ شہر کے مشہور ذاکرین پڑھا کرتے تھے لیکن تاریخ سے ثابت ہے کہ ایک بار اُس مجلس میں مرثیہ خوانی بھی ہوئی۔ چنانچہ علامہ کنتوری مولانا سید غلام حسنین صاحب مرحوم و مغفور اپنے ایک مقالے میں اس کا اظہار فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ جناب غفراں مآب کے مدرسہ کی مجلس میں مرزا دبیر مرحوم نے اپنے پڑھنے کی درخواست کی۔ بڑی دشواری سے اجازت ملی۔ ایک مرثیہ مثل خطبہ کہہ کے لائے اور پڑھا اور تمام عمر فخر کرتے رہے کہ میں نے اپنا کلام

ل سنہ ۲۷

علماء اعلام کے سامنے پڑھا۔ الوارث
ص۱۳ بابتہ ربیع الاول و ربیع الآخر [illegible] [۲]

اس معاملے کو دنیا طلبی کی راہ سے نہیں دیکھنا چاہیے خود فرماتے ہیں ؎

واقف ہے کبریا کہ دروغ و ریا نہیں
مقصد کوئی رضائے خدا کے سوا نہیں

یہی صورت حال تھی جس کی شہادت سلطان عالم واجد علی شاہ مرحوم کی یہ بیت ہے ؎

بچپن سے اُن کے دام سخن میں اسیر ہوں
میں کم سنی سے عاشق نظم دبیر ہوں

خاندانِ اجتہاد سے یہ رشتۂ ارادت نیا نہ تھا جب مرزا صاحب کے پدر نامدار مرزا غلام حسین صاحب مرحوم نے اپنا رشتۂ مناکحت لکھنؤ میں چاہا تو حسب نسب کی پوچھ گچھ ہوئی۔ اُنھوں نے ایک محضر استشہاد مرتب کرکے عمائد و علماء سے اپنی حسبی و نسبی حیثیت کی شہادت چاہی۔ اس محضر پر حضرت شاہ عالم بادشاہ غازی اور دوسرے امراء و عمائد کے دستخط کے ساتھ جناب غفران مآب کے دستخط بھی حاصل کیے۔ اس واقعے کے بعد یہ سمجھ لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے کہ جب مرزا سلامت علی کو لے کر اُن کے والد لکھنؤ تشریف لائے ہوں گے تو غفران مآب کی ڈیوڑھی پر سب سے پہلے گئے ہوں گے۔

اس کے علاوہ مولانا مرزا کاظم علی صاحب طاب ثراہ جناب غفران مآب کے اکابر و اقرب تلامذہ میں تھے۔ اُن سے مرزا دبیر مرحوم کے والد کی دیرینہ واقفیت معلوم ہوتی ہے۔ ابھی جس محضر شہادت کا ذکر ہوا اُس پر غفران مآب نے مولانا کاظم علی صاحب کے ہی اعتماد خصوصی کی بنا پر دستخط فرمایا تھا۔

ان سب پر مستزاد مرزا صاحب مرحوم کی مزاج کی مولویت اور مذاقِ شاعری کی ثقاہت پسندی بھی علماء اعلام کے حلقوں میں مرحوم کی پسندیدگی کا باعث تھی۔ جناب سلطان العلماء کے فرزند ارجمند تاج العلماء مولانا سید علی محمد صاحب نے اسی لئے مرزا صاحب سے تلمذ اختیار کیا۔ مرزا صاحب مرحوم کو بھی اس خانوادے سے بہت لگاؤ تھا برابر اُس کی خوشنودی کے جویا رہتے تھے بسنہ ۱۲۸۳ھ میں جب جناب سید العلماء کا سانحۂ رحلت پیش آیا۔ مرزا صاحب کے دو تلامذہ نے جناب مرحوم کا مرثیہ کہا۔ ایک حکیم سید محمد علی خاں قدیر دوسرے شیخ گوہر علی مشیر۔ مشیر کے لیے تو ثابت مرحوم کا کہنا ہے کہ یہ مرثیہ مشیر مرحوم نے جناب مرزا صاحب رحمۃ اللہ کے اشارے پر نظم کیا تھا۔ افسوس کہ ابھی تک میری رسائی ایک بیت تک ہوئی وہی نذر ناظرین ہے۔ بیان ' بھائی کے سوگ میں سلطان العلماء کے حزن و الم کا ہے ؎

آنسو بھرے تھے غیرت الیاس کے لیے
شبیر یوں ہی روتے تھے عباس کے لیے [۳]

قدیر مرحوم کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں بھی سلطان العلماء کے درد و غم کا تذکرہ ہے ؎

لی ہوگی اس جناب نے جس دم عدم کی راہ
کیا حال ہوگا آہ بڑے بھائی کا تباہ
رو کر یہ کہتا ہوگا وہ اے عرش بارگاہ
کیوں بھائی سید العلماء' خاصۂ الہٰ
اُلفت تمھیں ہماری نہ آئی چلے گئے
پیری میں ہم کو چھوڑ کے بھائی چلے گئے [۴]

ممکن ہے کہ مرزا صاحب مرحوم سے متعلق مولانا آغا مہدی

---

۲ ماہنامہ الناظر لکھنؤ بابتہ فروری ۱۹۵۲ء ص ۱۷

۳ حیات دبیر (۱) ص ۴۹

۴ تاریخ سلطان العلماء مصنفہ مولانا آغا مہدی ص ۹۲

مدحت جلد کے منتخبات نظم کے ساتھ یہ مرثیہ بھی راولپنڈی
پاکستان سے جلد شائع ہو۔ اس کے بعد دبیر و تلامذۂ دبیر
کے خاندانِ اجتہاد کے ساتھ روابط کا صحیح ادراک ہو سکیگا۔
اس صورتِ حال کی شہادت ہے کہ مرزا صاحب کی
مرجعیت کے لئے دربارِ شاہی اور خاندانِ اجتہاد جو حلیفین
بنے ہوئے تھے۔ ان حالات میں کسی نووارد مرثیہ گو کو ابتدا
سخت آزمودگی آمد کی جس صعوبت کا سامنا ہو سکتا
ہے اُس کا سمجھنا زیادہ مشکل نہیں ہے اور پھر نووارد بھی
کیا بقول پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم :-

• اس نووارد کا کلام کون سنتا اُس کے
کلام کا رنگ بھی دبیر سے بالکل مختلف تھا۔
جو لوگ خیال بندی، جدت طرازی اور صنعت گری
کے عادی ہو چکے تھے وہ انیس کے کلام کی سلاست
متانت اور واقعیت کی طرف جلد ملتفت
نہ ہو سکے۔ ان کے پڑھنے کی مجلسوں میں سامعین
کی تعداد بھی بہت کم ہوتی تھی اور اُن میں
شوق کی کمی بھی محسوس ہوتی تھی۔ انیس نے
اپنے ابتدائی کلام میں جا بجا اس کا ذکر کیا
ہے۔ اُن کے کلام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے
کہ ایک جماعت اُن کی مخالفت پر تلی ہوئی
تھی۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک مناجات
کہی تھی جس کے چند مصرعے یہ ہیں :-

اک طرف میں ہوں زمانہ اک طرف
جانِ شیریں سخت ہوتی ہے تلف
دیکھتا ہوں پیش و پس کوئی نہیں
میں تو تنہا ہوں بس کوئی نہیں [1]

غرض یہ نہیں کہنا ہے کہ میر صاحب کی قدر دانی نہیں
ہوئی۔ ہوئی اور خوب ہوئی۔ وہ وقت بھی آیا کہ اُن کی
لفظیں 'عالم پسند' اور بند 'سلطان پسند' ہونے لگے۔ مگر یہ
اُس وقت کا حال ہے جب بہارِ عمر خزاں رسیدہ ہو گئی۔
فرماتے ہیں ؎

بس اے انیس ضعف سے ارزاں ہے بند بند
عالم میں یادگار رہیں گے یہ چند بند
نکلے قلم سے ضعف میں کیا کیا بلند بند
عالم پسند لفظ ہیں سلطان پسند بند
یہ فصل اور یہ بزمِ عزا یادگار ہے
پیری کے ولولے ہیں خزاں کی بہار ہے

لیکن شروع شروع میں اربابِ زمانہ کی سرد مہری نے
جو سوزش پیدا کر رکھی تھی جس کے دفعیے کے لئے مناجات نظم
کی تھی وہ سوزشِ قلب مرثیوں میں کچھ زیادہ نمایاں ہے۔ آپ
ذیل کے بند ملاحظہ فرمائیں۔ ان سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ
سامعین کا ایک طبقہ میر صاحب کی مجلسوں میں ایسا بھی ہوتا تھا
جو داد دینے سے گریز کرتا تھا ؎

نیک و بد عالم میں تامل نہیں کرتے
عارف کبھی اتنا بھی تجاہل نہیں کرتے
خاروں کے لئے رُخ طرفِ گل نہیں کرتے
تعریفِ خوش الحانیِ بلبل نہیں کرتے
خاموش ہیں گو شیشۂ دل چور ہوئے ہیں
اشکوں کے ٹپک پڑنے سے مجبور ہوئے ہیں

الماس سے بہتر یہ سمجھتے ہیں خذف کو
دُر کو تو گھٹاتے ہیں بڑھاتے ہیں صدف کو
اندھیر ہے، یہ چاند بناتے ہیں کلف کو
کھو دیتے ہیں شیشے کے لئے دُرِّ نجف کو
ضائع ہیں نہ وہ لعلِ بدخشانِ سخن کے
مٹی میں ملاتے ہیں جواہر کو سخن کے
ناقدریِ عالم کی شکایت نہیں مرزا

---

[1] سرفراز انیس نمبر ۱۳۴۲ھ ص ۲۲۵

کچھ دفتر باطل کی حقیقت نہیں مولا
باہم گل و بلبل میں محبت نہیں مولا
میں کیا ہوں کسی روح کو راحت نہیں مولا

عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے
اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

اسی کیفیت کو مرزا صاحب بھی نظم فرماتے ہیں ؎

آ ڈر رہے چلتے پہ اب اے گل کے مددگار
بے قدر ہے سنجیدگی، گوہر شہوار
جیسا کہ ترازو کا ہنر قحط میں بے کار
نے جنس عدالت، نہ خریدار، نہ بازار

انصاف کہاں ہے جو کہ دل صاف نہیں ہے
دل صاف کہاں ہے جو کہ انصاف نہیں ہے

اس کیفیت کی تعلّی کے پردے میں بھی کافی نمود ہوتی ہے۔ میر صاحب انھیں "دل کے پھپھولوں کی دوا" کہتے ہیں۔ دو بند میر صاحب کے ملاحظہ فرمائیے ؎

لا لعلم و لا علم کی کیا سحر بیانی
حضرت یہ ہویدا ہے مری ہیچمدانی
نہ ذہن میں جودت نہ طبیعت میں روانی
گویا ہوں، نطق ہے یہ تری فیض رسانی

میں کیا ہوں فرشتوں کی طلاقت ہے تو کیا ہے
نہ خاص یہ بندے ہیں کہ مداح خدا ہے

تھا جوش کچھ ایسا ہی کہ دعویٰ کیا میں نے
خود سر بہ گریباں ہوں کہ یہ کیا کیا میں نے
اک قطرۂ ناچیز کو دریا کیا میں نے
تقصیر بھی کیجیے، بے جا کیا میں نے

ہاں سچ ہے کہ اتنی بھی تعلّی نہ روا تھی
مولا یہ کلیجے کے پھپھولوں کی دوا تھی

اس "ہویدا ہیچمدانی" کے جواب میں مرزا صاحب کی "ہمہ دانی" کا اظہار مگر "چرب زبانی" سے انکار ملاحظہ فرمائیے ؎

مضمون نئے کرتا ہوں ایجاد ہمیشہ
کہتا ہے سخن حضرت استاد ہمیشہ
کہنے میں ہے تائید خدا داد ہمیشہ
بھولے سے بتا دوں تو رہے یاد ہمیشہ

بے لطف خدا یہ ہمہ دانی نہیں آتی
پر شمع صفت چرب زبانی نہیں آتی

میں بلبل خوش لہجۂ بستان سخن ہوں
میں معرکہ میں رستم دستان سخن ہوں
میں وارث اورنگ سلیمان سخن ہوں
ایمان سخن، زین سخن، جان سخن ہوں

عاجز ہوں کہ بندہ ہوں پر اعجاز بیاں ہوں
سر تا بہ قدم ہیچ ہوں لیکن ہمہ داں ہوں

میر انیس کی یہ رباعی اسی "شمع صفت چرب زبانی" کی حسن تکمیل معلوم ہوتی ہے ؎

زیبا ہے وقار بادشاہی کے لیے
جرأت واجب ہے کج کلاہی کے لیے
لازم ہے کہ ہو اہل سخن تیز زبان
تلوار ضرور ہے سپاہی کے لیے

سلف کے باکمال مداحان اہلبیت کو دونوں باکمال یاد کرتے ہیں مگر اپنا اپنا انداز ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

میں کیا ہوں مری طبع ہے کیا اے شہ شاہاں
حسان و فرزدق ہیں یہاں عاجز و حیراں
شرمندہ زمانے سے گئے دعبل و سحباں
قاصر ہیں سخن فہم و سخن سنج و سخن داں

کیں مدح کف خاک سے ہو نور خدا کی
لکنت یہیں کرتی ہیں زبانیں فصحا کی

مرزا صاحب فرماتے ہیں ؎

... دبستانِ سخن ہے
ثابت ہے کہ حلق ثناخوانِ سخن ہے
آئینہ ... سخن ہے
کٹ ... میدانِ سخن ہے
کس طرح کی رونق ہے اس انداز کے آگے
جادو کہیں چل سکتا ہے اعجاز کے آگے

ایک جگہ مرزا صاحب نے اپنے کو محتشم و مقبل کی
خاکِ قدم کہا تھا تو بیت میں کسر نکال لی ہے

میں کون ہوں صاحبِ علم کلکِ جہاں گیر
نوبت زنِ شہ بامِ عروجِ فلکِ پیر
تاجِ سرِ لفظ و سخن و معنی و تحریر
خاکِ قدمِ محتشم و مقبل و شبیر

منکر نہ کرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے
انصاف تو کہتا ہے خداوند یونہی ہے

یہاں جوشِ تعلی میں اپنے کو انصاف کے منہ سے
خداوند کہلوا لیا اگرچہ انسان کو خداوند کہے جانے کے سخت
مخالف ہیں ہے

اک روز خدا کو منہ دکھانا ہے دبیر
بندے کو میں کس منہ سے خداوند کہوں

جب لکھنؤ پر میر صاحب کی اعجاز بیانی کا جادو چل
ہی گیا اور ساری نصیلیں ڈھا کے وہ تختِ کمال پر جلوہ فگن
ہو ہی گئے تو پھر تعلی نے خطاب کی صورت اختیار کر لی اور
ایک دوسرے پر نقش اندوزی اور مضامین کے سرقے کا الزام
لگانے لگے۔ مرزا صاحب نے کہا:

شیران مضامیں کو کہاں بند کروں
گرجیں گے ڈکاریں گے جہاں بند کروں
خلاقِ مضامیں تو سبھی ہیں لیکن
کھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں

میر صاحب نے کہا ہے

گلہائے مضامیں کو کہاں بند کروں
خوشبو نہیں چھپنے کی جہاں بند کروں
ہیں باعثِ نغمہ سنجی بلبلِ ہزار
کھولے نہ کبھی منہ جو زباں بند کروں

میر انیس نے ایک سلام میں کہا:

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

مرزا دبیر مرحوم نے کہا ہے

ہزار خوشے ہیں مضموں کے ایک دانے میں
غنی کیا مرے خرمن نے خوشہ چینوں کو

میر مونس مرحوم نے بھی اس زمین میں کوشش کی۔ اب
جناب میر میاں عشق اپنی جریدہ زبانی کے ساتھ آگئے۔ فرماتے
ہیں ہے

جلی کٹی مرے استاد سے کرے جو کوئی
تو پھونک دوں سے خرمن میں خوشہ چینوں کو

اس طرح کے خیالی مضامین اور فکر کی بلند پروازی میں
مرزا صاحب نے برابر کی چوٹیں کی ہیں۔ نابت مرحوم کا فرمانا
بجا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کی یہ رائے غلط ہے کہ "مرزا صاحب
برابر کا جواب نہیں دیتے"۔ لیکن جہاں حقائق کی بحث ہو
وہاں مرزا صاحب کے لیا مقدس مداح مخبرِ صادق کیا کرے
اب وہ مقامات دیکھئے جہاں میر انیس اپنے محدود وقت
پر مباہات کرتے ہیں۔ مشہور مرثیہ ہے:

" نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری "

جو اپنے فرزند میر عسکری جلیس کے لئے کہا تھا اس میں کہتے
ہیں ہے

نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری
ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت میری
رنگ اڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری
شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں

اس ثناخواں کے بزرگوں میں ہیں کیا کیا مداح
جد اعلیٰ سے نہ ہوگا کوئی اعلیٰ مداح
باپ مداح کا مداح ہے، دادا مداح
عم ذی قدر ثناخوانوں میں یکتا مداح

جو عنایات الٰہی سے بڑا نیک ہوا
نام بڑھتا گیا جب ایک کے بعد ایک ہوا

خلق میں مثل خلیق اور تھا خوش گو کوئی کب
نام لے بڑھ کے زباں کیوں نہ تسلیم سے جب
بلبل گلشن زہراؑ و علیؑ، عاشق رب
متبع مرثیہ گوئی میں ہوئے جس کے سب

ہو اگر طبع کی جدت تو نہ موروثی ہے
اس احاطے سے جو باہر ہے وہ بیرونی ہے

کیوں نہ ہو بندۂ موروثی مولا ہوں میں
قلزم رحمت معبود کا قطرا ہوں میں
جس میں لاکھوں گہر و مرجاں ہیں وہ دریا ہوں میں
مدح خوانِ لبِ حضرتِ زہراؑ ہوں میں

وصف جوہر کا کروں یا صفت ذات کروں
اپنے رتبے پہ نہ کیوں آپ مباہات کروں

ایک بیت یہ بھی ملاحظہ فرمایئے:

جد و آبا کے سوا غیر کی تقلید نہ ہو
لفظ مغلق نہ ہو، گنجلک نہ ہو، تعقید نہ ہو

اگر جناب مرزا صاحب کا سرمایۂ سخن ان مضامین سے خالی ہے تو وہ نہ ان کا عجز ہے نہ انکسار بلکہ بات یہ ہے کہ وہ ایک غیور اور کریم النفس انسان کی طرح حقیقت حال پرستار تھے اور جوڑ توڑ یا حرب زبان سے کسی پر اپنی دستار افتخار میں طُرّے ٹانکنے یا چھین جھپٹ کے طرّے نہیں سجانا چاہتے تھے اور بہر صورت ان کے ذی شعور معتقدوں کی رائے ہے۔ جناب خبیر مرحوم اپنے دبستان کی مراعات کے ساتھ صورت حال کی عکاسی کرتے ہیں:

"میر انیس کی شاعری اگرچہ مرزا دبیر کی شاعری کے بعد شروع ہوئی پھر بھی وہ ایسے کہنہ مشق، صاحب کمال، ذی استعداد عالم جید کے مدمقابل ٹھہرائے گئے اور اپنا کمال منوا کے رہے۔ اسی طرح مرزا دبیر اگرچہ خاندانی شاعر نہ تھے، ان کے بعض بزرگ شاعر رہے بھی تو فارسی کے اور میر انیس اگرچہ خاندانی شاعر تھے۔ باپ، بھائی سب صاحب کمال تھے، انھوں نے اسی ماحول میں پرورش پائی، جہاں یہی چرچے رہتے تھے مگر مرزا دبیر نے ان کے مقابل میں اپنا سکۂ کمال جاری رکھا اور یہ ثابت کر دیا کہ کمال کے واسطے صرف خاندانی ہونا کافی نہیں:" [۲]

اب جو کہ مرزا خبیر مرحوم کے اس استدلال کو قطع کرنا چاہیں تو انھیں اس کے لئے ایسے ساز و سامان کے ساتھ آنا چاہیئے جو قابل قبول ٹھہرے اور اسی کے ساتھ مرزا صاحب مرحوم کے جد و اب مرزا غلام محمد اور مرزا غلام حسین کی شاعری کا ثبوت مہیا کرنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ثابت کی جانا چاہیئے کہ ملا اہلی شیرازی یا ملا رفیع تک شاعری اسی دور پر بطور میراث پہنچی جیسے میر حسن مدعی ہیں کہ "ایں سگ

۱؎ رزم نامۂ دبیر ص۸
۲؎ اسلاف میر انیس ص۱۷۱

مادر فن اور رشتۂ شاعری کا اجداد لیست نہ امروزی:"
الغرض ان کے بعد بھی یہ سوال اپنی جگہ پر رہے گا کہ
مرزا صاحب کو اپنے جد و آبا کے سرمایۂ شاعری سے کوئی
نفع پہنچا اور وہ غیر کی تقلید اور پیروی کی خرمن سے خوشہ چینی
پر کیوں مجبور ہوئے۔
اور جب تک ان سوالات کا حل قابلِ قبول طریقے سے
نہیں نکل آتا ہے اُس وقت تک یہ حقیقت نا قابلِ تردید
رہے گی:-

"کوئی اکتسابی فن بھی کسی خاندان میں
کئی پشتوں تک نہیں چلتا ہے۔ یہ شرف اسی
خاندان شاعری یعنی میر انیس کے خاندان
کے لئے مخصوص ہے کہ شاعری کا وجدانی فن
آٹھ پشتوں تک چلتا رہا۔" [1]

مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ

الوداع!

لو یارو الوداع دمِ شور و شین ہے ، اب تم سے سال بھر کو وداعِ حسین ہے
روئے پچاس روز مگر جی نہیں بھرا ، " " " " " "
اک شب کی شب یہ تعزیہ ہے اور مومنو ، " " " " " "
ماتم بھی آخری ہے یہ مجلس بھی آخری ، " " " " " "
کس کو خبر ہے چہلم آئندہ ہو نصیب ، " " " " " "
اچھی طرح وداع کرو میہمان کو ، " " " " " "
کل چاند فاطمہ کا زمیں میں چھپے گا ہائے ، " " " " " "
کل تم کہاں یہ بزم کہاں اور ہم کہاں ، " " " " " "

---

[1] اسلاف میر انیس ص ۱۷۶

ڈاکٹر فضل امام
اُستاد شعبۂ اُردو۔ راجستھان یونیورسٹی۔ جے پور

دبیریت کیا ہے؟

عام طور سے ناقدین اور مؤرخین ادب دبیر کو ثقالت پسند، ضلالت عزیز اور غیر ثقہ روایات کا نظم کرنے والا مرثیہ گو کہتے ہیں۔ دبیر کے کلام پر اس انداز کی تنقید اس بات کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہے کہ ہمارے ناقدین ادب سہل انگاری میں یقین رکھنے کے عادی رہے ہیں، چند مفروضہ امتیازات کے چوکھٹوں میں انیس و دبیر کے شاعرانہ اکتسابات کا احاطہ کرنے والے غالباً اُردو شعر و ادب کو انتہائی محدود اور مسدود تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ ادب کا غائر مطالعہ عرق ریزی اور دیدہ ریزی کے ساتھ ساتھ دلسوزی کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔ دبیر ایسا ہی ایک شاعر تھا جو بدنصیبی سے مرثیہ گو بھی تھا۔ فی الحال مجھے یہاں مرثیہ گوئی کی نہ تو تاریخ بیان کرنی ہے اور نہ صنف سخن کے لحاظ سے اُس کے دائرۂ کار کا تعین کرنا ہے۔ بحث صرف اس قدر ہے کہ وہ کیا چیز ہے جسے اودھ کے مشہور و معروف محاورے میں "دبیریت" کہا جاتا رہا ہے۔

مختصر طور پر ہمیں یہ بات بھی عرض کرنی ضروری ہے کہ ہمیں سب سے پہلے مرثیہ کے موضوعات، محرکات، اسباب و علل، علت و معلول پر گہرائی سے غور و فکر کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی اس صنف سخن کے زیر اثر مرثیہ نگاروں پر نتیجہ خیز بحث ہو سکتی ہے۔ تعجب تو اس پر ہے کہ ہم لوگ پہلے نظریہ قائم کرنے کے عادی ہوتے ہیں اور نظر بعد میں پیدا کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے نظریات "تار عنکبوت" سے زیادہ پائیدار نہیں ہوتے ہیں۔ دبیر کے متعلق بھی اسی انداز کے نظریات روا رکھے گئے ہیں لیکن دبیر کا تجزیاتی مطالعہ ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ در حقیقت "دبیریت" فکر و فن کے اُس تدبر کا نام ہے جو ذہن انسانی کے سوتوں کو آب زلال میسر کرتا ہے۔ وجدان و آگہی فن کی اس قسمت کا نام دبیریت ہے جہاں ہمارے تفکر و تفلسف کی امکانی سرحدوں کو چیلنج کیا جاتا ہے۔ "دبیریت" نام ہے فکر و فن کی اس رفعت کا جہاں فنی بصیرتوں اور جدید وسعتوں کا سنگم نظر آتا ہے۔ "دبیریت" نام ہے اُس دقت نظر کا جو فن کی تقدیر بھی ہے اور تجزیہ بھی۔ دبیریت نام ہے فن کی اُس وادیٔ پُرخار کا جہاں خس خانۂ فن سے نگاہوں کو باہر نکال کر کڑی دھوپ کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ "دبیریت" نام ہے شدت جذبات، نزاکت احساس، دقت نظر اور دقیقہ سنجی کے اُس دبیز پردے کا جسے علم و فن کی بصیرتوں کا رازدار ہی اپنے ہاتھوں سے ہٹا سکتا ہے۔ اب یہاں اس اجمال کی تفصیل کا ایک مختصر لیکن مقصدی جائزہ درپیش ہے۔

تنقید دبیر کے سلسلے میں دبیر کی زبان اور انداز بیان کو مشکل اور عوام کے بجائے خواص اور خواص میں بھی ایک

...طبقے کے رونے رلانے کے لئے بنایا گیا ہے "تنقید دبیر" کا نتیجہ دلچسپ بھی ہے اور کافی حد تک مضحکہ خیز بھی۔ دلچسپ اس لئے کہ زبان اور انداز بیان کی مشکل پسندی کے باعث دبیر کا کلام عوام سے علاحدہ ہو کر صرف ایک مخصوص طبقے کے رونے رلانے کا سبب بن گیا ہے؟ یا رونے رلانے کے سبب سے صرف ایک مخصوص طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ اگر زبان اور اندازِ بیان کی مشکل پسندی سببِ علاحدگی ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ خود اقبال اور حضرت میر انیس کا بھی بعض کلام ایسا ہی ہے۔ خاص طور سے "بالِ جبریل"۔ "ضرب کلیم" اور "ارمغانِ حجاز" کا اقبال عام فہم نہیں ہے بلکہ بہت مشکل پسند ہے اور آج تو غالب، اقبال، انیس اور دبیر کے کلام کا صحیح طور پر ادراک کرنا ہی ایک امتحان ہے۔ سودا اور ذوق کے قصائد بھی اسی ذیل میں آجاتے ہیں تو کیا ان سب شعراء کی کاوشیں علاحدگی اور کسی خاص طبقہ کا مطالبہ کرتی ہیں اور اگر سبب گریہ و بکا ہی عوام سے علاحدہ کرتا ہے تو اس نقطۂ نظر سے صرف دبیر ہی نہیں انیس بھی اور صرف انیس ہی نہیں بلکہ مرثیہ صنفِ سخن کی حیثیت سے یہی مطالبہ کرتا ہے چاہے وہ لغوی معنوں سے مختلف ہو کر اصطلاحی معنوں میں کچھ بھی استعمال ہونے لگے یا صفی معنوں میں کچھ بھی مروج ہو جائے لیکن جب لفظ "مرثیہ" کو ہم صنفِ سخن کے اعتبار سے مطالعہ کرتے ہیں تو جنوبی ہند سے شمالی ہند اور پھر اودھ میں مختلف مدارج اور منازل میں نظر آتا ہے۔ پھر بھی بہ اعتبار صنفِ سخن۔ شخصی مرثیوں میں بھی مرکزی نقطۂ نظر رونا رلانا ہی رہتا ہے اور بات ہے کہ صفاتِ ذات کا تذکرہ اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ آنکھوں سے بے ساختہ آنسو اور دل سے ضرور آہ نکل جاتی ہے اس لئے یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ مرثیہ ایک فطری اور حسین فطری صنفِ سخن ہے۔

انیس و دبیر ایک ہی عہد کے شاعر ہیں۔ لیکن فرق اتنا ہے کہ ایک کی پیدائش دہلی میں ہوئی اور دوسرے کی فیض آباد میں ایک کی شاعری کی ابتدا لکھنؤ میں ہوئی اور دوسرے کی فیض آباد میں اور ایک وقت ایسا آیا جب دونوں لکھنؤ میں چمکنے لگے پھر بھی انیس و دبیر کا موازنہ جس نقطۂ نظر سے کیا جاتا رہا ہے وہ قطعی گمراہ کن ہے۔ شبلی ہمارے ان ناقدین میں ہیں جو تاویلات اور توجیہات میں اپنا نظیر نہیں رکھتے ہیں۔ انیس و دبیر کے موازنہ میں بھی شبلی نے اپنی فطری بت پرستی سے کام لیا ہے۔ گو کہ انیس و دبیر کا موازنہ اردو کے مرثیہ نگاری ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ میں شمس العلماء مولوی امداد امام اثر کے مندرجۂ ذیل نقطۂ نظر سے بہت حد تک متفق ہوں کہ انیس رزمیہ شاعر ہے اور دبیر خالصاً مرثیہ گو شاعر ہے۔ ملاحظہ ہو:

"لاریب آپ سلطان الذاکرین تھے
آں مرثیہ نگاری کیا کیا ہے ... لاریب میر انیس
صاحب ایک بڑے رزمی شاعر تھے ...
... اور رزمی شاعر ہونے کی حیثیت
سے ہمہ وہ یا اور کسی رزمی شاعر کے ساتھ آپ
کا موازنہ نامناسب نہیں سمجھا جا سکتا ہے
مگر میر صاحب کا موازنہ میرزا صاحب کے
ساتھ جب کہ دونوں شاعری کے جداگانہ
پہلوؤں کو برتتے ہیں کوئی معقول شکل نہیں
رکھتا ہے۔ رزمی شاعر کا موازنہ رزمی شاعر
کے ساتھ اور مذہبی شاعر کا موازنہ مذہبی
شاعر کے ساتھ لطف سے خالی نہیں ہو سکتا۔
مگر بے جوڑ موازنہ سے نہ کوئی معقول نتیجہ
مرتب ہو سکتا ہے اور نہ اہلِ مذاق کو ایسے
موازنہ سے کوئی حظ کی صورت پیدا ہو سکتی" [۱]

---

[۱] کاشف الحقائق حصہ دوم المعروف: بہارستانِ سخن ص ۳۴۳

صاحب کاشف الحقائق کے مندرجۂ بالا بیان کے بعد یہیں یہ امر بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ ابھی تک انیسؔ و دبیرؔ پر کوئی ایسا کارنامہ سامنے نہیں آسکا ہے جسے مستقل تصنیف کا درجہ دیا جا سکے اور جس کی مدد سے اُن کی شخصیت اور فن کو پرکھا جا سکے۔ سوانحی خاکے اور جانبدارانہ طور پر مضامین بڑی شد و مد کے ساتھ لکھے گئے ہیں لیکن "انیسیت" اور "دبیریت" کی اصل روح کیا ہے؟ یہ نہ تو حیاتِ انیسؔ میں ہے اور نہ تو حیاتِ دبیرؔ میں نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کتب موضوع اور فن کے پیشِ نظر نہیں لکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ میر انیسؔ کو عقیدت کا خراج ایک مہم کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس میں کبھی کبھار تحقیقی مقالوں کے موضوعات بھی رہے ہیں لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس طرح کی کاوشوں سے فن کو نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ رہے دبیرؔ تو یہ یوں ہی نظر انداز کیے گئے ہیں۔ اس سے کوئی بھی انصاف پسند اور تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن دبیرؔ کو نظر انداز کرنے سے خود دبیرؔ کا کچھ نہیں بگڑا۔ اس سے تو نظر انداز کرنے والوں کا پست مذاق ظاہر ہوا۔ مجھے تو کلامِ دبیرؔ کا مطالعہ اس نتیجے پر پہنچاتا رہا ہے کہ اس کی فکر و فن خود ناقدینِ ادب کے لیے ممتحن ہے۔ ناظر کاکوروی "مطالعۂ انیسؔ" میں دبیرؔ کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:-

"..... مرزا دبیرؔ کو شاعری ورثہ میں نہیں ملی تھی، اُن کی مرثیہ گوئی اکتسابی کہی جا سکتی ہے۔ لیکن میں اسے خداداد سمجھتا ہوں۔ شاعر ہونے کے علاوہ علوم متداولہ میں بھی ماہر تھے اور عربی فارسی کے منتہی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں عالمانہ وزن اور وقار پایا جاتا ہے۔" [۱]

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دبیرؔ خالص مرثیہ گو شاعر ہے اس لئے "دبیریت" کا اصل مفہوم "مرثیت" میں پنہاں ہے اور یہی سبب ہے کہ مرثیہ گویوں کی طویل فہرست میں مرزا دبیرؔ کا نام ہی سر فہرست آتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انیسؔ نے بھی بین لکھے ہیں لیکن انیسؔ کا مرثیہ نگاری کا اصل تصور بین اور حزنیہ نہیں ہے۔ انیسؔ کی مرثیہ نگاری میں درد کی باتیں صرف اس لئے ہیں کہ مرثیہ اس پہلو سے خالی نہ رہ جائے۔

لفظ بھی چُست ہوں مضمون بھی عالی ہو جائے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہو جائے
(انیسؔ)

یعنی انیسؔ کے یہاں "مرثیت" کا تصور برائے بیت ہے جب کہ دبیرؔ مرثیہ کو اصل مفہوم میں پیش کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھئے کہ "بین" انیسؔ کے یہاں مرثیہ کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہے یعنی مرثیہ کا جزو ہے۔ اس کے قطع نظر دبیرؔ کے یہاں بین مرثیہ کے عناصرِ ترکیبی میں شامل ہے یعنی بین ہی اصل اور عین مرثیہ نگاری ہے۔ اسی لئے بعض اوقات کچھ ایسی روایات بھی دبیرؔ نے نظم کر دی ہیں جن کے متعلق تامل ہے مگر ان روایات کا نظم ہو جانا کچھ ایسا غلط نہیں ہے کیونکہ شاعر مورخ نہیں ہوتا ہے۔ دوسرے روایات چاہے ضعیف ہوں یا قوی سب کی سب دامنِ تاریخ میں نظر آتی ہیں۔ پہلے مورخین کا اجماع روایات کی سند کے لئے کوئی معیار مقرر کرے۔ اس کے بعد اس معیار کی روشنی میں کوئی نتیجہ برآمد کیا جا سکتا ہے۔ یاد رہے کہ حدیث سرورِ کائناتؐ کے متعلق قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ جتنی بھی احادیث حضورِ سرورِ کائنات سے منسوب کی جاتی ہیں وہ سب کی سب مستند ہیں۔ اسی لئے احادیث کی صحت کے لئے یہ معیار خود سرورِ کائنات نے مقرر کر دیا

۱۔ مطالعۂ انیسؔ۔ ناظر کاکوروی

یا حدیث و قرآن سے مطابقت نہ رکھتی ہوں انھیں رد کیا جا سکتا ہے۔ الغرض کمال اگر دبیر نے غیر ثقہ روایات مرثیوں میں نظم کر دی ہیں تو اول ان کا وجود کتب تاریخ و سیر میں پایا جاتا ہے اور اگر اجماع مورخین نہیں ہے یا اس کی صحت مشکوک ہے تو ان روایات کی روشنی میں کلام دبیر کو قرآن و حدیث کا درجہ کیوں دیا جائے؟

اصل گفتگو یہ ہے کہ کیا دبیر نے جن جذبات کی جس انداز میں عکاسی کی ہے وہ انسانی زندگیوں سے دور ہیں؟ کیا اُن میں فطری پن نہیں؟ کیا غم و رنج کی فراوانی میں عام طور ان کوائف اور احوال کو ہم اپنے گرد و پیش نہیں دیکھتے ہیں؟ ظاہر ہے ان سوالات کی تردید ممکن تر نہیں ہے۔ اگر پھر اسے تسلیم کرتے ہیں کیوں نہیں کہا جاتا ہے کہ دبیر ان روایات کو نظم کرنے میں انسانی زندگی کے تصورات سے کنارہ کش نہیں ہوئے ہیں۔ یا درست ہے کہ دبیر نے عرب کے کرداروں کو اپنی نظر سے خود تو دیکھا نہیں تھا۔ تاریخ کے مطالعہ، روایات کے علم، احادیث کی معرفت نے ان کرداروں تک دبیر کی رسائی کی تھی۔ دبیر نے ان کی حرکات و سکنات، طور و طریقہ، صورت و سیرت، سب سے پہلے اپنے اوپر طاری کی ہوگی پھر اُسے اپنے محسوسات سے کام لے کر مرثیہ میں پیش کیا ہے۔ واقعہ کربلا کے مختلف کردار ان کی شجاعت، سخاوت، صبر و استقلال، بہادری اور دلیری، حرب و ضرب، بندگی و عبادت، رنج و غم، مسرت و انبساط وغیرہ مافوق الفطری نہیں بلکہ عین فطری ہیں۔ یہ تو "دبیریت" ہے جس نے جذبات و کیفیات انسانی کے تمام تر محسوسات اور ان کی دھڑکنوں کو اپنے مرثیہ میں محفوظ کر دیا ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ شدتِ جذبات کو منطق اور ریاضی کے اصولوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔

موروثی، کسبی اور وہبی شاعری کی مروجہ اصطلاحات بھی بہت کچھ گمراہی کا سبب رہی ہیں۔ میں ماحول کے اثرات کا منکر نہیں لیکن یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ جسے خاندانی طور پر شعر و ادب کا ماحول نہ ملے وہ کبھی بڑا اچھا اور کامیاب شاعر ہوگا۔ یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ بڑا اور عظیم شاعر وہی ہوگا جس کے باپ دادا بھی شاعر رہے ہوں۔ میرے خیال میں اسے کلیہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ صرف اردو ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے ادب کی تاریخ کی ورق گردانی کر کے مجھے کوئی بتا دے کہ یہ کلیہ ہے ——— میں سب سے بڑا کمال یہ سمجھتا ہوں کہ شاعر اپنی شخصیت میں علمیت و ادبیت پیدا کر کے اپنی انفرادیت کی چھاپ لگا دے۔ یہ بھی دبیر کا کمال ہے جس میں اسلاف کی عظمتوں کا طفیل نہیں۔ اب رہا مسئلہ انیس اور دبیر کی صلاحیت کا تو یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اگر کچھ چیزیں قدرت نے ودیعت کر دیں، وہاب نے بخش دیں تو اس میں شخصیت کے کمالات کی کیا بات ہے؟ قدرت نے عقل، احساس، شعور اور جذبہ عنایت کر دیا۔ اب جتنی زیادہ قوت کسب ہوگی اتنی ہی زیادہ اُس کے علم و فن اور شعر و ادب کو تقویت حاصل ہوگی۔ شاعری کا تعلق براہ راست شاعر کے جذبات، احساسات اور فکر و فن سے ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے الہام کہہ کر کوئی حاصل کرنے کے ہم لوگ عادی ہو چکے ہیں۔ دبیر موروثی شاعر نہ سہی، دبیر وہبی شاعر نہ سہی، لیکن وہ کسبی شاعر تو ہے۔ وہ اپنی دنیا کا خود معمار ہے ——— اس سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے ——— اور اسی انفرادیت نے کئی "دبیریت" کو جنم دیا ہوں۔

موازنہ انیس و دبیر میں شبلی نے تعصب کا تیز انداز اختیار کیا ہے۔ تمہید کی ابتدا کی سطروں میں لکھتے ہیں:

"بد مذاقی کی نوبت یہاں تک پہنچی
کہ وہ انیس اور مرزا دبیر حریف مقابل

قرار دیئے گئے اور مدت ہائے دراز کی
غور و فکر، کدوکاوش، بحث و تکرار کے
بعد بھی فیصلہ نہ ہو سکا کہ ترجیح کا مستحق
کس کو کیا جائے۔" [1]

اس کے بعد ہی شبلی دوسرے پیراگراف کی آخری سطروں میں لکھتے ہیں:۔

"اس کتاب میں میر انیس کا موازنہ بھی
مرزا دبیر سے کیا گیا ہے اور اس مناسبت
سے اس کا نام موازنہ ہے" [2]

شبلی کے متضاد بیانات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ خود انیس کو دبیر کا ہم پایہ سمجھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ زبان سے تسلیم کرنے میں تاویل سے کام لیتے ہیں۔ دونوں شعراء کے انداز فکر مختلف ہیں۔ اسی لئے مختلف طبیعتوں کے افراد اپنے طور پر اظہار پسندیدگی کرتے ہیں۔ اسے بد مذاقی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ میں صاحب "المیزان" کے مندرجہ ذیل خیال سے اتفاق کرتا ہوں:۔

"یہ دونوں بزرگ اردو شاعری میں
بے مثل و لاجواب تھے اور ایک کو دوسرے
پر ترجیح دینا محض ایک قسم کا تعصب
ہے نہ واقعیت اور حقیقت۔ اس بارے
میں جناب مفتی میر محمد عباس صاحب قبلہ و کعبہ
کا قابل قبول فیصلہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کا
کلام نمکین و ملیح اور میر صاحب کا کلام
فصیح و شیریں ہے۔ دونوں کا ذائقہ علحدہ
علاحدہ ہونے کی وجہ سے ایک کو دوسرے
پر ترجیح نہیں دی جا سکتی کیونکہ بعض
طبیعتیں نمک کو پسند کرتی ہیں اور بعض طبائع
شیرینی پر مائل ہیں۔" [3]

جیسا کہ گزشتہ سطروں میں عرض کر چکا ہوں کہ موروثی شاعری یا موروثی فن کہہ کر افضلیت اور فوقیت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا ہے۔ شبلی نے موازنہ کے اوراق میں میر انیس کے خصوصیات کلام کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے:۔

"میر صاحب نے شاعری میراث میں
پائی تھی، اُن کے مرثیے کے جو خاص جوہر
ہیں وہ میراث ہی کی یادگار ہیں" [4]

مندرجہ بالا جملے کا تجزیہ یوں کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) میر صاحب نے شاعری میراث میں پائی تھی۔

(۲) اُن کے مرثیے کے خاص جوہر میراث ہی کی یادگار ہیں یعنی انیس کا اپنا کوئی خاص جوہر نہیں کیونکہ خاص جوہر میراث ہی کی یادگار ہیں۔ اس میں "ہی" نے تو عجیب و غریب تدغن لگا دی ہے۔ اس کے پیش نظر نتیجہ خیز گفتگو کر چکا ہوں۔

... ...

میرا اپنا خیال اور نظریہ ہے کہ موروثی اور وہبی شاعری کی اصطلاحات غم غلط کرنے کے لئے استعمال ہوتی رہتی ہیں اس لئے ترجیح کا مسئلہ بڑا ہی گھناؤنا ہے۔ یادگار غالب میں غالب کی رائے جو حالی نے نقل کی ہے اُس سے لے کر

---

[1] موازنۂ انیس و دبیر ـــــ شبلی نعمانی مرتبہ رشید حسن خاں ص ۱۱

[2] " " " " " ص ۱۱

[3] المیزان ـــــ مؤلفہ چودھری سید نظیر الحسن فوق رضوی۔ ص ۱۰۔
مطبوعہ مطبع فیض عام۔ علی گڑھ

[4] آب حیات ـــ از مولوی شمس العلماء محمد حسین آزاد ص ۵۷

[...] مصنف مراثی انیس اور دبیر کو برابر کا حریف سمجھتے ہیں — آزاد کا بیان بہت واضح ہے [...] نے انیس اور دبیر کے ذیل میں دیا ہے:۔

"... اور منصفی بیچ میں آکر کبھی تو یہ کہ
دونوں اچھے، دونوں اچھے۔ کبھی کہتے وہ
آفتاب ہیں یہ ماہ۔ کبھی کہتے یہ آفتاب وہ
ماہ۔" [1]

آزاد کا یہ انداز تحریر اس بات کا ثبوت ہے کہ نہ تو اُن میں ایک دوسرے کے مدمقابل ہے اور نہ حریف ہے بلکہ دونوں کا انداز فن کا نظریہ مختلف ہے اس لئے ترجیح کا مسئلہ حل نہ کرنا اور منصفی کا مرحلہ طے نہ کرنا بدمذاقی نہیں ہے بلکہ کوئی قضیہ ہی نہیں ہے۔ دونوں کا رنگ طرز اور انداز جدا ہے۔ ہاں مسئلہ ترجیح کا پیدا کر دینا البتہ ثبوت بدمذاقی ہے۔

قریب المعنی بند کو بنیاد بنا کر شبلی نے تحریر کیا ہے کہ۔۔۔

"میر انیس کی شاعری کے متعلق یہ مسئلہ نہایت مہتم بالشان مسئلہ ہے کہ مرزا دبیر کی رقابت اور مقابلے نے اُن کے کلام پر کیا اثر پیدا کیے۔ اگر یہ پتا لگ سکتا کہ دونوں حریفوں میں سے اول کس نے میدان شاعری میں قدم رکھا اور خاص خاص مرثیے بلکہ خاص خاص بند جو دونوں کے ہاں قریب المعنی پائے جاتے ہیں، اول کس نے کہے؟ تو شاعری کی تاریخ کے بہت سے دقیق نکتے حل ہو جاتے۔ لیکن افسوس ہے کہ باوجود بہت سی جد و جہد کے اس بارے میں مجھ کو کچھ کامیابی نہیں ہوئی۔۔ دونوں حریفوں کے مرثیوں کو دیکھو تو صاف نظر آتا ہے کہ ایک نے دوسرے کے کلام کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔ لیکن زمانے کی تقدیم و تاخیر کے نہ معلوم ہونے سے یہ نہیں یقین ہوتا کہ ایجاد کا فخر کس کو ہے اور کس نے کس سے اثر لیا ہے۔ میر انیس جا بجا فخریہ شعروں میں اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ اُن کے حریف، اُن کے کلام سے توارد اُڑاتے ہیں۔ ۔۔۔ [illegible] لیکن چونکہ مرزا دبیر صاحب بار کا جواب نہیں دیتے یعنی یہ نہیں کہتے کہ میں نہیں، میرا حریف سرقہ کرتا ہے۔۔ [illegible] اس لیے [illegible] جب دونوں مرثیوں میں ثابت ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مقابلے پر لکھے گئے ہیں تو خواہ مخواہ ماننا پڑتا ہے کہ مزاحمت اور ہم سری و مسابقت کی کوشش، میرزا صاحب ہی کی طرف سے ہوتی تھی۔" [2]

مندرجہ بالا نکات کے متعلق میں "صاحب المیزان" سے متفق ہوں کہ مسئلہ حل کرنا جس قدر دشوار ہے اُسی قدر غیر ضروری بھی ہے۔ دونوں صاحبوں کے محاسن کلام سے بحث کرنا اصلی مقصود ہے خواہ کسی نے پہلے شاعری شروع کی ہو۔

---

[1] آب حیات از مولوی شمس العلما محمد حسین آزاد۔ ص ۵۷
[2] موازنہ انیس و دبیر ——— شبلی نعمانی
مرتبہ رشید حسن خاں ص ۳۱، ۳۲
[3] المیزان ——— چودھری سید محمد نقی ص ۲۳

اس سے بحث کرنا اور اس مسئلہ میں اُلجھنا قطعی غیر ضروری ہے لیکن تقدیم و تاخیر کا مسئلہ اس عہد کی مشہور اور ترجمان تصنیف "فسانۂ عجائب" از رجب علی بیگ سرور سے کسی حد تک ضرور سلجھ جاتا ہے۔ سرور نے ایک مقام پر مرثیہ گو شعرا کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"مرثیہ گو بے نظیر، میاں دلگیر، صاف باطن نیک ضمیر، خلیق، فصیح، مرزا مسکین، مکرز ابت زمانہ سے بھی افسردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے ناظم خوب دبیر مرغوب سکندر طالع بصورت گدا۔ بارِ احسان، اہلِ دول کا نہ اُٹھایا۔ عرصۂ قلیل میں مرثیہ سلام کا دیوان کثیر فرمایا۔"[۱۸]

رجب علی بیگ سرور کی مندرجہ بالا عبارت سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ دیگر کاملین فن کے ساتھ ساتھ مرثیہ گو شعرا کا بھی ذکر ہے لیکن انیس کا نام نہیں ہے۔ اس سے کسی حد تک ضرور تقدیم و تاخیر کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے یعنی فسانۂ عجائب کی تصنیف کے وقت (در عہد نصیر الدین حیدر) دبیر کا شمار پختہ گو شعرا میں ہونے لگا تھا اور دلگیر کے ساتھ اُن کا ذکر بھی شامل ہے۔ اُس وقت تک انیس کی شاعری ابتدائی دور میں رہی ہوگی جس میں کوئی وزن و وقار نہیں پیدا ہو سکا ہوگا۔ بہر کیف یہ نتیجہ تو آسانی سے برآمد کیا جا سکتا ہے کہ اُس وقت تک انیس نے یا تو مرثیہ گوئی شروع نہیں کی تھی یا اُن کا کلام اس قابل نہیں ہو سکا تھا کہ دیگر کاملین فن کے تذکرہ مرثیہ گوئی کے ساتھ شمار کیا جائے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مرزا دبیر نے پہلے مرثیہ گوئی شروع کی تھی۔ اس اعتبار سے قریب المعنی مراثی کا قضیہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کسی استدلال کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ہے لیکن اس قضیے کے فیصلے کے لیے یارانِ طریقت نے بڑی اُلٹ پھیر سے کام لیا ہے جن سے ان کی استدلالی کاوشیں مسخرہ پن کی ایک مثال بن جاتی ہیں۔

— استدلال یہ کیا جاتا رہا ہے کہ انیس جا بجا اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ اُن کے حریف اُن کے مرثیوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ مثلاً:۔

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے گلشن کے خوشہ چینوں کو
— انیس

یا

شکر خدا کہ سرقہ کی عادت سے بعید ہوں
ہر مرثیے میں موجد طرزِ جدید ہوں
— انیس

یا

ملتی نہیں دُزدانِ معانی سے نجات
سچ ہے کہ مگس سے کب شکر بچتی ہے
— انیس

ایسے یا اسی طرح کے اور دوسرے اشعار کے پیش نظر صاحب "موازنہ" نے استدلال کیا ہے کہ اس طرح کی چوٹوں کو سُن کر مرزا دبیر صاحب برابر کا جواب نہیں دیتے یعنی یہ نہیں کہتے کہ میں نہیں، میرا حریف سرقہ کرتا ہے[۱۹]

شبلی نعمانی نے بساطِ قیاس پر ظن ایسی شاخِ نازک پر بچھائی ہے جس میں کوئی دم نہیں۔ اسی کے ساتھ موازنہ کرنے والے کا یک طرفہ رُخ بھی سامنے آجاتا ہے۔ جب وہ دبیر کے صرف وہ شعر نقل کرتا ہے اور ایسے شعر جس میں طنطنہ نہیں بلکہ ابہام و تفہیم کے پیش نظر اپنا دناع پیش کرتا ہے لیکن اسی کے ساتھ دبیر نے بھی انیس ہی کی طرح

---

[۱۸] فسانۂ عجائب دیباچہ رجب علی بیگ سرور مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز ص ۱۱ے
[۱۹] موازنہ انیس و دبیر — شبلی نعمانی

[illegible] قدامت رکھتے ہوں گے لیکن
[illegible] ان اشعار کو دانستہ نظر انداز کیا
ہے۔ اس سے متعلق چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رباعی

ہے سنت کو حجت پہ کلام اپنا ہے
لاریب خطا پوش امام اپنا ہے
جو بند کے بند قطع کر لیتے ہیں
ان مرثیہ گویوں کو سلام اپنا ہے

دبیر

یا

سرقہ مضموں کا زبوں ہوتا ہے
یعنی علم نظم نگوں ہوتا ہے
پر اُن میں جو مندرج ہے حال شہدا
اس سے برے مرثیوں کا خوں ہوتا ہے

دبیر

یا

شیران مضامیں کو نہاں بند کروں
گونجیں گے ڈکاریں گے جہاں بند کروں
خلاقیِ مضموں کا ہے دعویٰ سب کو
کھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں

دبیر

یا

جو مصرع موزوں مرا مشہور جہاں ہے
البتہ توارد ہو تو حیرت کا مکاں ہے

دبیر

شاگرد دبیر کل نبی کا ہے یہ تاکید
تازہ ہے ثنا کی کتنی اور تازہ ہے تمہید
[illegible] مضامیں پہ نہ کر منع کی تاکید
تو مجتہد نظم ہے فرض اُن پہ ہے تقلید

یہ اور اسی طرح کے بہت سے اشعار کلام دبیر کیا ملتے ہیں جن سے یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مرزا دبیر نے نہ صرف جواب دیئے ہیں بلکہ انیس ہی کی طرح کے انداز بھی اپنائے ہیں۔

...

دبیر اور انیس کے متحد المضامین مراثی کے عنوان کے تحت موازنہ نگاروں نے بڑے بڑے بکھیڑے پھیلے ہیں لیکن وہ یہ بھول گئے کہ موضوع کا اتحاد ہوتے ہوئے بھی مضامین شعر گوئی مختلف ہو سکتے ہیں۔ چونکہ میں دبیر اور انیس کے موازنہ کا قائل نہیں ہوں اس لئے مضامین کے اتحاد کے تحت بحث کرنا نہیں چاہتا ـــــ پھر بھی یہ کہتا چلوں کہ صنف سخن کے اعتبار سے مرثیہ ایک موضوع ہے تو کیا اس موضوع پر طبع آزمائی کرنے والے سبھی شعرا ایک ہی رجحانات کے حامل ہیں مثال کے طور پر سودا اور میر دونوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں تو کیا ان دونوں کی غزل گوئی بہ اعتبار صنف سخن ایک ہی موضوع اور مضامین کی تابع ہے؟ غالب اور ذوق ہم عصر ہیں۔ دونوں نے صنف سخن کے لحاظ سے غزلیں بھی لکھی ہیں تو کیا غالب اور ذوق ایک ہی مضمون کے شاعر ہیں؟ دور نہ جائیے ناسخ اور آتش کو ہی لے لیجئے زبان کی حک و اصلاح، کثرت [illegible]، تہذیبی، سماجی، معاشرتی، تاریخی اور فکری پس منظر کی روشنی میں ناسخ و آتش کو جدا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں تو کیا ناسخ اور آتش کا موضوعات اور مضمون غزل گوئی ایک ہی ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے؟ تو پھر [illegible] المضامین کی تلاش اور دفتر کے دفتر سیاہ کرنا کیا فعل عبث نہیں ہے؟

دبیر اور انیس ایک حد تک شعری اتحاد رکھتے ہیں اور نفس واقعہ کے اعتبار سے دونوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام اور اہلبیت اطہار کی مدح و ثنا اور مصائب شہدائے

نظم کیے ہیں لیکن نفسِ واقعہ کا اتحاد، نفسِ مضمون کے اتحاد کا سبب نہیں بن سکتا۔ ایک ہی واقعہ مضامین کے مختلف موضوعات پیدا کرتا ہے۔ واقعہ کی یکسانیت مضامین کی یکسانیت کا سبب نہیں بن سکتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انیس نے رزمیہ مضمون منتخب کیا اور دبیر نے مرثیت کا۔ برمحل استعمال، اصل روح مرثیہ نگاری کے پیشِ نظر کر کے صحیح معنوں میں مرثیہ گوئی کی مثال قائم کر دی۔ میرے لئے بڑی آسانی ہو جاتی اگر میں مراثی کا انتخاب بھی چاہے جاتا اور اس طرح سے مضمون طویل بھی ہو جاتا لیکن میں اس انداز مقابلہ نگاری سے قصداً انحراف کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو میں مراثی کے مناظرے کے حق میں نہیں، دوسرے یہ کہ انیس اور دبیر کے متحد المضامین اور قریب المعنی مراثی کے پیشِ نظر کافی تگ و دو کی جا چکی ہے۔ میں اربابِ فکر و نظر کو مراثیِ دبیر کے مطالعہ کی بلاواسطہ دعوت دینا چاہتا ہوں۔

اہلِ علم بخوبی جانتے ہیں کہ المیہ (Elegy) اور رزمیہ (Epic) دو علاحدہ مضمون ہیں۔ دبیر نے موضوعِ سخن اور نقلِ واقعہ کو المیہ قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی "دبستانِ دبیر" میں تحریر کرتے ہیں:-

"شعر و ادب کا ذوق رکھنے والے اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ٹریجڈی (المیہ) اصنافِ سخن میں سب سے مشکل صنف ہوتی ہے اور انتہائی ترقی یافتہ زبانوں میں المیہ شاعری بہت کم ملتی ہے۔ مرزا صاحب کا کمالِ شعری اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے تقریباً ایک ہزار مرثیے یعنی المیہ شہ پارے پیش کئے ان کا ہر مرثیہ ایسا ہے کہ سننے والے کو اشک افشانی پر مجبور کر دیتا ہے، ان کے کمالِ فن اور قدرتِ بیان کا یہ ایک زبردست ثبوت ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انھوں نے محض ایک ہی واقعہ (واقعۂ کربلا) کو بار بار نظم کیا ہے اور ہر مرتبہ ندرتِ بیان کے سہارے اس میں تازگی پیدا کر دیا ہے تو ہمیں ان کی قوتِ تخیل اور قدرتِ بیان کے سامنے سرِ خم کر دینا پڑتا ہے۔"[1]

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کے مندرجہ بالا بیان سے میں اس حد تک ضرور متفق ہوں کہ مرزا دبیر المیہ شاعر کا نام ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ کہ "انتہائی ترقی یافتہ زبانوں میں "المیہ" شاعری بہت کم ملتی ہے"۔ اس سے مجھے اتفاق نہیں۔ زبان و ادب، معاشرہ، تہذیب چاہے جتنی بھی ترقی کر لے "طربیہ" اور "المیہ" سے اپنا منہ موڑ نہیں سکتی۔ انسانی فطرت اور انسانی نفسیات کے تقاضوں کو نہیں بدلا جا سکتا ہے۔ خوشی اور رنج انسانی فطرت کا ہی نتیجہ ہیں۔ جس میں ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ کی کوئی قید نہیں۔ معلوم نہیں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے کیسے یہ نتیجہ برآمد کر لیا کہ انتہائی ترقی یافتہ زبانوں میں المیہ شاعری بہت کم ملتی ہے۔ جب کہ یہ متفقہ فیصلہ ہے ارسطو نے اپنی تصنیف "بوطیقا" میں بھی تسلیم کیا ہے کہ "المیہ شاعری" اور "رزمیہ شاعری" سے افضل ہے۔ ملاحظہ ہو:-

"ان تمام باتوں میں ٹریجڈی (المیہ) رزمیہ (Epic) شاعری سے افضل ہے اور اگر

---

[1] دبستانِ دبیر ۔۔۔۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی ص ۱۵۸، ۱۵۷
اشاعت مئی ۱۹۶۶ء

... حیثیت الفن زیادہ
... ہے ... تو اس سے
یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رزمیہ کی بہ نسبت المیہ افضل
اور بہتر ہے۔ وہ اپنے مقصد کی بہتر طریقے
پر تکمیل کرتی ہے۔" [۱]

دبیر میں المیہ پہلو اُن کی مرثیہ نگاری کے فن کی ہر منزل میں نظر آتے ہیں۔ خواہ وہ میدان کارزار ہو یا ذوالفقار کی برش، چاہے ذوالجناح کی سُرعت رفتار ہو یا شجاعت کی رفعتیں، یا صبر و استقلال کی منزل ہو یا اسیرانیوں کی اشک فشانی، رُخصت ہو یا رزم مجموعی طور پر دبیر "مرثیت" کو اپنی مرثیہ نگاری کی دسترس سے باہر نہیں جانے دیتے ہیں۔ میرے نقطۂ نظر سے دراصل یہی "دبیریت" ہے جس سے خاک و خون میں نہائے ہوئے مناظر سنگدلوں کو بھی رُلا دیتے ہیں۔ میں نے اپنی ذاکری کی ابتدائی منزل میں دبیر اور انیس کے مراثی، سلام اور رباعیاں پڑھی ہیں لیکن جو تاثر دبیر کے مراثی اہل مجلس پر قائم کرتے تھے اور آل مجلس کا سبب بنتے رہے وہ انیس کے نہیں۔ ہاں! زبان کی لطافت، منظر کشی کی پھبن، رزمیہ عناصر، معرکہ جنگ و جدل کی شدت مراثی انیس کی رُوح ہیں لیکن باعتبار موضوع "مرثیہ" کا کمال گریہ و بکا ہے اور اس بنیادی خصوصیت کا دلدادہ دبیر ہے۔ دبیر کی مندرجہ ذیل رباعیاں ملاحظہ ہوں ؎

جو مجلس ماتم میں یہاں روتا ہے
ہر قطرۂ گریہ داغِ عصیاں دھوتا ہے

ثابت ہے حدیثوں سے کہ یہ قطرۂ اشک
ہر زخم حسینؑ کی دوا ہوتا ہے

ہر چند ہزار سال آدم روئے
یعقوب بھی فرزند کو پیہم روئے

جس دم کیا حاسبان قدرت نے حساب
سجادؑ کے رونے سے بہت کم روئے

یا

اس بزم کو دعویٰ ہے کہ جنت میں ہوں
آنسو ہیں رواں کہ بحر رحمت میں ہوں

کہتا ہے یہ دل سے وہ ہم داغ حسینؑ
گنجینۂ مغفرت کی قیمت میں ہوں

مندرجہ بالا رباعیات کی روشنی میں دبیر کی مرثیہ گوئی کا موضوع سخن اور مضمون نگاری آسانی سے سمجھی اور سمجھائی جا سکتی ہے کیونکہ ان میں دبیر نے خود اپنی مرثیہ نگاری کا ماحصل پیش کر دیا ہے جس میں "دبیریت" کا منفرد پہلو نمایاں ہو جاتا ہے اور گزشتہ ادوار کے ناقدین کی سہل انگاری بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ پٹی پٹائی ڈگر کے سالک سہل پسندی کو راہ نما بنا کر ایک ہی بات کو مختلف انداز سے دہراتے رہے ہیں جس سے مسائل سلجھنے کے بجائے اُلجھتے رہے ہیں یا یوں کہہ دیا جائے کہ غلط روایت کی سند مختلف زمانوں میں جمہوری نظام کے تحت پیش کرتے رہے ہیں جس میں صداقت نام کو نہیں۔ "دبیریت" اور "انیسیت" کی انہام و تفہیم منفرد سر کے آسانی سے ممکن نہیں جس کے لئے ہمارے تمام نہاد ناقدین اور محققین تیار نہیں۔

انیس صدی تقریبات کے سلسلے تب بھی کوئی ایسی تصنیف یا تالیف منظر عام پر نہ آسکی جسے اس صدی کا پیش بہا تحفہ قرار دیا جائے۔ اس طرح دبیر کے متعلق بھی کام کی رفتار سست رہی ہے۔ ایسے کام کی سخت ضرورت ہے جس میں انیس اور دبیر کی شخصیت اور فن کو مسلم الثبوت بنا کر پیش

---

[۱] بوطیقا۔ ارسطو ص ۱۰۰-۱۰۱ مترجمہ عزیز احمد ۱۹۶۱ء

ہم نہ کیا جائے جو روایتی موازنہ اور مناظرہ سے بلند و بالا ہو، بہ صورت فکر و فن کی تلاش کا کامیاب نمونہ ہو۔

کاظم علی خاں

دبیر کی مرثیہ نگاری
محرکات و مؤثرات

ادب اگر خلا کی پیداوار نہیں بلکہ عصری ماحول کا زائیدہ و پروردہ ہوتا ہے اور ادیب و شاعر کی شخصیت کا مظہر ہوتا ہے تو مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری کا جائزہ لیتے وقت ہمیں ان اہم خارجی اور داخلی اثرات کا تجزیہ کرنا پڑے گا جو مرزا صاحب کی مرثیہ گوئی کے لیے محرکات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مرزا سلامت علی دبیر (متولد دہلی ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء) اپنے والد مرزا غلام حسین کے ہمراہ جب تقریباً سات برس کے سن (۱۸۱۰ء) میں لکھنؤ آئے تو یہاں ان کے متعدد پیش رو اور معاصر مرثیے کی توسیع و ترقی کے لیے راہ کو ہموار کر رہے تھے۔ مرزا صاحب مشہور مرثیہ نگار میر مظفر حسین ضمیر (متوفی ۱۸۵۵ء) کے شاگرد ہوئے۔ میر ضمیر اردو مرثیہ کی تاریخ میں دور ضمیر کے صف اول کے مرثیہ نگار تھے۔ ضمیر جیسے ماہر استاد کو دبیر جیسا باصلاحیت شاگرد مل جانا سونے پر سہاگا ثابت ہوا۔

استاد کی تربیت کے علاوہ دبیر کی مرثیہ نگاری میں معتبر علماء و اہل قلم کا فیض بھی شامل نظر آتا ہے۔ مجتہد العصر والزمان سلطان العلماء سید محمد صاحب اور سید العلماء سید حسین صاحب سے دبیر کے گہرے روابط رہے ہیں۔ ان دونوں مذہبی ہستیوں کی مدح دبیر نے اپنے اس مرثیے میں بھی کی ہے جس کا مطلع ہے ؎

"طغرا نویس کن فیکون ذوالجلال ہے"[له]

مولانا مفتی سید محمد عباس صاحب مرحوم عہد دبیر کے صف اول کے عالم دین تھے اور ان سے مرزا دبیر کے گہرے تعلقات کے ثبوت مولانا مفتی صاحب کے سوانح حیات تجلیات میں دیکھے جا سکتے ہیں[ثه]۔ ان کے علاوہ دبیر نے اپنے زمانے کی جن جلیل ہستیوں سے فیض تعلیم حاصل کیا تھا ان میں مولانا مرزا کاظم علی صاحب، ملا مہدی صاحب مجتہد مازندرانی وغیرہ جیسے پابند شرع علمائے دین بھی شامل تھے۔ ان تمام مذہبی حضرات کے فیض صحبت نے بھی دبیر کو مرثیہ جیسی مذہبی صنف کی جانب متوجہ کیا ہوگا۔

مرزا دبیر کے صحیفۂ حیات کی ورق گردانی کرنے پر ہم اس نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں کہ مرزا صاحب ایک محتاط، با اصول و پابند شرع انسان تھے۔ مذہب مرزا دبیر کے صحیفۂ حیات کا ایک اہم باب ہی نہیں بلکہ اس کتاب کے ہر ورق پر مذہب کی گہری چھاپ ملتی ہے۔ سیرت و شخصیت، افعال و اقوال، عقائد و نظریات، افکار و خیالات، عادات و اطوار، گفتار و کردار غرض کہ جس اعتبار سے دیکھا جائے، مرزا دبیر کی حیات و سیرت کا ہر پہلو مذہب سے گہری وابستگی رکھتا ہے[سه]۔ زندگی کی

[illegible] تخلیقات پر بھی مذہب غالب نظر آتا ہے جیسا کہ ادب اور زندگی کے گہرے رشتے کی تفسیر و تصدیق کے مترادف ہے جس طرح زندگی کے میدان میں دبیر نے مذہب کے دائرے سے باہر نکلنا مناسب نہ سمجھا اسی طرح ادب کے میدان میں بھی وہ عام طور پر مذہب کے احاطے میں ہی رہے یا گویا سلام، نوحہ، رباعی، مخمس اور مرثیے کے علاوہ دبیر نے اپنی مثنویوں میں بھی مذہبی موضوعات سے سروکار رکھا ہے حتیٰ کہ یہاں تک کہ اردو نثر میں دبیر کی غیر معروف کتاب ابواب المصائب[51] بھی سورۂ یوسف کی تفسیر ہے جس کو جگہ جگہ رجال مصائب [illegible] سے کر ذاکری کی کتاب کی شکل دی گئی ہے۔

دبیر کی مرثیہ گوئی میں جن عوامل و محرکات کی کارفرمائی نظر آتی ہے ان میں ضمیر کی شاگردی اور علمائے دین کی صحبت کے ساتھ ساتھ مرثیے کے لئے لکھنؤ میں اس سازگار ماحول کی کارفرمائی بھی شامل رہی ہے جس کے زیر سایہ عہد دبیر تک تعزیہ داری کے لئے ایک زبردست مرکزی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ یہاں اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ شمالی ہندوستان کے مختلف حصوں میں تعزیہ داری لکھنؤ سے قبل رائج ہو چکی تھی[52] جیسا کہ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے

• چند تورانی خاندانوں کے سوا (مغل) دربار کے اکثر عمائد امراء (شیعہ) عقائد میں راسخ تھے۔ بہت سے مورخین مغل امیروں کو طبقۂ اثنا عشری [illegible] سے نیچے تک شمالی ہندوستان میں جتنی ریاستیں قائم ہوئیں ان میں اکثر شیعہ خاندانوں کی میراث تھیں۔ مشائخ، صوفیہ اور نقش بندیوں کے بجز سبھی خاندان سے حضرت علی ابن ابی طالب سے شجرہ ملاتے اور نقیب معرفت کا سرچشمہ اور فرقیت کا [illegible] تھے اور [illegible] بہت [illegible] قرار دیتے تھے۔ اہل بیت نبی [illegible] خاطر لئے جاتے تھے تبرا [illegible] کے علاوہ ہندوستانی [illegible] عام طور پر شیعوں کے ہم آہنگ [illegible] کی تعزیہ داری سنیوں کے ہاں کا بڑا پابند اور شدومد سے منائی جاتی تھی۔ [illegible] کو [illegible] تعزیہ [illegible] کی شکل [illegible] کا بھی [illegible] اور عام [illegible] رکھتے تھے[53]

لکھنؤ سے قبل شمالی ہند کے مختلف [illegible] تعزیہ داری کے رواج کے باوجود اس حقیقت کو بھی قبول کرنا پڑے گا [illegible] اودھ کے حکمرانوں کی سرپرستی میں تعزیہ داری نے [illegible] کی مثال [illegible] دبیر کی [illegible] بڑی حد تک لکھنؤ کی انہی عزاداری کی روایت [illegible] لہٰذا دبیر کی مرثیہ گوئی پر گفتگو کرتے وقت [illegible] تعزیہ داری کے فروغ کی کہانی پر بھی نظر رکھنا مناسب ہوگا۔

عام خیال یہ ہے کہ لکھنؤ میں عزاداری کا رواج اور امام باڑوں کی تعمیر کا آغاز اس وقت سے ہوا جب نواب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے فرزند نواب آصف الدولہ نے ۱۱۸۹ھ میں اودھ کے پایۂ تخت کو فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کیا لیکن سید کمال الدین کے مندرجہ ذیل بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عہد شجاع الدولہ میں ہی لکھنؤ میں امام باڑے [illegible] موجود تھے۔ کمال الدین حیدر لکھتے ہیں:

• آغا باقر خاں محمد آغا اسمعیل ولد [illegible] بیگ کے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد دولت میں رسالدار [illegible]

آغا اسمٰعیل کے کارندہ تھے ... آغا اسمٰعیل نے عمو سے کہا کہ تم قریب مسافر خانہ ایک امام باڑہ بنواؤ۔ اُس زمانے میں سوائے آغا ابوطالب خاں کے امام باڑے کے دوسرا امام باڑہ شہر (لکھنؤ) میں نہ تھا۔"[۸]

تاریخ ہند کے صفحات میں ہمیں ایک ایسا واقعہ بھی درج ملتا ہے جس سے عزاداری کے لیے نواب شجاع الدولہ کے شغف کا پتہ چلتا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ انوپ شہر کے مقام پر نواب شجاع الدولہ جب احمد شاہ ابدالی کے ہمراہ خیمہ زن تھے تو اگست ۱۷۶۰ء میں عشرۂ محرم کے دوران میں ایک روز نواب وزیر نے اپنے رفقاء کی مدد سے ایک جلوس عزا نکالا۔ اس جلوس میں نواب شجاع الدولہ بھی شامل تھے۔ جلوس کے شرکاء ننگے سر اور برہنہ پا تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں علم تھے۔ وہ سینوں پر پیٹتے اور ماتم کی صدائیں ... ان کے جسموں پر سیاہ ماتمی لباس تھے۔[۹]

شجاع الدولہ کی وفات کے بعد اُن کے فرزند نواب آصف الدولہ (۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۵ء تا ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء)[۱۰] نے اودھ کے پایۂ تخت کو ۱۱۸۹ھ / ۱۷۷۵ء میں جب فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کیا تو لکھنؤ میں عزاداری کو زبردست تقویت ملی۔ لکھنؤ میں عہد آصفی کے دوران میں تعزیہ داری کے اس زبردست فروغ میں مولانا دلدار علی صاحب (غفران مآب) (۱۱۶۶ھ - ۱۹ رجب ۱۲۳۵ھ)[۱۱] اور سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں، نائب آصف الدولہ کی کوششیں بھی شامل رہی ہیں۔ نواب حسن رضا خاں کے مکان پر ہی مولانا دلدار علی صاحب نے ۱۳ رجب ۱۲۰۰ھ (۱۲ مئی ۱۷۸۶ء) کو لکھنؤ میں شیعہ فرقے کی پہلی نماز ظہر با جماعت قائم کی اور اس کے دو ہفتے بعد مولانا دلدار علی صاحب نے ہی ۲۷ رجب ۱۲۰۰ھ (۲۶ مئی ۱۷۸۶ء) کو لکھنؤ میں شیعوں کی پہلی نماز جمعہ خود جماعت کی امامت کے فرائض سرانجام دیے۔[۱۲]

سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں نے عہد آصف الدولہ میں لکھنؤ کی مشہور درگاہ حضرت عباس کی بنا کی جو بعد میں مختلف موقعوں پر توسیع و تجدید کے مراحل سے گزرتی رہی۔ سرفراز الدولہ کی تجویز پر ۱۷۸۵ء میں لکھنؤ کے شاندار تاریخی حسینیۂ آصفی کی تعمیر کا آغاز ہوا جس کی تکمیل ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰-۹۱ء میں عمل میں آئی تھی۔[۱۳] ۱۲۱۰ھ / ۱۷۹۵ء میں مولانا دلدار علی صاحب نے اپنا وسیع عزا خانہ حسینیۂ غفران مآب تعمیر کرایا۔[۱۴] عہد آصفی میں درگاہ حضرت عباس، حسینیۂ آصفی اور غفران مآب کے امام باڑے نے ... لکھنؤ میں تعزیہ داری ... اور مجالس عزا کے رجحان کو کافی فروغ عطا کیا۔

فرمانروائے اودھ نواب سعادت علی خاں کے عہد (۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۸ء تا ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء) میں لکھنؤ کی مشہور تال کٹورے کی کربلا تعمیر ہوئی۔[۱۵] نواب سعادت علی خاں کے فرزند غازی الدین حیدر کے زمانۂ حکومت (۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء تا ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء)[۱۶] کے دوران [۱۲۳۲ھ / ۱۸۱۶-۱۷ء] میں حسینیہ شاہ نجف کی تاریخی عمارت بنی جو حضرت علیؑ کے روضہ کی شبیہ ہے۔[۱۷] غازی الدین حیدر کے مذہبی انہماک پر تواریخ دل پذیر میں مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔[۱۸]

غازی الدین حیدر کے زمانہ میں شرف الدولہ غلام رضا خاں نے لکھنؤ میں روضۂ کاظمین تعمیر کرایا۔[۱۹] غازی الدین حیدر کی خاص محل بادشاہ بیگم جس زبردست اہتمام و انتظام سے شاہانہ جلوس کے ساتھ درگاہ حضرت عباس جایا کرتی تھیں وہ لکھنؤ کے مذہبی رجحان کا مظہر ہے۔ بادشاہ بیگم کی ایسی ہی ایک سواری کا تفصیلی آنکھوں دیکھا حال ایک یورپی خاتون مسز حسن علی نے بیان کیا ہے۔[۲۰] غازی الدین حیدر کے وزیر معتمد الدولہ آغا میر نے بھی محلہ نبی لکھنؤ میں ایک کربلا اور ڈیوڑھی آغا میر میں ایک امام باڑہ تعمیر کرایا تھا۔[۲۱] اس امام باڑے کی عمارت میں ہی آج کل گورنمنٹ جوبلی انٹر کالج لکھنؤ قائم ہے۔

عہد نصیر الدین حیدر (۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء تا ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء) میں

[illegible] سیاح ولیم نائیٹن کا مندرجہ ذیل بیان نصیر الدین حیدر کے مذہبی شغف کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

"محرم آگیا اور کامل چالیس دن تک ہم لوگ دربار سے الگ تھلگ رہے۔ کبھی کبھار دربار صبح گاہی میں اتفاقاً بادشاہ (نصیر الدین حیدر) کی زیارت ہو جاتی تھی۔ عزاداری کی وجہ سے ناچ رنگ اور انگریزی دعوتیں یکقلم بند تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ بادشاہ نے اپنی تخت نشینی سے پیشتر منت مانی تھی کہ اگر مجھے تخت شاہی نصیب ہوگا تو میں بجائے عشرے کے اربعین (چہلم) تک عزاداری کیا کروں گا۔ چنانچہ وہ اس عہد پر سختی سے قائم ہیں۔" [24]

ولیم نائیٹن کی اس معاصر شہادت کے علی الرغم اسد کی نشان دہی کئے بغیر سفارش حسین رضوی کا یہ بیان نظر ثانی کا محتاج ہے کہ "لکھنؤ کے بادشاہ تخت کے لئے منتیں مانتے تھے۔ ایسی ہی ایک منت پوری کرنے کے لئے غازی الدین حیدر نے عزاداری کو ترقی دے کر چہلم تک بڑھایا۔" [25] اپنی منت کے تحت لکھنؤ میں عزاداری کا دورہ کے جب بادشاہ نے چہلم تک بڑھایا تھا وہ غازی الدین حیدر کے بجائے اُن کے فرزند نصیر الدین حیدر تھے جیسا کہ ولیم نائیٹن کے محولہ بیان سے ظاہر ہے۔ ولیم نائیٹن کے اس بیان کی تصدیق مرزا رجب علی بیگ سرور (متوفی محرم ۱۲۸۹ھ / اپریل ۱۸۷۲ء) [26] کے مندرجہ ذیل بیان سے ہو جاتی ہے جو نصیر الدین حیدر کے شغف عزاداری کے بارے میں معاصر شہادت کی حیثیت رکھتا ہے۔ نصیر الدین حیدر کے بارے میں سرور کا بیان ہے:۔

"...... اس عیش پسندی پر عشرۂ محرم میں یہ حال تھا کہ راہ چلتے کو مسکرانا محال تھا۔ روز و شب غم اہل بیت میں رونا اور بین تک زمین پر سونا، لباس آبی یا سیاہ، ہر دم نالہ و آہ۔ ہزارہا روپیا اور جہان کی نعمت مرثیہ خواں اور سید محتاج آب و نان پاتے تھے۔ تحصیل حسنات و ثواب فرماتے تھے۔

دوازدہ امام کی درگاہ، صاحب الامر کا نذر بنایا۔ لاکھوں روپے کا اسباب چڑھایا۔" [27]

نصیر الدین حیدر کے شغف عزاداری کے بارے میں میر ضمیر کی مندرجہ ذیل منظوم شہادت بھی ملاحظہ ہو:

محرم کے عشرے میں کیا زار زار
یہ روتا ہے مانند ابر بہار
غم آل احمد میں ہے دل حزیں
سیہ پوش رہتا ہے تا اربعین [28]

کربلائے نصیر الدین حیدر اس بادشاہ کی یادگار ہے جو آج بھی مولوی گنج لکھنؤ کے ریلوے اسٹیشن کے پاس موجود ہے۔ ابتدا اسی کربلا کی مٹی آراضی پر آج کل شیعہ کالج لکھنؤ بنا ہوا ہے۔ نصیر الدین حیدر کی ایک بیگم نواب ملکہ زمانیہ کا ذریعہ عالیشان عزاخانہ ۱۲۵۶ھ میں بنا تھا [illegible] اس امام باڑے کے نیچے کھنڈر آج بھی گولہ گنج روڈ لکھنؤ پر واقع ایک لانڈری کے عقب میں موجود ہیں۔ ملکہ زمانیہ کے اس عزاخانے میں دبیر سے مرثیے پڑھوائے جایا کرتے تھے۔ ملکہ زمانیہ کی بیٹی سلطان عالیہ تخلص سلطان کو فن شاعری کا ذوق تھا اور وہ مرزا دبیر کی عزیز شاگرد تھیں۔ [29] مقبرۂ سلطان عالیہ آج بھی لکھنؤ کے محلہ گولہ گنج میں مشہور و موجود ہے۔ نصیر الدین حیدر کی ایک اور بیگم ممتاز الدہر نے بھی محلہ ڈیوڑھی آغا میر لکھنؤ میں ایک امام باڑہ بنوایا تھا۔ [30]

نصیر الدین حیدر کے بعد عہد محمد علی شاہ [۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء تا ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء] کے دوران میں ۱۲۵۳ تا ۱۲۵۶ ۲۰ لاکھ روپے کے کثیر مصارف سے حسین آباد کا عظیم الشان تاریخی امام باڑہ تعمیر ہوا۔ [31] محمد علی شاہ نے حسین آباد کے امام باڑے میں عزاداری کا اہتمام

وہ ... تیار ہو گئے ۳۰ لاکھ روپے سے ایک ... بھی تمام کر دیا گیا۔ حسین آباد کے عزاخانے کی تعریف و توصیف میں اُس عہد کی جن شہیر ادبی ہستیوں نے منظوم و منثور عقیدت کے نذرانے پیش کیے ہیں، اُن میں ناسخ لکھنوی، دلگیر اور رجب علی بیگ سرور بھی شامل ہیں۔ ناسخ لکھنوی نے حسین آباد کے امام باڑے کی جو تاریخ کہی تھی وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے:-

جناب محمد علی بادشاہ — پسندیدۂ بارگاہ الٰہ
بساعت ذی شان آئینہ خانہ است — بنا از سما آئینہ خانہ است
خرد سال جائے عزائے حسین
بگفتا عزا بہر شہ مشرقین
(۱۲۵۳ ہجری) [۳۷]

حسین آباد کے عزاخانے کی توصیف میں مشہور مرثیہ نگار دلگیر کے بھی منثور و منظوم بیانات موجود ہیں۔[۳۸] حسین آباد کے امام باڑے میں منعقد ہونے والے مذہبی اجتماعات کے بارے میں میاں دلگیر (م ۱۲۶۴ھ)[۳۹] کا بیان جو آنکھوں دیکھے حال کا درجہ رکھتا ہے۔ دلگیر کی ایک مثنوی سے ذیل میں منقول ہے:-

غنی ہو گئے ہو کے خلقت سب آگاہ
حسین آباد کے صدقے سے یہ شہر
زمانے کا ہے وہ احساں کارخانہ
کہ فیض افزوں ہے سارا زمانہ
حسین آٹھوں پہر ان کی ہے محفل
ہر اک کو اس سے ہے اک فیض حاصل
خدا کے فضل سے رہتی ہے کثرت
سدا مجلس میں ہے اک جوش رقت
جو ذاکر خوب ہیں سارے جہاں کے
بحکم شہ ہیں خواندے وہاں کے
وظائف بلکہ حد سے زیادہ
نہ کثرت کیوں کہ ہو حد سے زیادہ
ہوا ہے شاہ کا یوں حکم صادر
کہ سب ارکان ہوں مجلس میں حاضر
ہے سب شہزادوں کو بھی حکم پہنچا
کہ آئیں وقت پہ مجلس میں اس جا [۴۰]

رجب علی بیگ سرور عینی شاہد کی حیثیت سے حسین آباد کے امام باڑے کی شان و شوکت یوں بیان کرتے ہیں:-

"ادھر حسین آباد کے امام باڑے کی بنا ہے، پھر ک سے مثال ہلال عید نمایاں ہے۔ جل جلالہ! کیا شوکت و صولت ہے! برج طلائی خورشید نمط درخشاں ہے ..... ماتم خانۂ شاہ شہیداں ہے۔ جس دم عرش پاک نظر آئی، دل حزیں، دیدۂ جیحون بدوش نظر آئی ..... ہزار در ہزار علم ہائے نادر جن کے دیکھنے سے الم آل عبا ہو۔ خلاصہ یہ کہ امام باڑا جو تیار ہوا، صحن میں حوض مصفا، پانی سے لبالب بھرا، تشنگی اہلبیت کی لہروں سے یاد دلاتا، دیدۂ پانی آنکھ سے کم نہیں۔ کسی چیز کو حسین علیہ السلام کا غم نہیں ..." [۴۱]

محمد علی شاہ کی زوجہ ملکۂ آفاق نے بھی محمد علی شاہ کے عہد حکومت میں ایک کربلا تعمیر کرائی جو ملکۂ آفاق کی کربلا کے نام سے موسوم اور شیعہ کالج، ڈالی گنج لکھنؤ کے قریب آج بھی موجود ہے۔ اس کربلا کو عسکرین بھی کہا جاتا ہے۔[۴۲] عہد محمد علی شاہ میں ہی ۱۲۵۳ھ میں محمود چوک کے قریب میر باقر سوداگر کا امام باڑا بھی تعمیر ہوا[۴۳] جس میں میر ضمیر اور مرزا دبیر مجلسیں پڑھا کرتے تھے۔ سوداگر کا امام باڑا آج بھی اچھی حالت میں موجود ہے۔

محمد علی شاہ کے بعد اُن کے فرزند امجد علی شاہ کے زیرِ حکومت

[[illegible]] میں لکھنؤ میں مذہبیت کو بہت زیادہ فروغ ملا۔ [illegible] حضرت گنج کے قریب سبطین آباد کا امام باڑہ امجد علی شاہ کی یادگار ہے جسے بادشاہ کے انتقال کے بعد اُن کے جانشین واجد علی شاہ نے دس لاکھ روپے کے صرفے سے بنوایا تھا[۴۲]۔ امجد علی شاہ کے زمانے میں علمائے دین کو بڑا عروج حاصل تھا[۴۳]۔ اسی زمانے میں تال کٹورے کی کربلا کے نزدیک کربلائے عظیم اللہ خان ۱۲۶۰ھ میں تعمیر ہوئی[۴۴]۔

امجد علی شاہ کی وفات کے بعد واجد علی شاہ کے عہدِ حکومت [۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء تا ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء] میں بھی لکھنؤ میں عزاداری کو برابر فروغ رہا۔ واجد علی شاہ فنونِ لطیفہ کے شوق کے ساتھ ساتھ مذہبی شغف بھی رکھتے تھے۔ واجد علی شاہ کے مذہبی انہماک کے بارے میں اُن کے ہم عصر رجب علی بیگ سرورؔ کا بیان ہے:۔

"... تقویٰ ذاتِ اقدس سے تقویت رکھتا ہے۔ زہد و ورع کو بصد نیاز ناز ہے، عین عالمِ شباب میں سلطانِ مقید روزہ و نماز ہے ..."[۴۵]

واجد علی شاہ اخترؔ کے منظومات میں مراثی بھی موجود ہیں۔ شررؔ لکھنوی کے مطابق واجد علی شاہ نے سیکڑوں مرثیے اور سلام کہے تھے[۴۶]۔ واجد علی شاہ کے صحیفۂ حیات کی ورق گردانی کرنے پر ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کے اس تاجدار نے دوسرے شعراء کے ساتھ ساتھ مرثیہ نگاروں کی بھی ہمت افزائی اور قدردانی میں کمی نہ کی تھی۔ جیسا کہ مرزا دبیرؔ کے لئے واجد علی شاہ کی اس بیت سے ظاہر ہے ؎

بچپن سے ان کے دامِ سخن کا اسیر ہوں
میں کم سنی سے عاشقِ نظمِ دبیر ہوں[۴۷]

واجد علی شاہ (متوفی ۱۸۸۷ء)[۴۹] اور میرزا دبیرؔ (متوفی ۱۸۷۵ء) کے ہم عصر مولانا عبدالحلیم شررؔ لکھنوی (متولد ۱۸۶۰ء)[۵۰] نے گزشتہ لکھنؤ کی عزاداری اور اُس کے لوازم کا چشم دید حال بیان کرتے ہوئے ذیل میں جو کچھ تحریر کیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہان اودھ اور امراء کے علاوہ عزاداری، سوز، مرثیوں اور نوحوں کی عوام میں بھی زبردست مقبولیت تھی۔ مولانا شررؔ لکھنوی کے بیان کے ضروری حصے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

"جس طرح مذہبی سرگرمی نے شاعری میں مرثیہ گوئی اور تحت اللفظ خوانی کو پیدا کیا اُسی طرح موسیقی میں سوزخوانی پیدا کر دی پھر ان دونوں فنوں کو یہاں تک ترقی دی کہ مستقل فن بن گئے اور ایسے فن جو ابتدا سے انتہا تک لکھنؤ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ تحت اللفظ خوانی مرثیوں کا متانت اور بے تکلفی کے ساتھ اس طرح پڑھنا اور بتا بتا کر سنانا ہے جس طرح شاعر مشاعرے میں غزل سناتا ہے اور سوزخوانی اُن کو پُرسوز و گداز نغمے کے ساتھ سُنانا ہے۔ اصلی اور پُرانی مرثیہ خوانی سوزخوانی ہی تھی یعنی مرثیے مجلسوں میں ہمیشہ نغمے کے ساتھ سُنائے جاتے تھے اور اُن کا رواج دہلی ہی (میں) نہیں ہندوستان کے اُن تمام شہروں میں تھا جن میں شیعہ حضرات آباد تھے ..... مرثیوں کو شاعروں کی شعر خوانی کے لہجے میں ادا کرنا خاص لکھنؤ کی ایجاد ہے اور اس میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ وغیرہ نے جو کمالات دکھائے اُن کا ذکر ہم شاعری کے سلسلے میں کر چکے ہیں۔ سوزخوانی اگرچہ پہلے سے بھی ہر جگہ تھی مگر اُس میں لکھنؤ کے سوزخوانوں نے ایسے ایسے کمال دکھائے کہ اس فن کو بھی

اپنے ساتھ مخصوص کر لیا۔ ۔ ۔ لکھنؤ میں سوز خوانی کا فن گویوں سے نکل کے شرفا میں آ گیا۔ ۔ ۔ یہ با اصول اور باقاعدہ نوحہ خوانی عورتوں میں پہنچی تو اس میں قیامت کی دلکشی پیدا ہو گئی اور چند روز میں شیعہ ہی نہیں ادنیٰ طبقے کی سنیوں کی عورتوں میں بھی نوحہ خوانی کا شوق پیدا ہو گیا۔ ۔ ۔ سنی اور شیعہ دونوں گروہوں کے گھروں میں نوحہ خوانی کے شوق میں تعزیہ داری ہونے لگی اور سنی مسلمان ہی نہیں ہزارہا ہندو بھی تعزیہ داری اختیار کر کے نوحہ خوانی کرنے لگے۔[۵۹]

لکھنؤ میں عزاداری اور مجالس کے زبردست فروغ کے بارے میں مولانا شرر لکھنوی مزید لکھتے ہیں:-

"آداب صحبت میں دو بڑی چیزیں مذہبی صحبتیں یعنی عزاداری کی مجلسیں اور میلود شریف کی محفلیں ہیں۔ مجلسوں کا عام رواج شیعوں میں ہے اور مولود شریف کا سنیوں میں۔ اگرچہ دونوں میں دونوں فرقوں کے لوگ شریک ہوتے ہیں بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کبھی بعض محبِ اہل بیت سنی مجلس عزا کرتے ہیں اور شیعہ حضرات کے یہاں مولود شریف کی محفل ہوتی ہے مگر لکھنؤ کی خاص چیز جس نے لکھنؤ کی سوسائٹی پر اثر ڈالا اور نیز سوسائٹی اس سے متاثر ہوئی وہ مجلسیں ہیں۔ مولود کی محفلوں میں کوئی خصوصیت نہیں جیسی سارے ہندوستان میں ہوا کرتی ہیں یہاں بھی ہوتی ہیں گو اس میں شک نہیں کہ بعض امرا کے یہاں مولود میں بھی قریب قریب وہی شائستگی و تہذیب نظر آتی ہے جو شیعوں کی شائستگی کی وجہ سے مجالس میں ہوا کرتی ہے۔ عزاداری کی مجلسیں بہت کثرت سے ہوتی ہیں اور اگر کوئی شخص چاہے اور پتہ لگاتا رہے تو سال بھر۔ ۔ ۔ محض مجالس کی شرکت سے اپنا پیٹ پال سکتا ہے اور فیاض و عقیدت مند شیعوں کی فیاضی پر جی سکتا ہے۔ مجالس ہی کی برکت سے یہاں مختلف قسم کے ذاکر پیدا ہو گئے جو جدا جدا عنوانوں سے مصائب سید الشہداء علیہ السلام کو بیان کر کے روتے رلاتے ہیں۔ ۔ ۔ مرثیہ خوانی کی ضرورت و قدر نے میر انیس اور مرزا دبیر پیدا کیے جو کمال شاعری کے اعلیٰ ترین منصب پر پہنچ گئے۔ یا تو یہ مثل مشہور تھی کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو یا لکھنؤ کے کمال مرثیہ گوئی نے سارے ہندوستان سے منوا لیا کہ عالم شعر و سخن میں مرثیہ گوئی کا رتبہ دیگر اصناف سخن سے بڑھا ہوا ہے۔ قدردانی نے بیسیوں مرثیہ گو اور صدہا مرثیہ خوان پیدا کر دیئے جو محرم اور دیگر ایام عزاداری میں لکھنؤ سے نکل کے ہندوستان کے ہر دور دراز میں پھیل جاتے ہیں اور وہاں کی صحبتوں میں اپنے کمالات کا سکہ بٹھا کے واپس آتے ہیں۔ ۔ لکھنؤ میں بہت سے اس پائے کے سوز خوان پیدا ہوئے کہ بڑے بڑے استاد گویئے ان کے آگے کان پکڑنے لگے۔ بہرحال جو درجۂ کمال مرثیہ گویوں نے شاعری میں حاصل کیا وہی سوز خوانوں نے موسیقی میں۔ یہ سب فن مجالسِ عزا کی برکت سے پیدا ہوئے اور خاص لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور ان سب نے علاوہ . . . .

ادبِ اردو کو بے انتہا ترقی دینے کے نظم و نثر آفندی رثائی ہیں۔ خاص شان پیدا کر دی کہ انسانی جذبات کو جس طرح چاہیں حرکت میں لائیں اور جس قسم کے جذبات اور جیسے جوش کو چاہیں پیدا کریں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ شیعوں کی مجلسوں نے لکھنؤ کی معاشرت پر بہت نمایاں اثر ڈالا ہے اور اُن کے ذریعے آدابِ صحبت اور تہذیب و شائستگی کو بہت زیادہ ترقی ہو گئی ہے"۔ ۵۲

ڈاکٹر سید صفدر حسین اپنی کتاب "لکھنؤ کی تہذیبی میراث" میں لکھنؤ میں عزاداری کے فروغ پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

"عزاداری شیعیت کی ایک بنیادی رسم ہے، اس لئے اودھ میں شیعیت کے عروج کے ساتھ محرم کی دھوم دھام بھی بڑھتی رہی یہاں تک کہ رفتہ رفتہ لکھنؤ میں سیکڑوں امام باڑے، درجنوں کربلائیں اور ائمۂ معصومین کے روضوں کی بہت سی عمارتی نقلیں تعمیر ہو گئیں۔ چنانچہ اس شہر میں آج بھی روضۂ امام رضاؑ، روضۂ حضرت زینبؑ، روضۂ حضرت عباسؑ، روضۂ امام موسیٰ کاظمؑ اور امام محمد تقیؑ، روضۂ نجف اشرف، روضۂ پسرانِ حضرت مسلمؑ، کاظمین ... وغیرہ کی متعدد عمارتی نقلیں موجود ہیں اور ان کے علاوہ کربلائے دیانت الدولہ، کربلائے نواب عظمت الدولہ، کربلائے نواب ملکہ آفاق، کربلائے حاجی میتھا، کربلائے بی مصری، کربلائے میر خدا بخش اور کربلائے نصیر الدین حیدر وغیرہ واقع ہیں۔ امام باڑوں کی تعداد کا شمار اس لئے مشکل ہے کہ گلی گلی اور کوچے کوچے میں علم نصب ہوتے اور گھر گھر میں مجلسیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ لوگ جگہ جگہ لنگر اور سبیلیں جاری کرتے اور حُبِ اہلبیت میں روپے کو پانی کی طرح بہاتے تھے۔

اس اہتمام کے ساتھ عزاداری منانے کا یہ اثر ہوا کہ ہر نقطۂ خیال کا آدمی کسی نہ کسی پہلو سے امام اور اہلبیتؑ کے غم میں شریک ہو گیا۔ یہ اثرات مسلمانوں کے مخصوص فرقوں یعنی سُنی اور شیعہ تک ہی محدود نہ رہے بلکہ لکھنؤ کے ہندوؤں اور عیسائیوں تک نے بلاتفریق مذہب و ملت محرم کی بہت سی رسمیں خلوص و عقیدت کے ساتھ ادا کیں اور مسلمانوں کے ساتھ عزاداری میں حصہ لیا۔ چنانچہ آج بھی مولوی گنج میں جھاؤلال کا امام باڑا موجود ہے۔ اسی طرح ٹکیٹ رائے، راجا بھوا اور راجا میوا رام کے بھی ذاتی امام باڑے ہوا کرتے تھے جن کی تعمیر و تزئین پر اُن کے بانیوں نے لاکھوں روپے صرف کئے تھے۔ گویا مسلمانوں کی طرح ہندو عوام بھی علم نصب کرتے، تعزیے نکالتے، مہندیاں اُٹھاتے، سوز خوانیاں کرتے اور مرثیے پڑھتے تھے۔ مرثیہ گوئی کے ذیل میں مسلمان شعراء کے ناموں کے ساتھ ساتھ ہندو شاعروں کے نام آتے ہیں چنانچہ راجہ الفت رائے الفتؔ و کنور دھنپت رائے محبؔ کا اس نوع کا کلام اب بھی موجود ہے۔ محبؔ کے مرثیوں اور سلاموں کا ایک ضخیم مجموعہ پروفیسر مسعود حسن رضوی کے پاس ہم نے دیکھا تھا ..... اس مجموعے کے

شروع میں ایک مجلس کے دعوت نامے کی نقل شامل تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ اس مجلس میں اُن کے یہاں مرزا دبیر مرثیہ پڑھنے والے تھے۔ مختصر یہ کہ شیعیت کے تاثر میں بہت سے ہندو حضرات نے بھی ماتم داری کی اور مرثیے تصنیف کیے" ۵۳

سطور گزشتہ میں پیش کیے جانے والے سرسری جائزے سے بخوبی واضح ہو سکتا ہے کہ اودھ کے مختلف فرماں رواؤں کے عہدِ حکومت کے دوران میں کثرت سے تعمیر ہونے والے امامباڑوں، روضوں اور کربلاؤں کے باعث لکھنؤ عزاداری کا ایک زبردست مرکز بن گیا تھا۔ نوحے، سوز اور مرثیے بلا تفریق مذہب و ملت عوام و خواص میں بے حد مقبول ہو گئے تھے۔ ان حالات میں یہاں خواص و عوام (جن میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل تھے) مجالسِ عزا کے انعقاد میں ... تمام سے کام لیتے تھے اُن کے پیشِ نظر لکھنؤ میں صنفِ مرثیہ کا غیر معمولی فروغ پانا اور حیرت نہیں۔ بہرحال اس دور میں لکھنؤ صحیح معنوں میں مرثیہ نگاری کا ایک زبردست مرکز بن گیا تھا۔ اہم اور مشہور مرثیہ نگاروں کے علاوہ متعدد ... شعرا جن کا اصل میدان قصیدہ، غزل یا مثنوی وغیرہ تھا صنفِ مرثیہ سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ مرزا رفیع سودا، میر تقی میر، میر حسن، جرأت، مصحفی، امانت، امیر بحر لکھنوی اور شاہ عظیم آبادی وغیرہ کا اصل میدان مرثیہ گوئی نہ تھا لیکن تاریخِ مرثیہ کے صفحات میں ان شعرا کے ناموں کی شمولیت ۵۴ صنفِ مرثیہ کی مقبولیت پر دال ہے۔ ان شعرا کے علاوہ فصیح، دلگیر، خلیق اور ضمیر کی بھرپور شاعرانہ صلاحیتوں نے صنفِ مرثیہ کو جو تقویت بخشی تھی اُس کے پیشِ نظر بھی لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کی مقبولیت میں زبردست اضافہ ہوا تھا۔ مرزا دبیر کی

مرثیہ نگاری دوسرے محرکات کے ساتھ ساتھ ان تمام مؤثرات کی کارفرمائی کی بھی رہینِ منت رہی ہے۔

انیس و دبیر دونوں کی مرثیہ نگاری پر ماضی میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ زمانۂ حاضر میں بھی انیس پر تو بہت کچھ لکھا جا رہا ہے لیکن اب ہندوستان میں دبیر پر لکھنے والوں کی شدید کمی نظر آ رہی ہے۔ ہمارے قدر اول کے اہلِ قلم بھی دبیر پر لکھنے سے گریز کر رہے ہیں۔ مراثی دبیر کی جلدیں پہلے کمیاب تھیں تو اب تقریباً نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔ راقم الحروف نے نجی طور پر متعدد اہم صاحبانِ قلم سے سرفراز لکھنؤ کے دبیر نمبر کے لیے لکھنے کی درخواست کی مگر جواب میں جو خطوط آئے ان میں سے بیشتر میں معذرت ہی کی گئی ہے۔ ہماری کتنی ہی دانش گاہوں کے اردو ادب کے نصاب سے دبیر کو نکال دیا گیا ہے۔ ادبی حلقوں میں دبیر کا یوں نظر انداز کیا جانا دبیر سے زیادہ خود اردو ادب کے لیے مضرت رساں ثابت ہوگا۔ میری ناچیز رائے میں اردو مرثیے کے ارتقا کو صحیح طور پر سمجھنے میں مطالعۂ دبیر کو کسی طرح نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ انھیں اسباب کی بنا پر راقم السطور نے ہفت روزہ سرفراز لکھنؤ کی مجلسِ منتظمہ میں سرفراز کے دبیر نمبر کی تجویز پیش کی جو منظور کر لی گئی اور اسی تجویز پر محرم ۱۳۹۷ھ کے موقع پر سرفراز کا دبیر نمبر شائع کیا جا رہا ہے۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ میرے محدود مطالعہ میں ابھی تک ہندوستان کے کسی جریدے کا دبیر نمبر نہیں آیا ہے۔ ہندوستان میں سرفراز لکھنؤ کا دبیر نمبر اس اعتبار سے بھی غالباً اولیت کا شرف رکھتا ہے۔ برادرم عبدالقوی صاحب دسنوی صدر شعبۂ اردو سیفیہ کالج بھوپال کی کوششوں سے رسالہ کتاب نما دہلی کا دبیر نمبر بھی تیاری کی منزلوں سے گزر کر شائع ہونے والا ہے۔ کتاب نما دہلی کے دبیر نمبر کے لیے راقم الحروف نے برادرم عبدالقوی صاحب دسنوی

[illegible] بھرپور تعاون پیش کیا ہے۔ خدا کرے کہ یہ تحریک جلد منظر عام پر آسکے۔

سرفراز اور کتاب نما کے دبیر نمبروں کے علاوہ پاکستان سے شائع ہونے والے دو رسائل پیام عمل لاہور اور نوراول پنڈی کے دبیر نمبر میرے پیش نظر موجود ہیں جو ۱۹۷۵ء میں منصۂ شہود پر آچکے تھے۔ میں سرفراز کے دبیر نمبر میں ان دونوں رسائل کے بھی بعض مضامین شامل کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔

حواشی :-

۱؎ شمولہ: دفتر ماتم جلد اول: مرزا دبیر۔ مطبع محمد تیغ بہادر لکھنؤ۔ جنوری ۱۹۱۰ء۔ مرثیہ نمبر ۱۔ بند نمبر ۳۵ تا ۴۰

۲؎ تجلیات: مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی۔ نظامی پریس لکھنؤ ۱۳۴۴ھ (حصہ دوم) باب السیرۃ ص ص ۱۹۰ تا ۱۹۳

۳؎ اس قول کے لیے تائیدی شواہد مندرجہ ذیل کتب میں موجود ہیں:۔

(۱) فارسی کتاب شمس الضحیٰ: مولوی میر صفدر حسین مطبع اثنا عشری، لکھنؤ ۱۲۹۸ھ

(۲) حیات دبیر جلد اول: تفضل حسین ثابت لکھنوی سیلوک اسٹیم پریس، لاہور ۱۹۱۳ء

(۳) فکر بلیغ: مؤلفہ شاد عظیم آبادی۔ مرتبہ نقی احمد ارشاد۔ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ۔ اگست ۱۹۷۴ء

(۴) دبستان دبیر: ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی۔ نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ سنہ ۱۹۶۶ء

(۵) اردو مرثیہ اور مرزا دبیر: کاظم علی خاں۔ احباب پبلشرز، لکھنؤ۔ مطبوعہ سرفراز قومی پریس، لکھنؤ۔ اگست ۱۹۷۵ء۔ دبیر وغیرہ ــــ کاظم علی خاں

۴؎ اس سلسلے میں میرے ایک مضمون "مثنویات مرزا دبیر" پر ایک نظر" میں مفصل گفتگو کی گئی ہے۔

۵؎ الباب المصائب: مرزا دبیر۔ مطبع یوسفی، دہلی۔ (سنہ اشاعت ندارد)

۶؎ اس بیان کے لیے تذکرہ مسرت افزا وغیرہ کی مدد سے ڈاکٹر مسیح الزماں نے اپنے ڈی۔لٹ کے مقالے "اردو مرثیے کا ارتقاء" لکھنؤ ۱۹۶۸ء (ص ص ۱۳۵ تا ۱۳۹) میں متعدد مفید تائیدی ثبوت پیش کیے ہیں جو ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

۷؎ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت: سید ہاشمی فرید آبادی۔ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ بحوالہ دبستان دبیر لکھنؤ ۱۹۶۶ء ص ص ۱۲۱/۱۲۰

۸؎ سوانحات سلاطین اودھ جلد اول: سید کمال الدین حیدر۔ مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ ۱۸۹۶ء۔ ص ۲۸۳۔ (بحوالہ اردو مرثیے کا ارتقاء ص ص ۱۴۰/۱۳۹)

۹؎ انگریزی کتاب شجاع الدولہ جلد اول: ڈاکٹر اے ایل سری واستوا (بحوالہ لکھنؤ کی تہذیبی میراث: ڈاکٹر سید صفدر حسین۔ بارگاہ ادب۔ لاہور ۱۹۷۵ء ص ص ۲۳۵/۲۳۶)۔

۱۰؎ بحوالہ سرور سلطانی: رجب علی بیگ سرور۔ مرتبہ پروفیسر آغا سہیل۔ مجلس ترقی ادب۔ لاہور۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء ص ۶۔ (حاشیہ نمبر ۴)

۱۱؎ بحوالہ لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔ ص ۲۳۲ نیز ص ۲۳۶۔

۱۲؎ السابق ص ص ۲۳۳/۲۳۲۔

۱۳؎ ر۔ک (۱) اردو مرثیے کا ارتقاء ص ۱۴۳۔ (۲) تاریخ آصفی اردو ترجمہ تفضیح الغافلین از مرزا ابوطالب لندنی۔ ترجمہ و ترتیب از ڈاکٹر ثروت علی۔ ادارۂ صبح ادب۔ دہلی۔ ۱۹۶۸ء ص ۱۰۵

۱۴؎ بحوالہ اردو مرثیے کا ارتقاء۔ ص ۱۴۳۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی اپنے پی۔ایچ۔ڈی کے تحقیقی مقالے: دبستان دبیر

(طبع اول ص ۱۲۹) میں رقم طراز ہیں کہ لکھنؤ کا آصفی امام باڑا اور حسینیہ غفران مآب، مرزا محمد رفیع سودا کی زندگی میں ہی بن چکا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کا یہ بیان حقائق پر مبنی نہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی تحقیق کے مطابق سودا کا سنہ وفات ۱۱۹۵ھ بہ مطابق ۱۷۸۱ء کے مطابق قرار دیا جاتا ہے (ر۔ک۔ مرزا محمد رفیع سودا: ڈاکٹر خلیق انجم۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ طبع اول۔ ص ص ۱۲۹ تا ۱۳۳) اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے حسینیہ آصفی کی تعمیر ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۵ء تا ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰ء کی درمیانی مدت میں ہوئی تھی۔ نیز حسینیہ غفران مآب ۱۷۹۵ء/۱۲۱۰ھ میں بنا تھا۔ گویا حسینیہ آصفی و غفران مآب دونوں کی تعمیر سودا کی حیات کے بجائے سودا کی وفات کے بعد ہوئی تھی۔

۱۵ سرور سلطانی۔ مرتبہ پروفیسر آغا سہیل۔ لاہور۔ ص ۹ (حاشیہ نمبر ۶)

۱۶ ر۔ک۔ سیاحات سلاطین اودھ جلد اول ص ۱۹۹ (بحوالہ اردو مرثیے کا ارتقاء)

۱۷ ر۔ک سرور سلطانی۔ ص ۶ (حاشیہ نمبر ۷)

۱۸ لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔ ص ۲۵۲

۱۹ وقائع دلپذیر: منشی عبد الاحد

۲۰ بحوالہ بیگماتِ اودھ: شیخ تصدق حسین۔ کتاب نگر۔ لکھنؤ۔ ۱۹۵۶ء ص ص ۸۹/۸۸

۲۱ ۔ ر۔ک۔ انگریزی کتاب "مینرس اینڈ کسٹمس آف دی سلطانس آف انڈیا": مسز میر حسن علی (بحوالہ بیگمات اودھ ص ص ۶۷ تا ۷۱)

۲۲ بحوالہ منظومات میاں دلگیر: ڈاکٹر اکبر حیدری مطبوعہ سرفراز قومی پریس، لکھنؤ۔ ۱۹۷۰ء ص ۱۰۷ (حاشیہ نمبر ۲)

۲۳ ر۔ک۔ فسانۂ عبرت: رجب علی بیگ سرور۔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ کتاب نگر۔ لکھنؤ۔ دسمبر ۱۹۵۷ء ص ۹ نیز ص ۱۷۔

۲۴ ر۔ک۔ شباب لکھنؤ ترجمہ انگریزی کی کتاب "پرائیویٹ لائف آف این ایسٹرن کنگ": ولیم نائٹن۔ مترجمہ محمد احمد علی۔ الناظر پریس، لکھنؤ ۱۹۲۴ء ص ص ۵۰/۵۸ (بحوالہ لکھنؤ کی تہذیبی میراث ص ۲۳۸)

۲۵ اردو مرثیہ: سفارش حسین رضوی۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ جولائی ۱۹۶۵ء ص ۱۹۵

۲۶ ر۔ک۔ رجب علی بیگ سرور۔ حیات اور کارنامے تحقیقی مقالہ برائے ڈی۔ فل: ڈاکٹر نیر مسعود۔ اسرار کریمی پریس، الہ آباد ۱۹۶۷ء۔ ص ص ۱۰۱/۱۰۴۔

۲۷ فسانۂ عبرت ص ۱۹

۲۸ میر ضمیر (تحقیقی مطالعہ): ڈاکٹر اکبر حیدری۔ طبع اول ۱۹۷۲ء۔ ص ۱۳۱۔

۲۹ ملکہ زمانیہ کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: بیگمات اودھ ص ص ۱۰۲ تا ۱۱۴

۳۰ بحوالہ دبستانِ دبیر ص ص ۴۲۵/۴۲۴

۳۱ بحوالہ بیگمات اودھ ص ۱۷۳

۳۲ بحوالہ سرور سلطانی۔ صفحہ ۹ (حاشیہ نمبر ۱۹)

۳۳ بحوالہ منظومات میاں دلگیر۔ ص ۳۱

۳۴ بحوالہ بیگماتِ اودھ۔ ص ۱۷۵

۳۵ دیوانِ ناسخ (قلمی) بحوالہ منظومات میاں دلگیر ص ۳۲ (فٹ نوٹ نمبر ۳)

۳۶ ۔ ر۔ک منظوماتِ میاں دلگیر۔ ص ص ۴۹ تا ۵۲۔ ص ۵۶۔ ص ص ۶۳/۶۲۔ وغیرہ وغیرہ

۳۷ دیوانِ اسیر جلد اول (قلمی) مملوکہ لکھنؤ یونیورسٹی ٹیگور۔ لائبریری۔ میں اسیر نے میاں دلگیر کی مندرجۂ ذیل تاریخ وفات لکھی ہے (مخطوطے میں صفحات درج نہیں ہیں)

آہ آہ از جہاں فانی شد

مرثیہ گوئے شاہِ عرش نظیر

[illegible] اخیر تاریخش
وائے دلگیر عاشق شبیر (۱۲۴۳ ہجری)

۳۸ خطبات میاں دلگیر۔ ص ۷۱

۳۹ نسخۂ عبرت۔ ص ۴۴

۴۰ بحوالہ کلیات اودھ۔ ص ۱۶۷

۴۱ حسینیہ میر باقر سوداگر کا سنہ تعمیر برق کے ایک فارسی قطعۂ تاریخ سے برآمد ہوتا ہے۔ دیوان برق مطبوعہ ۱۸۵۳ء (ص ۱۹۵۴) میں یہ فارسی قطعۂ تاریخ موجود ہے۔ اس اطلاع کے لئے ڈاکٹر اکبر حیدری کا ممنون ہوں۔

۴۲ بحوالہ گزشتہ لکھنؤ: مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی مرتبہ شمیم انہونوی۔ نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ۔ جولائی ۱۹۶۵ء ص ۴۹۔

۴۳ رک (۱) اودھ کا شاہی اسٹیج: سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ کتاب نگر۔ لکھنؤ ۱۹۶۸ء ص ۹۷
(۲) لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔ ص ۱۰۵

۴۴ بحوالہ منظومات میاں دلگیر۔ ص ۲۳۰۔ (نشانِ نو)

۴۵ سرور سلطانی: رجب علی بیگ سرور۔ مرتبہ آغا سہیل ص ۱۰۵۔

۴۶ رک۔ اردو مرثیہ (تاریخ مرثیہ): سفارش حسین ص ۲۴۰۔

۴۷ حزن اختر (مقدمہ) بحوالہ تاجدار اودھ: امجد علی خاں۔ مصدر الواعظ پریس۔ لکھنؤ ۱۹۷۱ء ص ۷۔

۴۸ بحوالہ دبستان دبیر۔ ص ۳۴۔

۴۹ رک (۱) ایک نادر روزنامچہ: مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔ ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ۔ طبع اول ص ۴۳۔
(۲) مضمون سید مسعود حسن رضوی ادیب "سلطان عالم واجد علی شاہ اختر ۔۔۔ انسان، مصنف، شاعر" مشمولہ کتاب نذر مقبول: مرتبہ خیر بہیروی۔ نامی پریس۔ لکھنؤ فروری ۱۹۷۰ء (ص ۳۱)

۵۰ بحوالہ گزشتہ لکھنؤ۔ قارئی بیان از شمیم انہونوی ص ۱۰

۵۱ گزشتہ لکھنؤ: شرر لکھنوی۔ ص ص ۲۱۳، ۲۱۴۔ ۲۱۵

۵۲ گزشتہ لکھنؤ: مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی۔ مرتبہ شمیم انہونوی۔ نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ۔ جولائی ۱۹۶۵ء ص ص ۳۵۹ تا ۳۵۸ نیز ص ۳۶۰

۵۳ لکھنؤ کی تہذیبی میراث: ڈاکٹر سید صفدر حسین بارگاہ ادب، لاہور۔ ۱۹۷۵ء۔ ص ص ۲۹۸/۲۹۷

۵۴ رک اردو مرثیہ (تاریخ مرثیہ): سفارش حسین ص ص ۲۲۴ تا ۲۲۳، ص ص ۲۲۸ تا ۲۴۰، ص ص ۲۴۶ تا ۲۴۹، ص ص ۲۴۰ تا ۲۴۱، ص ص ۳۵۷ تا ۳۵۹، ص ص ۳۸۹ تا ۳۹۹

کاظم علی خاں

تعریفِ اشکِ عزا

اشکِ غمِ شبیرؑ دُرِ یکتا ہے
ہر دیدۂ حق بیں سے یہ دُر پیدا ہے
بے اشکِ عزا آبروئے چشم ہے کیا
پانی نہ ہو جس میں وہ کنواں اندھا ہے

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

مرزا دبیرؔ کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ

جب کوفہ میں پابندِ بلا ہو گئے مسلمؑ

(نوٹ: راقم الحروف کو لکھنؤ کے مشہور و معروف علم دوست اور ادب نواز جناب مرزا علی سجاد حسین صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر نے مراثی کا ایک مخطوطہ عنایت فرمایا تھا اُس کا سائز ۶″×۸″ ہے اور اُس میں میر خلیقؔ، مرزا فصیحؔ، میاں دلگیرؔ، آبادؔ، قبولؔ، عزاؔ، مشرفؔ، شریفؔ، اُنسؔ، مونسؔ اور انیسؔ و دبیرؔ کے بہت سے مرثیے ہیں۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ مخطوطہ میں بہت سے مرثیے ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ اس میں مرزا دبیرؔ کے کئی مرثیے ہیں۔ ایک مرثیہ یہ ہے ع

"صبحِ عاشور ہوا گرم جو بازارِ قضا"

اس کی ابتدا میں یہ عبارت ہے :-

"صحیح و مقابلہ نمودہ شد۔ تصنیف مرزا دبیر سلمہ اللہ تعالیٰ"

آخر میں ذیل کا ترجمہ ہے :-

"تمام شد کتبہ احقر العباد محمد مہدی خاں کربلائی عفی اللہ عنہ بتاریخ شانزدہم شہر صفر سنہ ۱۲۷۷ ہجری و مالک ہم مشارٌ الیہ فقط۔"

اسی مخطوطہ میں دبیرؔ کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ ہے۔ اس میں ۳۸ بند ہیں۔ مرثیہ سے پہلے سادہ صفحہ پر یہ عبارت ہے: "مرثیہ دبیرؔ بند ۳۸" اور اُس کے نیچے کی عبارت یہ ہے :- "مالک این مرثیہ نجو صاحبہ"۔ مرثیہ میں مقطع نہیں ہے لیکن مخطوطہ بہت پُرانا ہے اور اس میں جتنے مرثیے ہیں وہ سب مستند ہیں لہٰذا زیرِ نظر مرثیہ کے مستند ہونے میں راقم کو کلام نہیں۔)

جب کوفہ میں پابندِ بلا ہو گئے مسلمؑ
بچوں سے بھی غربت میں جدا ہو گئے مسلمؑ
اور جورو بیداد و جفا ہو گئے مسلمؑ
ان صدموں سے مشتاقِ قضا ہو گئے مسلمؑ
ہر روز مسافر کے لئے در بدری تھی
ہر شام کو عمر اُن کی چراغِ سحری تھی

وہ شہر پہ آفت وہ ظلم وہ شبِ تار — جلّاد کمیں گاہ میں، دشمن در و دیوار
اک دوست تھا ہانی سو ہوا قتل وہ دیندار — پر رہنے کا گھر میں نہ ہوا کوئی روادار
بیٹھیں کہیں تھک کر تو اجل سر پہ کھڑی تھی
اک سر پہ زمانے کی بلا ٹوٹ پڑی تھی

نہ کوچے سے آگاہ، نہ رستے سے خبردار — اور لوگ چھپے ترکس سے کہ ہر اک سر کا خریدار
فاقوں سے جو لغزش تھی قدم کو دمِ رفتار — چپکے سے یہ کہتے تھے کہ یا حیدرِ کرار
ہر کوچے میں تھا غُل کہ کوئی آنے نہ پائے
ہاں دیکھیو مسلمؑ کو نکل جانے نہ پائے

وارد ہوئے ناگاہ درِ طوعہ پہ ششدر — تسبیح بکف ذکرِ خدا میں تھی وہ در پر
حضرت نے کہا خشک زباں اپنی دکھا کر — نذرِ سپرِ فاطمہؑ اک پانی کا ساغر
احسان کر اللہ و پیغمبرؐ کا تصدق
پانی دے مجھے ساقیِ کوثر کا تصدق

طوعہ گئی اور جام لبالب دیا لا کر — حضرت نے پیا بیٹھ کے دروازے کے اوپر
پھر کوزے کو رکھ کر جو وہ یہاں مکرر — دیکھا کہ ہیں بیٹھے ہوئے زانو پہ رکھے سر
دل میں کہا طوعہ نے کہ رنج اس کو بڑا ہے
تو مسافر سا ہے مگر وقت بڑا ہے

آخر کہا طوعہ نے کہ اے بیکس و تنہا — بس پی چکا پانی مرے دروازے سے اٹھ جا
تو دیکھتا ہے شہر میں کیا فتنہ ہے برپا — جا گھر میں تو ڈر تیرے ناموس کو ہوگا
اس وقت میں ہر اک سے کنارہ ہی بھلا ہے
تو نے بھی سنا ہوگا جو ہانی پہ بلا ہے

اٹھ جانے کو طوعہ نے کہا جب کہ کئی بار — کعبہ کی طرف مڑ کے یہ کرنے لگا گفتار
یا سبطِ نبیؐ ہم بھی ہیں کیا بیکس و ناچار — دروازے پہ رہنے کا نہیں کوئی روادار
اس رات کی رات اور تباہی ہم اٹھا لیں
نانا سے کہو کل ہمیں جنت میں بلا لیں

پھر دیکھ کے طوعہ کی طرف بولے یہ رو کر — گھر ہوتا تو ہم کاہے کو یوں بیٹھتے در پر
یاں میرے لئے فکر کسے ہووے گی خواہر — زینب ہے نہ بانو ہے نہ زوجہ ہے نہ دختر
شبیرؑ جدا مجھ سے ہیں عباسؑ جدا ہیں
اک ہم ہیں تن تنہا یہاں پابندِ بلا ہیں

حیرت ہوئی طوعہ کو یہ بولی وہ حق آگاہ — شبیر ترا کون ہے اے بندۂ اللہ
رو کر کہا سردار ہیں آقا ہیں شہنشاہ — وہ بولی کہ کیا آیا تھا مسلم کے تو ہمراہ
شرما کے کہا وہ وطن آوارہ میں ہی ہوں
مسلم جسے کہتے ہیں وہ بے چارہ میں ہی ہوں

ہاتھوں کو پکڑ کر یہ پکاری وہ خوش ایماں — اے موت کے مہمان تو مرے گھر میں ہو مہماں
تو نائبِ شبیرؑ ہے آ میں ترے قرباں — آواز بتولؑ آئی کہ ہم پہ ہے یہ احساں
مسلمؑ کو تو حجرہ دیا اس اہلِ بلا نے
بخشا اُسے فردوس کا گلزار خدا نے

لکھا ہے نویں رات تھی ذی الحجہ کی یہ آہ — مسلمؑ نے کفن دھو کے معطر کیا ناگاہ
سر سجدے میں تھا لب ذکر میں اور دل سوئے اللہ — جب آئی تھی طوعہ تو یہ کہتا تھا وہ ذیجاہ
فرزندوں کی خنجر کے تلے ذبح کریں گے
کل عرش کو قربانی کے ہم عید کریں گے

ناگہ پسرِ طوعہ نے یہ تذکرے سُن پائے — کی فکر شقی نے کہیں گھر بار نہ لُٹ جائے
کچھ شب تھی کہ حاکم کو یہ دی اُس نے خبر ہائے — مسلم میرے گھر میں ہے کوئی جا کے پکڑ لائے
دی اُس نے صدا فوج کمر باندھ کے آئے
ہاں صبح نہ ہونے پائے کہ مسلم کا سر آئے

لشکر کی ہوئی غارت طوعہ پہ چڑھائی — مسلمؑ نے یہاں جائے نماز اپنی اُٹھائی
ہمسائے کو طوعہ نے یہ آواز سُنائی — مہمان مرا جاتا ہے مرنے کو دہائی
گھر طوعہ کا گھیرا گیا مہمان کی خاطر
ناحق کا یہ انبوہ ہے اک جان کی خاطر

مسلم نے کہا ضامنِ جنت ہوں میں تیرا — اے فاطمہؑ کی لونڈی رضا دے پئے زہراؑ
پھر دھیان میں بیٹوں کے یہ کہہ کر بولے گویا — پردیسیو بابا نے خدا کو تمہیں سونپا
ہم مر کے یہاں بے کفن و گور رہیں گے
سر کٹ کے بدن پیاروں کے دریا میں بہیں گے

یہ کہہ کے برآمد ہوا وہ نائبِ شبیرؑ — بادل کی طرح چھا گئے سب ظالم بے پیر
ہاتھوں میں لئے برچھیاں چلّوں میں تھے تیر — پڑنے لگی مظلوم پہ شمشیر پہ شمشیر
جب زخم سناں کھاتے تھے خوش ہوتے تھے مسلمؑ
زہراؑ کے مسافر کے لئے روتے تھے مسلمؑ

[illegible] سنگ جفا کار — منہ گھوڑے سے پھیر کے ادھر ڈالا کئی بار
[illegible] پاس آتے تھے کفار — آخر کو دغا کی یہ پکارے وہ ستمگار
پھر لڑنا ذرا پوچھو تو بھائی کی خبر کو
وہ ناقہ سوار آتا ہے کعبہ سے ادھر کو

بھائی کا تو مشتاق تھا تلوار کو روکا — بس رخ کے پھراتے ہی اجل نے کیا مجرا
نے خط تھا نہ قاصد تھا فقط پیک اجل تھا — برچھی تو کلیجہ میں لگی، برچھی میں کلیجہ
منہ سوئے نجف کر کے کہا اپنے چچا سے
مظلوم بھتیجے کو ترے مارا دغا سے

یہ سوئے نجف کہہ کے گرے مسلم ذی جاہ — لائے در حاکم پہ اٹھا کر انھیں بدخواہ
سائل ہوئے پانی کے کسی نے نہ دیا آہ — ساغر لئے طوعہ وہاں دوڑ کے آئی ناگاہ
رو کر کہا تم پیاسے ہو کل رات سے آقا
لو پانی پیو خادمہ کے ہاتھ سے آقا

القصہ کہ حاکم نے حضور اپنے بلایا — اور نہ گفتار سخت ستمگر نے سنایا
جس سے محمد احمد مرسل کو بلایا — مسلم نے ملا ہاتھوں کو رونا بہت آیا
حاکم نے کہا تب میں بھی ہاتھ ملے گا
اب خنجر بیداد مرا تجھ پہ چلے گا

وہ بولا کہ حاشا جو تاسف ہو کچھ اپنا — رخصت دے عمر کو وصی ہووے وہ میرا
منگوا دوات و قلم اس دم تو منگوا — کچھ مجھ کو مدینے کے مسافر کو ہے لکھنا
تحریر فقط حال کی منظور ہے مجھ کو
بھجوانے نہ بھجوانے کا مقدور ہے تجھ کو

حاکم کا جو ایما پسر سعد نے پایا — تب لے کے وہ قرطاس و دوات و قلم آیا
مسلم نے لہو زخموں کا کاغذ پہ لگایا — اور پھر رقم ہاتھ میں کاغذ کو اٹھایا
لکھا شہ والا کو کہ کیا حال رقم ہو
اغلب ہے کہ خط لکھنے سے سر تن سے قلم ہو

ذالحج کی نویں عرفے کا دن قتل کا ساماں — پر عید پہ ہی جو آتا ہوں میں آپ پہ قرباں
شہزادوں کا اور شاہ کا اللہ نگہباں — لکھتا ہوں رقیہ کی سفارش مگر اس آن
گھٹ گھٹ کے مرے غم میں نہ دم اس کا نکل جائے
صدقے میں سکینہ کے رقیہ مری ٹل جائے

زوجہ ہے مری خواہر عباس دلاور   وہ مرتبہ داں خود ہے یہ کہہ دینا برادر
روئے مجھے تو بانو نے شبیر سے چھپ کر   ایسا نہ ہو شرمندہ ہو کچھ بانو سے سرور
عباس دلاور کے برابر میں نہیں ہوں
وہ بانو کی لونڈی میں غلام شہ دیں ہوں

روداد بہت، وقت ہے کم، کیا کروں ارقام   جلاد مرے سر پہ ہیں کھینچے ہوئے صمصام
بس میرا یہی خط ہے، یہی آخری پیغام   اب کوفے میں آنے کا بھی لینا نہ کبھی نام
خط پہلی طلب کا جو برادر نے لکھا ہے
میں نے نہیں لکھا ہے مقدر نے لکھا ہے

تقصیر ہوئی بخشیو، لکھنے پہ نہ جانا   کیا جانتا تھا خون کا پیاسا ہے زمانا
واللہ دغا ہے یہاں لشکر نہ آنا   اور خیر جو تم آنا تو زینب کو نہ لانا
لاؤ گے تو وہ زغۂ اعدا میں گھرے گی
سر ننگے بہن آپ کی بلوے میں پھرے گی

عمران کے فرزند سے حاکم ہوا گویا   اب دیر نہ کر بام پہ مسلم کو لے جا
لٹکا کے ذرا کوفہ میں سر کاٹ کے اس کا   اور بام سے بالائے زمیں پھینک دے لاشا
ہاں باندھ کے پھر لاش کے پاؤں میں رسن کو
تشہیر کرو مسلم آوارہ وطن کو

جلاد نے پھر بازوئے مسلم کو لیا تھام   ساتھ اس کی غریبی (کرم خوردہ) مسلم ناکام
ہر زینے پہ معراج شہادت تھی ہر گام   اور بام پہ آ کر ہوئے خورشید لب بام
چپ بیٹھے تھے مسلم وہاں صمصام کے نیچے
تھی خلق تماشے کو کھڑی بام کے نیچے

تب دھیان میں شبیر کے مسلم یہ پکارے   کعبہ کی ہوا راہ میں صدقے میں تمھارے
اب کٹتا ہے سر لوگ تماشائی ہیں سارے   دیکھو مرے آقا مری حسرت کے نظارے
اعجاز سے پردے مری آنکھوں سے اٹھا دو
یا سبط نبی آخری دیدار دکھا دو

کعبہ سے اسی روز روانہ ہوئے تھے شاہ   مسلم تو لب گور تھے، شبیر سر راہ
جبریل نے کوفہ کی زمیں سے کہا ناگاہ   ہاں حکم خدا سے تو بلند ہو ابھی واللہ
مسلم شہ مظلوم کی تصویر کو دیکھے
شبیر اسے دیکھے وہ شبیر کو دیکھے

کوفے کی زمیں نے سرِ رفعت کیا پیدا | پر ساری زمینوں پہ ہوا زلزلہ برپا
چلنے سے رُکا راہ میں اسپِ شہِ والا | اور تھم گئے سب اشترِ ذریتِ زہرا
ہاتف نے ندا دی یہ محمدؐ کے خلف کو
یا سبطِ نبیؐ دیکھ لو کوفہ کی طرف کو

کوفے کی طرف شاہ نے چہرے کو پھرایا | سیدانیوں نے محملوں سے پردہ اُٹھایا
اللہ نے مسلم کا جمال اُن کو دکھایا | بیٹھا ہوا تلوار کے نیچے نظر آیا
باہم تھی نظارہ میں صدا ہائے اخی کی
یاں فاطمہؑ روتی تھی وہاں رُوحِ نبیؐ کی

چہروں پہ طمانچے حرمِ شہ نے لگائے | ملنے کے لئے ہاتھ رقیہ نے بڑھائے
چلائی کہ لو اماں وہ بابا نظر آئے | سب کہتے تھے بابا نے وہاں شہر بسائے
نہ فرش پہ نہ سایۂ دیوار کے نیچے
بابا تو مرے بیٹھے ہیں تلوار کے نیچے

کیا روتے ہو لوگو مرے بابا کو پکارو | لے جا کے رقیہ کو پدرِ خستہ پہ وارو
زینبؑ پھوپھی اشتر سے مجھے جلد اتارو | یا حضرت عباس حمایت کو سدھارو
بھیا علی اکبرؑ یہ بہن تیری بلا لے
لونڈی ہوں میں تیری مرے بابا کو بچا لے

پھر پیٹ کے سر ہاتھوں سے حضرت کو پکاری | فریاد چچا جان دہائی ہے تمھاری
ذات آپ کی ہے عقدہ کشا سب کی میں واری | صغرٰی کے لئے دیکھو صغیری پہ ہماری
دیتی ہوں سکینہ کی قسم جا کے بچا لو
بابا کو مری تیغ کے نیچے سے بچا لو

شبیرؑ پکارے ترا بابا ہے بہت دور | پر خالقِ اکبر کو اب یہی ہے منظور
قاتل سے لگے کہنے وہاں مسلمِ رنجور | حسرت مری پوری ہوئی اے قاتلِ مقہور
لے کاٹ لے سر جلد کہ مرنے کا مزا ہے
مرتا ہوں میں جس کے لئے وہ دیکھ رہا ہے

قاتل نے لگائی سرِ مسلم پہ جو شمشیر | سر کٹ کے پکارا ہیں فدائے سرِ شبیرؑ
کوٹھے سے گرایا جو تنِ مسلمؑ دلگیر | یا حیدرِ کرارؑ کہا اور کہی تکبیر
قطرے جو گرے خون کے دامانِ علیؑ میں
سر گود میں زہراؑ کے تن آغوشِ نبیؐ میں

سرپیٹنے کی جا ہے گرا جب کہ وہ لاشا　　موجود تھے حاکم کی طرف سے وہاں اعدا
میں کیا کہوں اک ایک نے دی لاشہ کو ایذا　　پھر لاشے کے پاؤں میں غرض رسی کو باندھا
پہلے اُسے دربارِ ستمگار میں لائے
پھر کھینچتے ہر کوچہ و بازار میں لائے
پھر لاش کو کوچوں میں پھراتے تھے جو بدخواہ　　رونے کی فرشتوں کے صدا آتی تھی واللہ
اک بی بی بھی پوشیدہ تھی اس لاش کے ہمراہ　　چلاتی تھی وہ یا ولدی یا ولدی آہ
جب پوچھتا تھا کوئی کہ یہ کس کی بکا ہے
کہتی تھی زمیں فاطمہؑ مشغولِ بکا ہے

الوداع شاہِ خُراساں

از مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ

الوداع اے بے وطن شاہِ خراساں الوداع
الوداع اے بے کفن شاہِ شہیداں الوداع
الوداع اے کشتۂ زہرِ دغا، بیکس رضاؑ
الوداع اے زخمیِ شمشیر و پیکاں الوداع
الوداع اے ساکنانِ طوس کے پشت و پناہ
الوداع اے ہند کے شیعوں کے مہماں الوداع
کل سوم ہے آپ کا پردیس میں اے شاہِ طوس
آپ کا چہلم ہے کل اے شاہِ ذیشاں الوداع
لو اُٹھو ماتم کرو نزدیک ہے روزِ حسینؑ
الوداع اے شیعیانِ پاک ایماں الوداع

سید سکندر آغا
ریسرچ اسکالر (لکھنؤ یونیورسٹی)

مقیاس الاشعار از مرزا اوج لکھنوی

ایک تعارف

ولادت ۴؍جمادی الاول ۱۲۶۹ھ مطابق ۵؍فروری ۱۸۵۳ء
وفات ۲۵؍جمادی الاخر ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۰؍اپریل ۱۹۱۷ء

میر انیس اور مرزا دبیر کے بعد فن مرثیہ گوئی میں مرزا اوج نے جو کمال پیدا کیا وہ اظہر من الشمس ہے۔ ۱۲۹۲ھ میں انھوں نے اپنے فنی کمالات کا مظاہرہ "مقیاس الاشعار" کی صورت میں ارباب علم کے سامنے پیش کیا۔ فن عروض قافیہ میں یہ اردو کی ایک مستند کتاب تسلیم کی گئی ہے۔ اس کے متعلق نواب مرزا خاں داغ دہلوی کا قول ہے۔

"ان کی کتاب علم عروض میں مقیاس نام۔ ان کی عروض دانی میں اکمل ہونے پر دلیل روشن ہے۔"[1]

اس کا تاریخی نام "ارمغان" ہے جس سے ۱۲۹۲ھ نکلتا ہے۔ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول عروض اور فن شعر سے تعلق رکھتا ہے۔ حصہ دوم میں قافیہ کی بحث ہے اور حصہ سوم فن تاریخ گوئی کے متعلق ہے۔ کتاب بڑے سائز کی ۳۴۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ کتاب کمیاب ہے۔ بڑی تلاش و جستجو کے بعد راقم الحروف کو ایک نسخہ دستیاب ہوا۔ اس پر حضرت اوج مدظلہ کے دستخط بھی ثبت ہیں۔ جزو اول کے چند اقتباسات ناظرین کرام کے سامنے فن شعر اور کلام موزوں کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

"۔۔۔۔ شعر وہ کلام ہے کہ بغرض تصانیف ہو واسطے موزوں و مقفیٰ ہونے کے، قائل نے قصد موزوں و مقفیٰ ہونے کا کیا ہو۔ پس کلام موزوں و مقفیٰ کہ صادر ہو ساہی و منکر و شاک و نائم و مجنون سے اور اس شخص سے کہ بے قصد و ارادہ اس سے کلام موزوں صادر ہوا ہو، حد شعر میں داخل ہوگا کہ نفس صلاحیت موزوں و مقفیٰ ہونے کی رکھتا ہے۔ مگر اس صورت میں بعض آیات قرآن مجید اور بعض احادیث شریف کہ موزوں معلوم ہوتے ہیں داخل ہوتے ہیں حد شعر میں اور منافی ہے اس کے قول حضرت حق سبحانہ تعالیٰ کا "وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ ان ھو الا ذکر و قرآن مبین" جواب اس کا دو طرح پر

[1] معراج الکلام ص۱۴

ہے۔ ایک یہ کہ مراد نفی تعلیم تالیف شعر ہو کما هو نص سیاق کلام ہوگا۔ موزون و مقفی ہونے میں آیات کے لئے وزن سرے یہ کہ وہ آیات کہ موزون معلوم ہوتے ہیں یا اُس میں تغیرات وغیرہ ہیں کہ عروض قافیہ عرب میں جائز نہیں یا انقطاع و وصل کے سبب کے کلام موزون نہیں رہتا اور (۳) حضرت میں بھی (علامہ محسن علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اس بات سے کہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ نے شعر نہیں کہا یہ ہے کہ ان حضرت نے کلام شعری نہیں بنایا نہ یہ کہ کلام موزون نہیں فرمایا اس واسطے کہ اطلاق شعر کا اوپر دونوں معنوں کے ہے اور ان حضرت سے کلمات موزوں منقول ہیں مثل قول آنحضرت ہے أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ هَلْ أَنْتِ إِلَّا إِصْبَعٌ دَمِيتِ وَفِي سَبِيلِ اللّٰهِ مَا لَقِيتِ

(ترجمہ: میں ہوں نبی۔ نہیں جھوٹ بولتا ہوں میں۔ میں ہوں بیٹا عبدالمطلب کا آیا ہوا تو مگر انگشت خون آلودہ اور راہِ خدا میں ملاقات نہیں کی تو نے (اور یہ استفہامیہ ہے قصہ اس کا یہ ہے کہ وہ حضرت کہیں تشریف لئے جاتے تھے ناگاہ انگشت پائے مبارک حالت مشی میں ایک سنگ سے ٹھوکر کھا کر خون آلودہ ہو گئی اُس وقت بے اختیار یہ کلام بلاغت نظام زبان اقدس پر جاری ہوا اور یہ جو رجز میں ہو سکتا ہے اس وقت کہ بضرورت استقامت وزن ہمزہ وصل اصبع کو ساقط نہ کریں کما جاز والا وزن شعر نہ ہوگا

اگر کوئی کہے کہ فاعلن مستفعلن سے بحر رجز نہ ہو سکتا ہے اگر الف گرائیں تو ہم جواب دیں گے کہ یہ زحاف خاص فارسی کا ہے نہ عربی کا۔[1]

علم عروض: اقسام شعر کے بارے میں رطب اللسان ہیں:-

"شعر کی دس قسمیں ہیں (۱) بیت (۲) رباعی (۳) غزل (۴) قصیدہ (۵) قطعہ (۶) مثنوی ترجیع بند (۷) ترکیب بند (۸) مستزاد (۹) مسمط اور ان انواع کے تحت میں بیت، مطلع حسن مطلع، مقطع اور ذیل قصائد میں مسمط چار خانہ وغیرہ لیکن فرد مستقل تنہا اور اصطلاح میں وہ شعر کہ جو دو مصرعے رکھتا ہو اور دونوں مصرع اُس کے باہمدگر مقفیٰ نہ ہوں مثال میں جدم میر انشاء اللہ خاں مغفور سے

جائے مسیح گرچہ ہو نہ چرخ چہارمیں
حقا کہ تا مقام ابوذر نہ می رسد

(رباعی) نظم اول اور اصطلاح شعرائے عجم میں وہ دو شعر کہ اوپر وزن معینہ رباعی کے ہوں۔ عام اس بات سے کہ تیسرے مصرع میں قافیہ ہو یا نہ ہو مثال میں جناب والد علام طاب ثراہ ۔

جو پھول کبھی نہ بوستاں سے نکلے
اس دور میں جو رہ آسماں سے نکلے
صد شکر کہ شہر لکھنؤ تھا جنت
آدم ہو کے کہ ہم جناں سے نکلے

یہ رباعی ہنگام ورود عظیم آباد نظم فرمائی گئی۔ مثال انہیں مغفور سے کہ جس کا تیسرا مصرع

---

(۱) مقیاس الاشعار صفحہ ۹ و ۱۰

یہ قطعہ ہے، نہ
کہ مین یہ قالی کا وصفی غالب ہے
چو عظم عطا وجہ علی تالب ہے
اشرف ہے مطلب بنی طالب ہے
کیا ذات علیؑ ابن ابی طالب ہے
اور یہ رباعی ذو قافیتین بھی ہے۔

غزل بالفتحین۔ بازی کرنا ساتھ محبوب کے اور حکایت کرنا جوانی سے اور حدیث صحبت و عشق زنان سے اور اصطلاح میں بھی مشتمل بایں معنی چند اشعار اک وزن و قافیہ میں اور بیت اول میں دونوں مصرعے مقفیٰ ہوتے ہیں یا مردّف بھی اور دیگر ابیات کے لیے اواخر مصاریع مقفیٰ ہوتے ہیں یا مردّف بھی اور اشعار غزل کمتر تین بیتوں سے اور زیادہ بارہ بیتوں سے نہیں ہوتی . .

قصیدہ لغت میں بمعنی مغز سطبر و غلیظ اور اصطلاح اہلِ فارس میں وہ نظم کہ دونوں مصراع بیت اول جس کے مصرع ہوں (یعنی دونوں مصرع برابر کے مقفیٰ ہوں اور مصرعہ ثانی ابیات دیگر کے ہم قافیہ ہوں - پہلی بیت کے ساتھ. بہرحال قصیدہ میں مدح یا ذم یا وعظ یا حکایت یا مثل اس کے بیان ہوا اور کمتر پندرہ یا اکیس بیتوں سے نہ ہو اور زیادہ کے لئے کوئی حد نہیں ہے لیکن بعض فصحائے اہل عجم نے حد قصیدہ کی ایک سو بیس شعر تک مقرر کی ہے . . . . ۱؎

و قطعہ بکسر اول و سکون ثانی پارہ از ہر چیز و بالفتح غلط مگر بعض فصحائے متاخرین کے عندیہ میں جائز بھی ہے اور اصطلاح میں دو بیتیں کہ اس سے کم نہ ہوں اور زیادہ کے لئے کوئی حد نہیں مثل قصیدہ کی اور مطلع رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو وجہ تسمیہ یہ ہے کہ گویا وہ ٹکڑا نظم کا غزل یا قصیدہ سے منقطع ہوا ہے . ۱؎

(مثنوی) اصل میں مثنی بفتح میم و سکون ثائے مثلثہ و فتح نون واسنت ذکر وہ ایک اسم ہے کہ دونوں ہے اثنین، تثنیہ سے کہ ترجمہ اس کا دو دو ہیں الف مقصورہ کو مطابق قاعدہ کے حالت الحاق یائے نسبت میں واؤ کے ساتھ بدل کیا مثنوی ہوا چونکہ ابیات مثنوی میں ہر بیت میں دو قافیہ متفق علیحدہ ہوتے ہیں بہ بیت دیگر سے لہٰذا ابیات مختلف القوافی کو مثنوی نام رکھا اور مزدوج بھی اور اصطلاح میں عبارت ہے . اسی طرح کے اشعار سے کہ ایک وزن پر ہوں اوزان معینہ مثنوی میں مثل شاہنامہ فردوسی علیہ الرحمہ اور سکندر نامہ کے اور مثنوی کہنا نزدیک اساتذہ کے لئے بحیثیت مجموعہ مثنوی کے لئے ہوگا کیونکہ یہ اب بھی بحیثیت مجموعی مشکل ہے باعتبار نفس مثنوی تو فہم بہرحال اساتذۂ فارس نے مثنویاں سات وزنوں میں کہی ہیں اسی جہت سے اکثر شعرا کا یہ عندیہ ہے کہ جس طرح رباعی چوبیس وزنوں پر منحصر ہے اسی طور پر مثنوی بھی سات وزنوں سے

۱؎ مقیاس الاشعار صفحہ ۱۴، ۱۵ اور ۱۶

مخصوص ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۵۱

(ترجیع بند) ترجیع یعنی رجوع کرنا اور اصطلاح میں رجوع کرنا غزل سے طرف بند کے اور بند عبارت ہے اک شعر اجنبی سے کہ چند غزلیات متحد الوزن و مختلف القوافی میں بعد ہر غزل کے مکرر واقع ہو اور اس شعر کے دونوں مصرع باہم اگر مقفیٰ ہوں اور قافیے اُس شعر کے لئے غیر قافیہ جمیع غزلیات ہوں اور وہ شعر اور وہ سے معنی ساتھ آخر ہر غزل کے مربوط ہو اور ہر غزل بے مقطع ہیں غزل آخر کہ اُس میں مقطع ہوگا اور تعداد اشعار ہر غزل یکساں ہو اور حد تعداد اشعار غزل پانچ سے بارہ تک ہو ۔ ۔ ۵۲

(ترکیب بند) لغت میں ایک چیز کو ساتھ ایک چیز کے وصل کرنا اور اصطلاح میں چند غزلیات متحد الوزن و مختلف القوافی اور ہر غزل بے مقطع سوا غزل آخر کے کہ اس میں مقطع ہوگا اور تعداد اشعار ہر غزل برابر اور بعد ہر غزل ایک شعر غیر مکرر کہ جو آخر شعر ہر غزل سے مربوط ہو اُس کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک وہ کہ بعد ہر غزل کے ہر شعر اجنبی جیسے بند کئے ہیں باہم اگر مختلف القافیہ ہو یا متفق القافیہ ہو ۔ ۔ ۔ ۵۳

(مستزاد) بضم میم زائد معجمہ زیادہ کیا گیا اور اصطلاح

۵۱ مقیاس الاشعار صفحہ ۲۰ و ۲۱

۵۲ " " صفحہ ۲۳

۵۳ " " " ۲۴

میں وہ بیت مثمن یا مصراع مثمن کہ جس کے آخر میں ایک فقرہ ہم وزن دو رکن یا چار رکن اور اسی وزن بیت سے زیادہ کریں ساتھ اس بات کے کہ کلام سابق سے مربوط ہو اور ضرور نہیں کہ معنی بیت کے یا مصرع کے بغیر اس کے تمام نہ ہوں ۔ ۔ ۔ ۵۴

(مسمط) بضم میم و فتح سین و تشدید میم دوم مفتوح و طائے مہملہ دُر در رشتہ کشیدہ شدہ بسلک مروارید اور اصطلاح شعرا میں اک قسم تمام شعر سے ہے اور دوسری انواع صنایع سے ہے اور اُس کو مسمط چار رخانہ کہتے ہیں اور جو قسم شعر سے ہے اُس کو صرف مسمط کہتے ہیں۔ پس مسمط یعنی شاعر کسی بیت کے قوافی اصلی کی بنا پر چند مصاریع متفق الوزن و قافیہ پر رکھے اور قافیہ اصلی بیت کا مخالف مصاریع متقدم کے ہو اور وہ بیت مطلع ہوگی یا غیر مطلع پس جن بندوں میں مصاریع متقدم مع بیت اصلی موافق ہوں گے اور وہ بیت مطلع ہوگی تو مصاریع متقدم ہم قافیہ ہوں گے ساتھ اس بیت مطلع کے ۔ اور جو بیت غیر مطلع ہوگی بندہائے دیگر میں تو مصاریع متقدم ہم قافیہ ہوں گے بیت اصلی کے پہلے مصرعہ کے اور قافیہ مصراع آخر بیت اصلی کا ہر بند میں متفق بقافیہ بند اول ہوگا اور مخالف اپنے مصاریع متقدم سے اور جن بندوں میں مصاریع متقدم مع بیت اصلی مختلف ہوں گی تو مصاریع متقدم

۵۴ مقیاس الاشعار صفحہ ۲۶

قافیہ ہوں گی اور بیت اصل کے قافیہ مختلف ہوں گے مصاریع مقدم سے لیکن کبھی متفق بھی ہوتے ہیں، حالت تسدیس میں حالانکہ وہ مصاریع زیع بیتِ اصلی جفت ہوتے ہیں اور حالت مربع و مثلث کا مثل مصاریع طاق کے ہے بلحاظ مطلع و غیر مطلع فافہم پس مسمط کی آٹھ قسمیں ہیں اور یہ مصاریع مسمط تین سے کم اور دس سے زیادہ نہیں ہوتے معشر، متسع، مسبع، مسدس، مخمس، مربع، مثلث۔ سلہ

سلام

(از مرزا محمد صادق صاحب صادق خلف رشید صاحب اعلی اللہ مقامہ)

جب بہار آئی تو گلشن میں خزاں بھی آئی   قافلہ گل کا لئے بادِ صبا بھی آئی
تھا عجب وصل علی ثانی احمد کا جمال   دیکھنے حسن جوانی کا قضا بھی آئی
حرملہ سے یہ کہا شاہ نے کیوں مارا تیر   کچھ ترے ذہن میں بچے کی خطا بھی آئی
روضۂ شاہ پہ جنت کی ہوا بھی آئی   مجرئی نکہتِ خونِ شہدا بھی آئی
سرِ اکبر پہ شہادت نے تو سہرا باندھا   تھے جو بن بیاہے دلہن بن کے قضا بھی آئی
کہتی ہے رحمتِ حق بارشِ اشکِ غم سے   جا کے میں آگ جہنم کی بجھا بھی آئی
اپنا آئینۂ دل صاف رہا اے صادق   خود نمائی کی کدورت نہ ذرا بھی آئی

سلہ مقیاس الاشعار صفحہ ۲۸-۲۹

کاظم علی خاں

مرزا دبیر کے بعض نادر قلمی آثار

یہ مقالہ ماہنامہ آج کل دہلی ستمبر ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اب اس کو بعض اضافوں کے ساتھ سرفراز کے دبیر نمبر میں شامل کیا جا رہا ہے ـــــ کاظم علی خاں

مشہور مرثیہ نگار مرزا سلامت علی دبیر (متوفی ۳۰ محرم ۱۲۹۲ ہجری مطابق ۹ مارچ ۱۸۷۵ء) کے منظوم و منثور تخلیقات کی ایک بڑی تعداد شائع ہو کر منصۂ شہود پر آ چکی ہے لیکن اس کے باوجود دبیر کے قلمی آثار میں ابھی متعدد ایسے نوادر بھی موجود ہیں جو منظرِ عام پر آنے سے محروم رہے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں مرزا دبیر کے بعض ایسے قلمی آثار پیش کیے جاتے ہیں جو راقم الحروف کی نظر سے مطبوعہ صورت میں نہیں گزرے ہیں اور جن کے غیر مطبوعہ ہونے کا قوی امکان ہے۔ اس مضمون میں دبیر کے قلمی آثار کے علاوہ دو ایسے فارسی خط بھی شامل ہیں دبیر جن کے کاتب تو نہیں البتہ مکتوب الیہ ضرور ہیں۔

(۱) مرزا دبیر کی ایک غیر معروف غزل

مرزا دبیر صنفِ اول کے مرثیہ نگار تھے لیکن اُن کے قلمی آثار میں مرثیے کے علاوہ بعض دوسرے اصنافِ سخن کے بھی نمونے ملتے ہیں جن میں صنفِ غزل شامل ہے۔ دبیر کے سوانح نگار اس بات پر متفق ہیں کہ مشقِ سخن کے ابتدائی دور میں مرزا صاحب نے کثرت سے غزلیں کہی تھیں مگر کچھ عرصہ بعد اُنھوں نے غزل گوئی ترک کر دی اور اپنی غزلوں کو شہرت نہ دی۔ مرزا دبیر کی غزلیں اُن کے ایامِ شباب کی یادگار ہیں بعض تذکروں اور کتابوں میں مرزا صاحب کی محض چند مطبوعہ غزلیں ہی ملتی ہیں جو دبیر کے غزلیہ کلام کی کم یابی کی مظہر ہیں اور جن پر راقم السطور اپنے ایک طویل تحقیقی مضمون "مرزا دبیر کی غزل گوئی" میں مفصل بحث کر چکا ہے۔ ان مطبوعہ غزلوں کے علاوہ ایک قدیم قلمی بیاض میں مجھے مرزا دبیر کی ایک ایسی غزل بھی ملی ہے جو میری نظر سے مطبوعہ شکل میں نہیں گزری ہے۔ عجب نہیں کہ یہ غزل مرزا صاحب کے غیر مطبوعہ قلمی آثار کی حیثیت رکھتی ہو۔ مرزا دبیر کی نو دریافت غزل ذیل میں پیش کی جاتی ہے:-

مرزا دبیر کی نو دریافت غزل

تل نمایاں نہیں ہے عارضِ جاناں کے تلے
ہے ستارا کہیں روشن مہِ تاباں کے تلے

کیا ہی بے چین ہوئے نالۂ بلبل سُن کر
ٹھہرے اک دم جو کسی نخلِ گلستاں کے تلے

چاک سینہ کو مرے دیکھ کے ناصح بولا
لاکھوں ہی داغ ہیں یاں تیرے گریباں کے تلے

ہم تو چُھپنے کے نہیں ہمدمو اس دم سے آہ

اب تو دل چاہے بھنسا زلفِ پریشاں کے تلے
ہاتھ چھاتی پہ مری رکھ کے یہ عکس نے کہا
دل نہیں آگ ہے یاں سینۂ سوزاں کے تلے
اس کو مت برق سمجھ، یہ جو فلک پر ہے چمک
ہے دبیر آہ تری گردشِ دوراں کے تلے

دبیر کی یہ غزل مجھے ایک قدیم قلمی بیاض میں ملی ہے جس کا نام "غزلیات (انتخاب از متفرق شعراء)": سلیمان قدر ہے۔ مذکورہ بیاض کا قلمی نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی ٹیگور لائبریری میں [نمبر G 592 / 891.43181 Ra کے تحت] موجود ہے۔ اس مخطوطے کے اوراق کی تعداد ۱۷۳ ہے اور عام طور پر اوراق کے دونوں رخ مختلف شعراء کی غزلیں درج ہیں۔ اس طرح مخطوطہ ۲ × ۱۷۳ = ۳۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ نسخے میں کاتب کا نام، سنہ کتابت اور ترقیمہ موجود نہیں۔ مرزا دبیر کی محولہ بالا غزل بیاض کے اوراق ۱۷۱/۱۷۰ پر درج ملتی ہے۔ اس قلمی نسخے میں متعدد دوسرے شاعروں کا کلام بھی موجود ہے جن میں مندرجہ ذیل شعراء شامل ہیں:-

(۱) میر (۲) مصحفی (۳) لطف (۴) نظیر (۵) آباد
(۶) ترقی (۷) سلیمان وغیرہ وغیرہ

(۲) مرزا دبیر کا ایک غیر معروف مرثیہ

ریاست محمود آباد اتر پردیش کے نادر الوجود کتب خانے میں مرزا دبیر کے ایک ایسے مرثیے کا قدیم قلمی نسخہ موجود ہے جو مطبوعہ صورت میں میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ اس قلمی نسخے کے بارے میں ضروری تفصیلات ذیل میں درج ہیں:-

(۱) مرثیہ کا مطلع: اے خالقِ سبحان تو مری عقل رسا کر
(۲) مرثیے کا مقطع: مقدور دبیر آگے زباں کو نہیں اصلا
(۳) تعداد بند: ایک سو چھ (۱۰۶)
(۴) کاتب کا نام: فضل علی۔
(۵) زمانۂ کتابت: ربیع الاول ۱۲۶۲ ہجری

مرزا دبیر کا متذکرہ بالا مرثیہ رسولِ مقبول حضرت محمد مصطفیٰ کی بیٹی صدیقۂ طاہرہ حضرت فاطمہ زہرا کے حال میں ہے۔ مرثیے کے ابتدائی دو بند ذیل میں ملاحظہ ہوں:-

اے خالقِ سبحان تو مری عقل رسا کر
اے عالمِ پنہاں مجھے الہام عطا کر
اے صیقلِ ایماں تو مرے دل کو جلا کر
اے سرمۂ عرفاں مری آنکھوں کی ضیا کر
منظور نظر منقبتِ زہرا کی ثنا ہے
جس پر دو گواہ ایک نبی ایک خدا ہے

عصمت کا اشارہ ہے زباں سے کبھی نہ لے نام
عفت کا تقاضا ہے قلم سے نہ کر ارقام
اس مدح کے آغاز کا پھر کیوں کر ہو انجام
اب خالقِ اکبر کی طرف سے یہ ہے الہام
اس نام کو تو عرش پہ قائم نے لکھا ہے
خالق نے لکھا اور فرشتوں نے پڑھا ہے

اس مرثیے کا آخری بند ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

اب فاطمہ کے ذہن کا احوال کہوں کیا
اب سوئے بقیعہ ہوں بس اس طرح سے گویا
مقدور دبیر آگے زباں کو نہیں اصلا
یا فاطمہ یا سیدہ یا حضرتِ زہرا
پابند کر منصور ترا نام ہے سب جا
اب کیجئے نصرت مری اندوہ و تعب میں

زیر تبصرہ مخطوطے کے بارے میں مختصراً یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ اس کی کتابت چونکہ ۱۲۶۲ ہجری میں ہوئی ہے اس لحاظ سے یہ نہ صرف قدیم ہے، بلکہ دبیر (متوفی ۱۲۹۲ ہجری) کا معاصر قلمی نسخہ ہونے کا شرف رکھتا ہے۔ مخطوطہ مجلد ہے اور قدامت کے باوجود اچھی حالت میں ہے۔ اس میں مرثیہ

یعنی آٹھ اوراق یا سولہ صفحات ہیں۔ مرثیہ سرورق کی پشت (ص ۲) سے شروع ہو کر ورق نمبر آٹھ یا صفحہ نمبر پندرہ پر ختم ہوتا ہے۔ ورق نمبر آٹھ کی پشت یعنی صفحہ نمبر ۱۶ سادہ ہے۔ ورق نمبر ۱ تا سات کے دونوں جانب مرثیہ تحریر ہے۔ میں جناب امیر حیدر خاں صاحب مہاراج کمار ریاست محمودآباد کا انتہائی ممنون و متشکر ہوں کہ موصوف نے نہ صرف مرثیے کے بعض اجزا نقل کرنے کی اجازت دی بلکہ مخطوطے اور مرثیے کو ادبی حلقوں سے متعارف کرانے میں بھی پس و پیش نہ فرمایا۔ مرزا دبیر کے اس مرثیہ کا غیر مطبوعہ ہونا خارج از امکان نہیں۔

(۳) مرزا دبیر کا ایک غیر معروف فارسی قطعۂ تاریخ

کٹرہ ابوتراب خاں لکھنؤ کا ایک قدیم اور مشہور محلہ ہے جہاں خان علامہ نواب تفضل حسین خاں (متوفی ۱۵ شوال ۱۲۱۵ ہجری مطابق یکم مارچ ۱۸۰۱ء) کے فرزند نواب تجمل حسین خاں مرحوم کے نام سے موسوم ایک قدیم امامباڑہ ہے۔ اس عزاخانے کے مشرقی دالان کی جنوبی دیوار میں نصب سنگ مرمر کی ایک پرانی لوح پر راقم السطور کو مرزا دبیر کا ایک فارسی قطعۂ تاریخ کندہ نظر آیا۔ یہ سنگی لوح عرصے سے سفیدی کی تہوں میں دبی ہوئی تھی۔ خانوادۂ میر انیس کی ایک فرد میر ہادی صاحب لائق کی توجہ دہانی پر ۳۰ نومبر ۱۹۷۵ء کو عزاخانہ مذکور جا کر راقم الحروف نے جب چونے کی تہوں کو کھرچا تو دیوار میں نصب سنگ مرمر کی لوح نظر آئی۔ اس لوح پر مرزا سلامت علی دبیر کا جو فارسی قطعہ کندہ ہے وہ خان علامہ نواب تفضل حسین خاں کے خاندان کی ایک فرد نواب ارتضیٰ حسین خاں کے سنہ وفات سے متعلق ہے اور سنگی لوح کے جملہ مندرجات کے ساتھ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰

۷۸۶

یا غفار　تاریخ اوج فکر مرزا دبیر مدظلہ　یا ستار

بیست و پنجم و یک شنبہ از جمادی دوم
چو شد کہ زلزلہ افگند بانگ شیون شین
مگر بہ خاک نہاں گشت ماہ برج کمال
کہ بود مطلع مہر امیر بدر حنین
جناب خان بہادر رئیس اعظم ہند
فلک شکوہ، زمیں زیب، رونق کونین
قدر بہ کلک قضا ارتضیٰ حسین نوشت
خطاب عالی او با ہزار زینت و زین
ملک بسال وفاتش بگفت با دل صاف
"بقصر عالی جناں شد ندیم بزم حسین"

۱۲۹۱ ہجری

یہ قطعۂ تاریخ قطعی طور پر ارتضیٰ حسین خاں کی وفات یعنی ۲۵ جمادی الثانی ۱۲۹۱ ہجری کے بعد کہا گیا ہے اور چونکہ خود مرزا دبیر کی تاریخ رحلت ۳۰ محرم ۱۲۹۲ ہجری ہے لہٰذا یہ قطعۂ تاریخ یقینی طور پر دبیر نے اپنی وفات سے محض چند ماہ قبل کہا ہے۔ گویا اس فارسی قطعۂ تاریخ کو مرزا دبیر کی عمر کے آخری دور کا کلام ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مرزا دبیر کے مجموعۂ کلام دفتر ماتم کی بیسوں جلدوں میں مرزا صاحب کا متفرق کلام شائع ہوا ہے۔ دفتر ماتم کی اس بیسویں جلد میں مسجد عظیم آباد کے متعلق دبیر کا ایک فارسی قطعۂ تاریخ ضرور ملتا ہے[۶] مگر مندرجہ بالا قطعۂ تاریخ موجود نہیں۔ تلاش کے باوجود دبیر کا مندرجہ بالا قطعۂ تاریخ مجھے مطبوعہ شکل میں کہیں نہیں مل سکا ہے۔ عجب نہیں کہ یہ دبیر کا غیر مطبوعہ کلام ہو۔

دبیر کے محولہ قطعۂ تاریخ کے برابر تجمل حسین خاں کے عزاخانے میں مجھے بعض اور بھی شعرا کے قطعات تاریخ سنگی لوحوں پر کندہ ملے ہیں جن میں میر نفیس کا ایک فارسی

قطعۂ تاریخ بھی شامل ہے۔ میر نفیس (فرزند و جانشین میر انیس مرحوم) کے مذکورہ قطعۂ تاریخ کا پہلا اور آخری شعر ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

خانی کہ ذوالاقتدار و شرف ارتضیٰ حسین
محبت دل جناب تفضل حسین خاں

....

تاریخ سال فوت نفیس حزیں نوشت
زاہد جو او رفت سوے گلشن جناں

۱۲۹۱ ہجری

میر نفیس کے اس قطعۂ تاریخ کے غیر مطبوعہ ہونے کا قوی امکان ہے۔ نفیس کے مقطع کے پہلے مصرعے میں اپنے تخلص کے ساتھ لفظ "حزیں" درج کیا ہے۔ ملحوظ رہے کہ میر انیس کا قدیم تخلص حزیں تھا۔ عجب نہیں کہ لفظ "حزیں" کے تصرف میں میر نفیس نے اپنے والد میر انیس کے اسی قدیم تخلص کی رعایت ملحوظ رکھی ہو۔ یہاں یہ عرض کرنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ نواب ارتضیٰ حسین خاں کی وفات پر مرزا دبیر اور میر نفیس کے قطعات تاریخ اس امر کے مظہر ہیں کہ خانِ علامہ کے خانوادے سے میر انیس اور مرزا دبیر دونوں ہی کے خاندانوں کے قریبی تعلقات رہے ہیں اور اس بات پر خانِ علامہ کے خاندان کے ایک رکن کی حیثیت سے مجھے فخر کا حق حاصل ہے۔

(۴) دبیر کا ایک فارسی مکتوب اور دبیر کے نام ایک فارسی خط

دبیر کے متعدد فارسی مکاتیب شائع ہو چکے ہیں اور راقم کی نظر سے گزرے ہیں مگر راقم الحروف کو مرزا دبیر کا ایک ایسا فارسی خط بھی ملا ہے جس کے غیر مطبوعہ ہونے کا قوی امکان ہے۔ یہ خط خود دبیر ہی کی تحریر میں ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس خط کے مکتوب الیہ مولوی کمال الدین کا خط بھی موجود ہے جو دبیر کے نام ہے۔ یہ دونوں خطوط ایک ہی کاغذ پر لکھے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں خطوط مجھے اپنے کرم فرما برادرم سید باسط حسن صاحب ماہر لکھنوی سے ملے ہیں اور میں اُن کے لئے موصوف کا انتہائی ممنون و متشکر ہوں۔ ذیل میں مکتوب دبیر بہ خطِ دبیر کا عکس اور اس فارسی مکتوب کا اردو مفہوم پیش کیا جاتا ہے۔

عکسِ مکتوب دبیر بہ خطِ دبیر

جناب مولوی صاحب عنایت فرمای من دام مجدکم

بعد سلام خلوص انضمام ملتمس است که چون راکبی احقر العباد
سمت عظیم آباد قریب است و طبع رسالہ مذکور بہر حال درین
منجملہ احباب نہایت ضرور است سلام دلوان وغیرہ
علی شعرے کمال احسان برای من است اگر آنجا خواہد کرد

یازدہم عرضہ دہم　　داعی بوس و دعا
دبیر عفی عنہ

دبیر کے فارسی خط کا اُردو مفہوم

جناب مولوی صاحب عنایت فرمائے من دام مجدکم
بعد سلام خلوص انضمام التماس ہے کہ میرے عظیم آباد

جانے کے وقت ہی رسالۂ مذکور کی ترتیب طبع نہایت ضروری ہے لہذا رسالۂ مذکور مع دیوان وغیرہ عنایت ہو تو اس مشت استخوان پر بہت احسان ہوگا۔ زیادہ کیا تحریر کیجیے۔

(دستخط) "دبیر عفی عنہ"

دبیر کے محولۂ بالا خط کے مکتوب الیہ مولوی کمال الدین نے دبیر کو جو فارسی خط لکھا ہے اُس کا عکس (بہ خط کمال الدین) ذیل میں ملاحظہ ہو:۔

عکسِ مکتوب مولوی کمال الدین بہ نام دبیر

دام اقبالکم و مد ظلکم العالی

بعد تسلیم عرض می نماید کہ امروز بسبب بعض حرجہا

کہ نہایت اہم است معاف باشم از روز دیگر جزو

ہر روزہ صاف نمودہ بہ رسانم انشاء اللہ تعالیٰ بلکہ

از پرسوں برائے طبع کاپی وغیرہ ارشاد شود

صحیح کمال الدین

مولوی کمال الدین کے مکتوب کا اُردو مفہوم

دام اقبالکم و مد ظلکم

بعد تسلیم عرض ہے کہ آج بسبب بعض ضروریات کے جو نہایت اہم ہیں معاف رکھا جاؤں۔ کل سے روزانہ ایک جزو صاف کرکے انشاء اللہ تعالیٰ روانہ کردوں گا بلکہ پرسوں سے طباعت اور کاپی وغیرہ کے لیے ارشاد ہو . . .

(دستخط) "کمال الدین"

مندرجۂ بالا دونوں مکاتیب تاریخ تحریر سے محروم ہیں مگر مرزا دبیر نے اپنے خط میں عظیم آباد جانے کا ذکر کیا ہے۔ مرزا صاحب کے سوانحی حالات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہی سے دبیر نے سال بہ سال عظیم آباد سفر کرنا شروع کیا تھا[۴] ان امور کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں خطوط ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد لکھے گئے تھے۔ دبیر کے خط میں جس رسالے اور دیوان وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے اُس کے بارے میں ابھی تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ دبیر کے خط کے مکتوب الیہ مولوی کمال الدین ہیں۔ افضل حسین ثابت نے بھی ایک بزرگ مولوی کمال الدین کا ذکر کیا ہے جو لکھنؤ کے مشہور عالموں میں تھے اور دبیر کے فرزند مرزا محمد جعفر اوج کے معلم تھے[۵] ہوسکتا ہے کہ دبیر کا محولۂ بالا مکتوب انھیں مولوی کمال الدین کے نام ہو اور دوسرے خط (بہ نام دبیر) کے کاتب یہی مولوی کمال الدین ہوں۔

(۵) میر ضمیر کا ایک فارسی خط اپنے شاگرد مرزا دبیر کے نام

دبیر کے اُستاد میر مظفر حسین ضمیر کے سوانحی حالات کے بارے میں اُردو تحقیق ابھی جن منزلوں سے گزری ہے اُن کے نقوش ہمارے پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی۔ لٹ کے بعض تحقیقی مقالوں میں دیکھے جاسکتے ہیں اور اُن کی مدد سے ہمیں بہ خوبی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ضمیر کے بارے میں اُردو تحقیق کی سمت و رفتار کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں۔ راقم الحروف

کو میر ضمیر کا ایک فارسی مکتوب ملا ہے جس کے مکتوب الیہ ضمیر کے شاگرد رشید مرزا دبیر ہیں۔ سطورِ ذیل میں دبیر کے نام اُن کے اُستاذ میر ضمیر کا فارسی مکتوب اور اُس کا اردو مفہوم پیش کیا جاتا ہے۔

دبیر کے نام اُن کے اُستاذ میر ضمیر کا فارسی خط

برہانِ من، استادِ من، اعتقادِ من، اعتمادِ من سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد اشتیاقِ دیدار فرحت آثار واضح و لایح باد کہ از پنج روز زرم کلر تابہ ذقن و حرارتِ تپ و شدائد جاع (کذا؟ وجاع) بحدی دارم کہ قابلِ تحریر نیست۔ بعد الملاقات مشاہدہ خواہند نمود۔ چوں کہ تاریخ بست و سوم از کردۂ آں عزیز باتمیز است درآں تخالف نخواہد شد۔ ہماں وقت تحصیل ثواب نمایند و لیم الجمعہ از عدمِ ملاقات تا سفہا خوردم۔ سلامی علیکم و قلبی لدیکم۔

رقیمہ ضمیر عفی عنہ[۹]

دبیر کے نام ضمیر کے خط کا اُردو مفہوم

میری دلیل، میری سند، میرے قوتِ بازو اور میرے اعتماد سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد اشتیاقِ دیدار فرحت آثار واضح ہو کہ پانچ روز سے گلے کا ورم ٹھوڑی تک پہنچ گیا ہے اور بخار کی شدت اور درد کے تکالیف اس حد تک ہیں کہ قابلِ تحریر نہیں۔ ملاقات کے وقت آپ خود ہی ملاحظہ کرلیں گے۔ چوں کہ ۲۳ ر تاریخ آپ ہی کی مقرر کردہ ہے لہٰذا اب اُس میں کوئی رد و بدل نہ ہوگا اور اسی وقت ثواب حاصل کرلیں۔ جمعہ کے دن ملاقات نہ ہونے سے بہت صدمہ ہوا۔ سلامی علیکم و قلبی لدیکم

رقیمہ ضمیر عفی عنہ

میر ضمیر کے اس خط پر تاریخ تحریر درج نہیں لیکن خط کے مندرجات بتاتے ہیں کہ یہ خط ضمیر نے اپنی علالت کے دوران میں لکھا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خط ضمیر نے اپنے آخری زمانے میں لکھا ہو۔ میر ضمیر کا سنہ وفات ۱۲۷۲ ہجری مطابق ۱۸۵۵ء متعین کیا گیا ہے[۱۰] اس لحاظ سے یہ خط ۱۸۵۵ء یا اس سے قبل لکھا جا چکا تھا۔

میر ضمیر کا یہ خط کئی اعتبار سے اہم قرار دیا جائے گا۔ اول تو یہ خط میر ضمیر کی اُس فارسی نثر کا نمونہ ہے جس کے بارے میں ہمارے پاس مواد کی قلت ہے۔ دوسرے یہ خط میر ضمیر کے بعض امراض کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ خط ضمیر اور دبیر یعنی اُستاد اور شاگرد کے باہمی تعلقات پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر اس خط کی اہمیت ضمیر اور دبیر دونوں ہی کے مطالعے کے لئے مسلم ہے۔ میر ضمیر کا فارسی مکتوب ڈاکٹر اکبر حیدری کی کتاب میر ضمیر (تحقیقی مطالعہ) مطبوعہ ۱۹۷۲ء پر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

حواشی

[۱] تفصیل کے لئے راقم الحروف کا مضمون "مرزا دبیر کے مجموعۂ کلام دفتر ماتم کی بیس جلدیں" مشمولہ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ مارچ ۱۹۷۶ء (ص ۱۰، نیز ص ۱۶) ملاحظہ ہو۔ کاظم علی خاں۔

[۲] ر ک: (الف) حیاتِ دبیر جلد اول: سید افضل حسین ثابت لکھنوی۔ سیوک اسٹیم پریس۔ لاہور۔ ۱۹۱۳ء ص ص ۸۵/۸۶ (ڈاکٹر اکبر حیدری کی کتاب تحقیقی نوادر۔ اردو پبلشرز لکھنؤ ستمبر ۱۹۷۴ء (ص ۳۰۱) میں حیاتِ دبیر کا سنہ اشاعت ۱۹۱۲ء درج ملتا ہے جو درست نہیں۔ کاظم علی خاں)

(ب) تذکرہ بلیغ: مؤلفہ شاد عظیم آبادی۔ مرتبہ نقی احمد ارشاد۔ نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ۔ اگست ۱۹۷۴ء ص ۱۹۶۔

(ج) سلک مشاقی مرتبہ سید سرفراز حسین خبیر لکھنوی ممتاز بک ایجنسی۔ لکھنؤ ۱۳۴۹ ہجری (تعارفی تحریر از ثابت لکھنوی) ص ۲۳۔

(د) مرزا دبیر سوانح و کلام تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ۔ ڈی : ڈاکٹر مظفر حسن ملک [(قلمی نسخہ) مملوکہ کتب خانہ سید مسعود حسن ادیب ۔ لکھنؤ] اوراق ۵ و ۳۱۔۵
سے محمد مرزا ابو تراب خاں، لکھنؤ کا ذکر مرزا رجب علی بیگ سرور نے اپنی مشہور کتاب فسانۂ عجائب (تالیف ۱۲۴۰ ہجری مطابق ۱۸۲۴ء) میں کیا ہے جو اس محلے کی ندامت پر دال ہے (ر۔ک۔ فسانۂ عجائب : رجب علی بیگ سرور، مرتبہ اطہر پرویز۔ سنگم پبلشرز۔ الہ آباد جون ۱۹۶۹ء ص ۱۰۸) ۔
ہے ر۔ک۔ تاریخ آصفی : ترجمہ و ترتیب ڈاکٹر ثروت علی ادارۂ صبح ادب، دہلی ۱۹۶۸ء ص ۲۶ (فٹ نوٹ نمبر ۲) راقم خانِ علامہ نواب تفضل حسین خاں کے خانوادے کا ایک رکن ہے اور خانِ علامہ کے خاندان کو ملنے والی پنشن کے تحت حکومت سے کچھ ماہانہ رقم پاتا ہے ۔
ھ دفتر ماتم جلد ۲۰ : مرزا سلامت علی دبیر مطبع دبدبۂ احمدی، لکھنؤ ۱۸۹۷ء ص ۲۸۸ ۔
ھ بحوالہ واقعات انیس : مؤلفہ مہدی حسن احسن لکھنوی ۔ اصح المطابع ۔ لکھنؤ ۔ طبع اول ، سن اشاعت ندارد ، ص ۲۸
ھ ر۔ک۔ حیات دبیر جلد اول : سید افضل حسین ثابت لکھنوی۔ سیلوک اسٹیم پریس۔ لاہور ۱۹۱۳ء ص ۱۰۰ نیز ص ۱۰۲ ۔
ھ حیات دبیر جلد اول : ثابت لکھنوی۔ لاہور ۱۹۱۳ء (باب ۴) ص ۹۱۔
ھ بحوالہ فارسی کتاب شمس الضحیٰ : مصنفہ مولوی صفدر حسین مطبع اثنا عشری (لکھنؤ ۱۲۹۸ ہجری) ص ص ۱۹۵ / ۱۹۴ ملحوظ رہے کہ یہ فارسی کتاب اب کمیاب ہے ۔ راقم الحروف نے اس کا ایک بوسیدہ نسخہ مرزا دبیر کے حقیقی پرپوتے جناب مرزا محمد صادق صاحب صادق لکھنوی کے پاس دیکھا ہے میں اس خط کے لئے موصوف کا شکر گزار ہوں ۔
کاظم علی خاں ۔
ھ ر۔ک۔ اردو مرثیے کا ارتقاء : ڈاکٹر مسیح الزماں کتاب نگر۔ لکھنؤ ۱۹۶۸ء۔ ص ۲۴۹

مضمون نگار کا پتہ :
کاظم علی خاں (ریسرچ اسکالر)
۱۲۱ ۔ وکٹوریا اسٹریٹ ۔ لکھنؤ ۔ ۲۲۶۰۰۳

نامِ حسینؑ

"ح" نام میں ہے حق کی حمایت کے لئے
اور "سین" ہے سائل سے سخاوت کے لئے
ہیں نامِ حسینؑ میں بھی کیا خوب حروف
"ی" "نون" ہے تاریخِ شہادت کے لئے

مدحِ امامِ حسینؑ

محتاجوں کو اغنیاء نے زر بخشا ہے
درماندوں کے آرام کو گھر بخشا ہے
احمدؐ کے نواسے کی سخاوت دیکھو
دشمن کو رہِ دوست میں سر بخشا ہے

ڈاکٹر سید نیر مسعود

مرزا دبیر کے مرثیے پر میر ضمیر[1] کی اصلاحیں

والد مرحوم پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب صاحب کے ذخیرۂ مراثی میں شکستہ کاغذ پر لکھے ہوئے آٹھ صفحے ہیں جن پر مرحوم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی مندرجۂ ذیل یادداشت ہے :-

مرثیۂ دبیر
جب خانۂ زنداں میں سکینہ نے قضا کی

اس مرثیے پر بہ کثرت اصلاحیں دی گئی ہیں۔ ظن غالب ہے کہ یہ
مرثیہ مرزا دبیر کا لکھا ہوا اور اصلاحیں میر ضمیر کے قلم سے ہیں۔
مرثیہ دوسرے صفحے سے شروع ہو کر آٹھویں صفحے تک چلا گیا ہے اور
اس کے آخری بند پہلے صفحے پر ہیں۔ اصلاح کے ساتھ ساتھ بندوں کی
ترتیب میں بہت تبدیلیاں کر دی گئی ہیں۔

سید مسعود حسن رضوی

یہ مرثیہ اٹھتر بندوں پر مشتمل ہے اور ان کی [illegible] مسلسل نہیں ہے اس لئے اس پر بعض بندوں کے نمبر ۲، ۴۲، ۴۷ اور ۷۵ بھی پڑے ہیں۔ مرثیہ سیاہ روشنائی سے لکھا ہوا ہے۔ اصلاحیں بھی سیاہ روشنائی سے ہیں۔ لیکن مرثیے کا عنوان "مرثیۂ دبیر سلمہ اللہ تعالیٰ در ذکر وفات سکینہ" سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ بندوں پر نمبر باریک قلم اور سیاہ روشنائی سے ڈالے گئے ہیں مگر بعض بندوں پر سرخ روشنائی سے بھی نمبر پڑے ہیں اور بعض پر سرخ روشنائی سے دو نمبر پڑے ہیں مثلاً ۳/۳۶ [illegible] یا ۳۲/۴۵۔ بظاہر یہ نمبر بندوں کی مجوزہ ترتیب کی نشان دہی کرتے ہیں۔

متن میں املا کی بعض غلطیاں بھی ہیں۔ مثلاً "عطرت" بجائے "عترت"، "ترحم" بجائے "ترحم"، "ننا" بجائے "ثنا"، "تغیر" بجائے "تغیر" اور "خوف و خطر" بجائے "خوف و خطر" اور ان غلطیوں کی اصلاح نہیں کی گئی ہے۔

اس مرثیے کو بخط مرزا دبیر اور ان اصلاحوں کو ضمیر کے قلم سے ضمیر کی دی ہوئی اصلاحیں سمجھنے کا کوئی

[1] استاد مرزا دبیر

حتمی قرینہ موجود نہیں لیکن جیسا کہ ادیب مرحوم نے لکھا ہے ظنِ غالب یہی ہے کہ یہ مرثیہ مرزا دبیر کا لکھا ہوا اور اصلاحیں میر ضمیر کے قلم سے ہیں۔

مرثیے کے عنوان میں " دبیر سلمہ اللہ تعالیٰ[1] کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ عنوان یقیناً مرزا دبیر نے خود نہیں لکھا، اور چونکہ بعض بندوں کے تبدیل شدہ نمبروں کی طرح یہ عنوان بھی سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے اس لئے اس کا بھی بہ خطِ ضمیر ہونا قرینِ قیاس ہے۔

ذیل میں اس مرثیے کے متفرق بند پیش کئے جاتے ہیں جن میں اصلاح کی گئی ہے۔

نیر مسعود

"مرثیہ دبیر سلمہ اللہ تعالیٰ در ذکرِ رفقا سکینہ"

جب خانۂ زنداں میں سکینہؑ نے قضا کی
یعنی سرِ شبیرؑ پہ جاں اُس نے فدا کی
رو کر کہا بانو نے کہ فریاد خدا کی
(اے جان مری بیٹی امام دوسرا کی) اصلاح : " افسوس نشانی مٹی شاہِ شہدا کی"
مقتل میں تو اکبرؑ سے اور اصغرؑ سے چھٹی میں
زنداں میں اس لاڈلی دختر سے چھٹی میں

اس وقت نظر آتی ہے دنیا مجھے ویراں
اب موت جو آجائے تو نکلے مرا ارماں
ہیں رن میں حسینؑ اکبرؑ و اصغرؑ کے نگہباں
(یہاں قبرِ سکینہ کا نہ پہلو رہے سنساں) اصلاح : " سب لوگ کہیں بیٹی پہ مادر ہوئی قرباں"
فرزند تو ہیں شاہِ مدینہ کے برابر
بانو کی دو نہیں، قبر سکینہؑ کے برابر اصلاح : "بنے"

حاکم نے ہمیں قید کیا ہے سرِ بازار
جو چاہو سو کہہ لو ہمیں سب کچھ ہے سزاوار

---

[1] " سلمہ اللہ تعالیٰ " کے الفاظ سے یہ یقین نہ کر لینا چاہئے کہ ان کا لکھنے والا عمر میں مرزا دبیر سے بڑا ہوگا۔ یہ الفاظ چھوٹوں کے لئے اب مخصوص ہوئے ہیں، پہلے اپنے سے بڑوں کو بھی " سلمہ اللہ تعالیٰ " لکھا جاتا تھا۔ (نیر مسعود)

تم ہو گئے گنہ گار (ہو گئے جا گنہگار)
(قرآں میں ہمیں حق نے کیا) عترت اطہار
احوال پہ سادات کے (؟) نہ کرو تم
ہم سے نہ ڈرو قہر الٰہی سے ڈرو تم

اصلاح : "جو سمجھو گے"
اصلاح : "کونین پہ روشن ہے کہ ہیں"

ہر چند کہ ہوں ایک ردا کے لئے محتاج
پر سر پہ مرے آیۂ تطہیر کا ہے تاج
یہ خاک نشینی ہے ہمارے لئے معراج
(ہم حشر کے مختار ہیں محتاج ہیں) گو آج
قرآں میں دیکھو کہ زباں ہے وہ خدا کی
ہر آیہ میں اُس کی ہے ثنا آلِ عبا کی

اصلاح : "مختار ہیں ہم حشر کے ناچار ہیں..."

پھر شمر نے بازوئے سکینہ کو جو پکڑا
(ماں پھپھیوں کو بے کس نے عجب یاس سے دیکھا
سب قیدیوں میں ایک قیامت ہوئی برپا
سجاد کے قدموں پہ مچل کر گری دُکھیا
یوں بیٹھی تھی بھائی سے وہ اس خوف و خطر میں
اک ہاتھ تو گردن میں تھا اک ہاتھ کمر میں

اصلاح : "کُنبے کی طرف اُس نے"

جس طرح کہے تو تجھے سب لوگ سلا دیں
تو نازوں کی پالی ہے ترا ناز اُٹھا دیں
(منظور ہے تو فرش ہم آنکھوں کا بچھا دیں)
وہ کہتی تھی میں سوؤں جو بابا مرے آئیں
اب خوف نہیں مجھ کو خیالِ شہِ دیں ہے
سب کچھ ہے مگر سینۂ شبیر نہیں ہے

اصلاح : "لوری دیں کہانی کہیں کاندھے سے لگا دیں"

سوئی نہ ذرا رات کہ بنتِ شہِ ذی جاہ
گزری جو وہ شب صبح نمودار ہوئی آہ
بھجوا دیا زندان میں حاکم نے سرِ شاہ

(جس) سر کے لئے چشم سکینہ تھی سرِ راہ
لیں پہلے بلائیں سرِ شاہِ شہدا کی
(سینے پہ تو سر رکھ دیا اور جان فدا کی)

اصلاح : "اُس"

اصلاح : "بے ساختہ بابا کہا اور جان فدا کی"

یہ (واقعہ) دیکھا حرمِ شاہ نے جس دم
(عاشورہ) کے دن سے بھی زیادہ ہوا ماتم
سر پیٹ کے فرماتی تھی (بانو یہ بصد غم)
کیا خوب ملا زخمِ جگر کا مرے مرہم
مقتل میں تو اکبرؑ سے اور اصغرؑ سے چھٹی میں
زندان میں اس لاڈلی دختر سے چھٹی میں

اصلاح : "حادثہ"
اصلاح : "عاشور"
اصلاح : "یہ بانوئے پُرغم"

(یہی بیت پہلے بند کی بھی ہے)

پھر بولی سکینہؑ کی وہ میت سے لپٹ کر
(اے بے کس و مظلوم پدر، عاشقِ مادر)
(تم مر گئیں زاری یہ خیال آیا نہ دل پر)
بانو تو ہے محتاج کفن دیوے گی کیونکر
پوچھے یہ کوئی زرد اسیروں کے جگر سے
ہم رو نہیں سکتے ہیں تمھیں شمر کے ڈر سے

اصلاح : "ہے ہے یہ تری مرگ یہ ناداری مادر"
اصلاح : تیسرے مصرع کو قلم زد کر کے چوتھے مصرع کو تیسرا قرار دیا ہے اور اس کے بعد اس چوتھے مصرع کا اضافہ کیا ہے۔ "نے غسل کو پانی ہے نہ تابوت میسّر"

عابدؑ سے ابھی کہتی تھی یہ بانوئے دلگیر
ناگاہ کہا فضّہ نے اے بانوئے شبیرؑ
مردے کے اٹھانے میں ہے اب (کون سی) تاخیر
رونا تو ہے تا عمر کرو دفن کی تدبیر
تیار ہو (باجی) درِ زندان تو کھلا ہے
تابوت بھی دروازے پہ چھوٹا سا دھرا ہے

اصلاح : "کس لئے"

اصلاح : "زنداں کا دروازہ بھی وا ہے"

یہ سنتے ہی (چلنے کو اٹھا عابدِ) دلگیر
گردن سے ہوا طوق جدا پاؤں سے زنجیر
صندوق میں مردے کو رکھا با دلِ تغیر
(تابوت کو لے کر جو چلی عترتِ شبیرؑ)

اصلاح : "اٹھنے جو لگے عابد"

اصلاح : "اور لے گئے جنازے کو . . ."

صدمہ ہوا اس طرح کا بانوئے حزیں پر
تابوت کے پیچھے گری غش کھا کے زمیں پر[1]

[1] مرزا دبیر کے مراثی کی جو مطبوعہ جلدیں میری دسترس میں ہیں اُن میں یہ مرثیہ موجود نہیں ہے۔ ضرورت اس کی تھی کہ اُن اصلاحوں کا مرثیے کی مطبوعہ صورت سے مقابلہ کیا جاتا۔ میں نے جناب کاظم علی خاں صاحب سے گزارش کی ہے کہ اگر اُن کو یہ مرثیہ مطبوعہ مل جائے تو براہِ مہربانی دونوں کا مقابلہ فرمائیں۔ (نیر مسعود)

نوحہ (بزبانِ جناب سکینہؑ) ـــــ دبیر اعلی اللہ مقامہ

کرتی تھی سکینہ یہ بیاں لاشۂ شہ پر، پیارے مرے بابا
بعد آپ کے کیا کیا نہ ستم ہو گئے مجھ پر پیارے مرے بابا

صدقے گئی بابا میں عجب ظلم ہوئے ہیں بیٹی پہ تمھاری
اب دکھ تو مرا سُن لو ذرا از پئے حیدر پیارے مرے بابا

تم جیتے جو ہوتے تو طمانچے نہیں کھاتی اور قید نہ ہوتی
تم ہوتے سلامت تو نہ چھنتے مرے گوہر پیارے مرے بابا

اس ننھی سی گردن میں رسن باندھی تھی بابا بے رحموں نے انتہیں
باندھا تھا مرے ہاتھوں کو بھی شمر نے کس کر پیارے مرے بابا

اُس روز سے دُر کھینچے مرے کان سے بابا جو کان ہیں زخمی
سر ننگے پھرایا مجھے بازاروں میں در در پیارے مرے بابا

رستے میں اگر دیکھ کے میں روتی تھی بابا سر نیزے پہ تیرا
ہر جا پہ گھُڑکتا تھا مجھے شمر ستمگر پیارے مرے بابا

بن باپ کا ہے مجھ کو کیا شمر لعیں نے اس چھوٹے سے سن میں
اللہ نہ بخشے اُسے تا عرصۂ محشر پیارے مرے بابا

اس طرح سے بے آس ہو فرزندوں سے اپنے یہ شمر جفا کار
جس طرح سے بے آس ہوئی تم سے یہ مضطر پیارے مرے بابا

کہلائیں اسی طرح سے بن باپ کے بچے اس شمر لعیں کے
جس طرح مجھے کہتے ہیں بن باپ کی دختر پیارے مرے بابا

کچھ دبیر کے تعلق سے

از کالیداس گپتا رضا

خواہرزادۂ غالب مرزا عباس بیگ معتقدِ دبیر

مرزا عباس بیگ کے بھتیجے نواب آغا مرزا بیگ (کارنامہ سروری ص ۵۱) کا بیان ہے کہ مرزا عباس بیگ ابھی پنجاب ہی میں تھے کہ انھوں نے برخلاف اپنے اہل خاندان کے اپنا مذہب تبدیل کر لیا یعنی وہ سنی سے شیعہ ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ ایک شب انھوں نے خواب دیکھا کہ ایک چھینکے میں ایک سر بریدہ رکھا ہوا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ تم اہل بیت سے محبت رکھو۔ سالہائے دراز کے بعد جب وہ پنجاب سے لکھنؤ آئے تو دبیر سے ملاقات ہوئی انھیں دیکھ کر مرزا کو فوراً یاد آ گیا کہ وہ سر بریدہ جو خواب میں انھوں نے چھینکے میں رکھا دیکھا تھا ہم شکل دبیر تھا اس کے بعد تمام عمر مرزا کٹر شیعہ رہے۔

سید افضل حسین ثابت (حیات دبیر ص ۳۸۹ و ۳۹۰) نے مرزا عباس بیگ کی دبیر سے گہری عقیدت کا ذکر کیا ہے بلکہ انھیں دبیر کا معتقد خاص لکھا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ وہ دبیر کے روبرو غالب کے اشعار پڑھا کرتے تھے اور دبیر حسب کو داد دیتے تھے اور کہ غالب اپنے خطوط بنام عباس بیگ میں دبیر کو سلام لکھا کرتے تھے اور ایک نہ ایک پھڑکتا ہوا فقرہ بطور پیام ضرور تحریر فرماتے تھے۔

دلگیر کی شاگردی

اودھ اخبار لکھنؤ نے ۱۰ مارچ ۱۸۷۵ء کو مرزا دبیر کے انتقال کی خبر شائع کی اور لکھا کہ ۔مشکل کی آخر شب یعنی ۲۹ محرم ۱۲۹۲ھ کو یہ حادثہ واقع ہوا۔ پھر ۱۴ مارچ ۱۸۷۵ء کے پرچے میں دبیر کی سوانح عمری بھی اختصار سے چھاپ کر شائع کی جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔

"جناب مرزا سلامت علی دبیر فن مرثیہ گوئی میں بے مثل اور لاجواب تھے تمام ہندوستان میں آفتاب تھے سوا اس کے عابد شب زندہ دار تھے اور صائم روزگار۔ پندرہ سولہ برس کا سن تھا۔ شوق مافوق سلام اور مرثیہ گوئی کا ہوا اور اصلاح سلام وغیرہ پر میاں دلگیر شاعر بے نظیر سے لی۔ بعد ازاں مرثیہ گوئی وغیرہ میں نام عالی پیدا کیا اور سب مشتاقین معززین کو اپنا شیدا کیا۔ میاں دلگیر صاحب ایسا شاگرد رشید و حمید پا کر خوشی سے (ص۴۳) پھولے نہ سماتے تھے سوا ان کے اور کسی کو دل لگا کر نہ بتاتے تھے۔"

گارساں دتاسی جہاں میر ضمیر کو دبیر کا استاد تسلیم کرتے ہیں وہاں "پنجابی"[۱] کے ۱۷ مارچ کے پرچہ سے یہ اقتباس بھی درج کرتے ہیں۔ (مقالات گارساں دتاسی حصہ دوم۔ ص۲۰۰)

"مرزا دبیر مرثیہ گوئی کے فن میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے اور ان کے تقوے کا یہ حال تھا کہ ساری رات عبادت میں گزار دیتے تھے سخاوت میں اپنے وقت کے حاتم تھے کم عمری

۱؎ ۱۸۵۰ء کے آس پاس ۲؎ ۱۸۵۰ء یا اس کے بعد ۳؎ تاریخ صحافت اردو۔ جلد دوم کا پہلا حصہ ص۹۴

تھے دگیر کی تلقین پر سلام کہنے لگے تھے لیکن ان کا جوہر مرثیے کی صنف میں آ کر کھلا۔

تقریباً ۳۰ سال بعد افضل حسین ثابت حیات دبیر ص۲ پر تحریر فرماتے ہیں:

"فن شعر میں وہ (دبیر) میر مظفر حسین ضمیر مغفور کے شاگرد تھے مگر تمام اساتذہ کو نیکی سے یاد کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سید حسین صاحب لطافت مرحوم (خلف الصدق امانت مغفور) نے مرزا (دبیر) صاحب سے بر سبیل تذکرہ پوچھا کہ کیا آپ کو دگیر مرحوم سے بھی تلمذ تھا فرمایا اگر تلمذ ہوتا تو میرا فخر تھا لیکن جھوٹ بولنا گناہ ہے مجھے یہ شرف نہیں حاصل ہوا۔"

حیات دبیر کے ص ۶۱-۶۲ پر درج ہے:

"یہ بھی نانا مرحوم بیان فرماتے تھے کہ مرزا صاحب سے منشی دگیر مرحوم کو بہت محبت تھی اور وہ بہت قدر و منزلت فرماتے تھے۔ ایک مجلس میں ...... میر صاحب (میر علی صاحب سوزخواں) نے سوز میں منشی دگیر مرحوم کا ایک مرثیہ پڑھا سامعین میں مرزا صاحب بھی تھے۔ شام کو حسب معمول مرزا صاحب کے مکان پر مجمع ہوا۔ ایک صاحب حاضرین میں سے بولے کہ میر علی صاحب نے آج جو مرثیہ پڑھا بے مثل تھا۔ مرزا صاحب نے بھی تعریف کی..... وہ صاحب بولے..... کہ اب جب تک میر علی صاحب اس کو نہ تقسیم کر دیں جناب منشی دگیر کسی کو نہ دیں گے..... اور میرا دل اس مرثیہ کو چاہتا ہے مرزا صاحب نے فرمایا.... اگر کسی کی قوت حافظہ اچھی ہو تو وہ ایک دو زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ غور سے سن کر یاد کر سکتا ہے.... اچھا ذرا آپ کہیے تو سہی۔ اب جو وہ کہنے بیٹھے تو مرزا صاحب نے ایک ایک بند کر کے وہ سب بند لکھوا دیے۔ انھوں نے مرثیہ لیکر بجائے شکریہ ادا کرنے کے مرزا صاحب سے کہا حضت (حضرت) لوگ کہا کرتے ہیں کہ منشی دگیر اور آپ مل کر مرثیہ کہا کرتے ہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا استغفر اللہ۔ جھوٹے ہیں جو ایسا کہتے ہیں۔ بھلا جناب دگیر ایسے مشاق کو مجھ سے مدد لینے کی کیا ضرورت ہے۔ ذرا مرثیہ مجھے دیجیے انھوں نے مرثیہ دے دیا۔ مرزا صاحب نے دیکھ کے لوٹے میں جو پاس رکھا ہوا تھا اس مرثیہ کو ڈبو دیا.... (اور کہا) مجھے یہ منظور نہیں کہ میں ان (دگیر) کا دل دکھاؤں اور ایک کامل فن کی تنقیص کی شہرت کا باعث ہوں۔"

یہ حقیقت ہے کہ دبیر جناب ضمیر مرحوم کے شاگرد تھے اور [illegible] ضمیر اور دبیر کے روابط بہت زیادہ تھے اور آخر دم تک رہے۔ عین ممکن ہے کہ دگیر کی زندگی تک دبیر نے کم و بیش ان دونوں اساتذہ سے اصلاح لی ہو اور دگیر کے انتقال کے بعد صرف ضمیر سے (ضمیر دگیر سے آٹھ سال بعد مرے) مشورۂ سخن کرتے رہے ہوں ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ ایک مشہور مقامی اخبار اتنی اہم بات کو غلط لکھ دیتا۔ افضل حسین ثابت (مؤلف حیات دبیر) کی اوپر بیان کی ہوئی دونوں روایتیں بعد کی اختراعیں معلوم ہوتی ہیں جن سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں دبیر کے تلمذ دگیر کی افواہ عام تھی۔

۱؎ ڈاکٹر مسیح الزماں اپنی مشہور کتاب "اردو مرثیہ کا ارتقاء" (ص ۲۴۶ و ۲۴۷) میں افضل حسین ثابت کی تحقیق کو ناقص قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں: "ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ ثابت ایسے غیر محتاط لکھنے والے کی رائے پر بھروسہ کرنا مناسب نہیں۔"

ضمیمہ

سید حسن لطافت کے دیوان "ریاض لطافت" مطبوعہ شوکت جعفری پریس کے صفحہ ۲۹۳-۲۹۴ پر دبیر کی وفات کا قطعہ تاریخ ہے جو نو اشعار پر مشتمل ہے آخری شعر یہ ہے ؎

ہاں الم سے سر اٹھا کر لکھ دے تاریخ وفات
باغ بلبل سے ہندستاں لطافت بے دبیر

اسی کا چھٹا شعر یہ ہے ؎

ہر طرح اللہ نے ان کو کیا تھا اہل دل
تھے رجوع قلب سے شاگرد دلگیر و ضمیر

لطافت کے اس شعر کی موجودگی میں افضل حسین ثابت (حیات دبیر صفحہ ۲۷) کی لطافت کی زبانی بیان کی ہوئی حکایت کہ دبیر نے کہا کہ اگر مجھے دلگیر سے تلمذ ہوتا تو میرا فخر تھا لیکن جھوٹ بولنا گناہ ہے مجھے یہ شرف نہیں حاصل ہوا، درست نہیں معلوم ہوتی ——

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ افضل حسین ثابت دبیر کو دلگیر کی شاگردی سے بری کرانے میں اس قدر کوشاں کیوں ہیں۔

لوح و قلم

غم لوح و قلم کو شہ ذیجاہ کا ہے　　فرمان ازل سے یہی اللہ کا ہے
جب سے کہ لکھا نام حسینؑ مظلوم　　نقشہ قلم و دوات میں آہ کا ہے

سیاہ لباس کعبہ

ہر چند ہزار رنگ عالم بدلے
ممکن نہیں تاثیر محرم بدلے
باقی ہے ابھی دعوئ خون شبیر
کعبہ کیوں کر لباس ماتم بدلے

(مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ)

ادارۂ یادگار دبیر

جناب مرزا رضا حسین صاحب (سابق اے' ڈی' ایم) جنرل سکریٹری ادارۂ یادگار دبیر لکھنؤ

دنیائے ادب میں میر ببر علی انیسؔ اور مرزا سلامت علی دبیرؔ زندۂ جاوید ہیں اور تا قیامت زندۂ جاوید رہیں گے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ان دونوں مسلم الثبوت عظیم المرتبت شاعروں نے اپنے گراں قدر اور لاجواب مرثیوں سے اردو ادب کو مالامال کر دیا اور اپنی منفرد اور ممتاز شاعری سے "بگڑا شاعر، مرثیہ گو" کی پرانی کہاوت کو باطل ثابت کر کے دکھا دیا۔ ان کا کلام آج تک مثل آفتاب و ماہتاب اردو ادب کی دنیا کو منور کیے ہوئے ہے۔ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ فن اور فکر کی رفعت میں ان کے قبل اور ان کے بعد کا کوئی مرثیہ گو ان کا مماثل نہ ہو سکا۔ زبان کی پاکیزگی۔ نیز فکر و فن کے کمالات سے انھوں نے نہ صرف ایک نئے طرز کی تخلیق ہی نہیں کی بلکہ شاعری میں وہ عظیم انقلابی کارنامہ انجام دیا جس کی اردو ادب کی تاریخ میں بلا شک و شبہ کوئی مثال نہیں ملتی۔ جو جواہر پارے وہ چھوڑ گئے ہیں وہ اردو ادب پر یقیناً ایک ناقابلِ فراموش احسان ہے۔

یہ کوئی نئی بات نہیں کہ دو عظیم ہمعصر شخصیتوں کا جب مقابلہ کیا جائے تو کچھ حضرات ایک کو، کچھ دوسرے کو اور کچھ دونوں کو پسند کریں۔ صرف شعرا ہی کے نہیں اس قسم کے مقابلے ذاکروں۔ عالموں اور دیگر صاحبانِ علم و فن کے ہر دور میں ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ لیکن جب بعض شدت پسند حضرات ان ادبی مقابلوں کو ذاتی بنا دیتے ہیں اور مخالفانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں تو ان میں تلخی پیدا ہو جاتی ہے جو انصاف پسند اور غیر جانبدار نقاد کے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے۔

"انیسیوں" اور "دبیریوں" کی ادبی نوک جھونک کے متعلق ملک کے ممتاز ادیب اور عالم مفتی محمد رضا صاحب انصاری فرنگی محلی ۱۲ مارچ ۱۹۶۵ء کے "قومی آواز" میں تحریر فرماتے ہیں ــــ

"اردو مرثیہ گوئی کے دو ہی امام مانے گئے ہیں۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ۔ دونوں بزرگ ہمعصر بھی تھے اور وقت کے لحاظ سے ہم عہد بھی اور جیسا کہ ہوا کرتا ہے۔ دونوں کے قدر دانوں نے مرحوموں کی زندگی میں بھی اور ان کے بعد بھی باہمی برتری اور فوقیت ثابت کرنے کے لیے ادبی نزاعیں کھڑی کیں۔ ادبی نزاع جیسا کہ سب جانتے ہیں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ حقائق پر منتہی ہو۔ وہ عموماً ایسے مقام پر پہونچ کر ٹھہرا کرتی ہے جہاں دونوں فریق اپنے کو جیتا ہوا سمجھتے ہیں اور ایک غیر جانبدار آدمی کسی فریق کی سو فیصدی تائید کرنے سے قاصر نظر آتا ہے۔ یہی حال "انیسیوں" اور "دبیریوں" کی ادبی نزاع کا نظر آتا ہے۔۔۔۔"

اس مختصر مضمون میں میری غرض نہ انیس و دبیر کا موازنہ ہے اور نہ ان پر کوئی مقالہ سپردِ قلم کرنے کا ارادہ ہے۔ میں بھی ان لوگوں میں سے ہوں جو دونوں کی شاعرانہ عظمت کے قائل ہیں اور میں ان دونوں عظیم اور محترم شاعروں کو اس کا مستحق سمجھتا ہوں کہ ان کی بلند پایہ یادگار قائم کی جائے صرف نمائش کے لیے نہیں بلکہ دنیا کو ان کے ادبی معجزوں سے روشناس کرایا جائے۔ یہی ان کی سب سے اچھی یادگار اور یہی اردو ادب کی ایک بیش بہا خدمت ہو سکتی ہے۔

بعید نہیں کہ بعض حضرات کو اب تک اس بات کا بھی علم نہ ہو کہ ان دونوں عظیم شاعروں کی قبریں کہاں ہیں۔ ان کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ میر انیسؔ مرحوم اور ان کے خاندان کے دیگر ممتاز و معروف مرثیہ گو شعرا مثلاً نفیسؔ۔ رئیسؔ۔ سلیسؔ۔ عروجؔ۔ جلیسؔ۔ قدیمؔ۔ نفیسؔ۔ مانوسؔ ذکیؔ۔ عارفؔ۔ فائقؔ وغیرہ کی قبور انیس مرحوم کے مکان مسکونہ کے قریب ایک بغیا میں واقع ہیں۔ یہ بغیا سبزی منڈی چوک لکھنؤ کے عقب میں

واقع ہے۔ اس محلہ کا نام چوپداری محلہ اور گلی کا نام کوچۂ میر انیسؔ ہے۔ دبیر مرحوم کا مکان مسکونہ کوچۂ مرزا دبیر نخاس لکھنؤ میں واقع ہے۔ اس مکان کا ایک حصہ اب سڑک شہنشاہ بلڈنگ کے بالکل قریب وکٹوریہ اسٹریٹ پر واقع ہے اور ان کی ابدی خوابگاہ اسی مکان کے ایک شکستہ کمرہ میں ہے جس میں اوجؔ، رفیعؔ اور خاندانِ دبیرؔ کے دیگر مرحومین بھی دفن ہیں۔

اس موضوع پر لکھتے وقت مجھے پروفیسر سید مسعود حسن صاحب مرحوم یاد آتے ہیں جو مجھ پر اس وقت سے شفقت فرماتے تھے جب وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں لکچرر مقرر ہو چکے تھے اور میں زیرِ تعلیم تھا۔ دورانِ ملازمت جناب وہ کبھی یونیورسٹی کے کام سے کسی ایسے مقام پر تشریف لاتے جہاں میں تعینات تھا تو مرحوم نے از راہِ شفقت و محبت میرے ہی یہاں قیام فرما کر میری عزت افزائی فرمائی۔ مجھے ان کی پرورش اور وضعدار شخصیت کسی طرح نہیں بھولتی۔ جب میں ملازمت سے سبکدوش ہوکر لکھنؤ آیا تو مرحوم نے مجھ سے اور ملک کے ممتاز افسانہ نگار سید علی عباس صاحب حسینی مرحوم سے وعدہ لیا کہ یادگار انیسؔ کمیٹی کے قیام اور اس کے اغراض و مقاصد کو عملی جامہ پہنانے میں ہم دونوں ان کا پورا پورا ساتھ دیں گے چنانچہ ہم لوگ ایسا ہی اور کئی سال تک ہم تینوں نے متحد ہوکر انیسؔ کی یادگار قائم کرنے کے لیے دن رات کام کیا اور اب تک حکومت کی مالی امداد کی وجہ سے یادگار انیسؔ کمیٹی کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

مجھ میں اتنی استعداد اور قابلیت تو نہیں ہے کہ میں دبیرؔ کے شاعرانہ فن پر تبصرہ کروں۔ لیکن دبیرؔ کے متعلق شمس العلماء مولانا سید امام امداد صاحب اثرؔ کی مندرجہ ذیل رائے سے میں بہت متاثر ہوا۔ "مرزا دبیرؔ اعلی اللہ مقامہ فی الجنۃ کا درجہ عموماً انسانی کریکٹر کے درجہ سے بالا نظر آتا ہے۔ آپ تمام تر صفاتِ ملکوتی سے متصف اور مقربینِ خاصانِ خدا سے تھے اولیائے نامدار کی خوبیاں جو واہب العطایا نے حضرت کو بخشی تھیں۔ ان کی عبادت و ریاضت شہرۂ آفاق ہے۔ علم و فضل کے ساتھ توفیقِ عبادت بہت کچھ خدائے پاک نے عطا فرمائی تھی۔ اخلاقِ محمدی کا آپ پورا نمونہ تھے۔ جود و سخا، بذل و عطا میں اپنا جواب آپ تھے۔ طبیعت بھی شریف اور غیور پائی تھی۔ منکسر مزاجی، خاکساری اور فروتنی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ خوش مزاجی اور خوش اخلاقی آپ پر ختم تھی۔ عمر بھر کبھی کسی کی غیبت نہیں کی۔ تا زیست کسی سے ترش رو ہوکر نہ بولے۔ رفتار، گفتار، سب یکتائے وقت تھے۔ بالمختصر آپکی خوبیاں حضرات اہلبیت کی خوبیوں کا پرتو تھیں حقیقت یہ ہے کہ جن حضرات کے آپ مداح تھے ان کے تفضلات آپکے شاملِ حال تھے۔"

امداد امام صاحب کی یہ رائے پڑھ کر میں نے اپنے دل میں سوچا کہ "افسوس ایسے فرشتہ خصلت انسان کے مرنے کے بعد دنیا نے اس کی قدر نہ کی۔ اس کی قبر کا نشان تک مٹ گیا۔ جس چھوٹے سے ہال میں قبر ہے اس کی چھت گر گئی۔ دیواریں منہدم ہو گئی ہیں۔ ہر طرف ملبہ اور لکھوری اینٹوں کی پہاڑیاں نظر آرہی ہیں" ان حالات سے متاثر ہوکر ۷ ارجنوری ۱۹۶۵ء کو میں نے ادارۂ یادگار دبیرؔ قائم کیا جس کے صدر بابو مہابیر پرشاد صاحب شری واستوا۔ نائب صدر مرزا محمد صادق صاحب عرف بابو صاحب فرزند مرزا محمد طاہر مرحوم رفیعؔ۔ پروپیگنڈا سکریٹری، مرزا کاظم علی خاں صاحب لکچرر شیعہ کالج تھے اور میں جنرل سکریٹری تھا۔ اسوقت سید سرفراز حسین صاحب خبیرؔ بھی حیات تھے جن کو اس ادارہ کے قیام سے بہت خوشی ہوئی تھی۔ لیکن افسوس ان کی عمر نے وفا نہ کی۔

انیسؔ کی یادگار کے قیام کے لیے زیادہ تر مدد مرکزی حکومت حکومت جموں و کشمیر اور حکومت اتر پردیش سے حاصل ہوا۔ لیکن دبیرؔ کی یادگار کے قیام کے لیے حکومت سے اس لیے کوئی امداد حاصل نہ ہو سکی کہ میں ۲-۳ سال تک سخت علیل رہا اور دہلی وغیرہ نہ جا سکا گو کہ اس کام کے لیے علالت کی حالت میں بھی میں نے بڑی بڑی شخصیتوں سے خط و کتابت کی لیکن ڈاکٹروں نے آنتوں میں کینسر کا شبہ ظاہر کیا اور میرے لیے بستر سے اٹھنا بھی مشکل ہو گیا۔ بیماری سے قبل یو پی کے ایک وزیر صاحب نے تقریباً بیس دفعہ دوڑایا۔ لیکن کیا کچھ بھی نہیں۔ دو دفعہ

مہابیر پرشاد صاحب کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس پر محنت کر کے چھوٹی چھوٹی چندہ کی رقموں سے کل تقریباً چوبیس سو روپیہ جمع ہوا تھا جس میں تقریباً آٹھ سو روپیہ رجسٹریشن۔ دستور العمل، اپیلوں، لیٹرپیڈ۔ لفافوں کی طباعت۔ خط و کتابت، بینر کی کتابت۔ متفرق اخراجات اور دبیر کے ایک غیر مطبوعہ مرثیہ (آمد خزاں کی گلشن خیر الوریٰ پہ ہے) کی طباعت اور ۲۶ اور ۲۷ جون ۱۹۶۵ء کو افضل محل وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ میں شاندار طریقہ پر یوم دبیر منانے میں صرف ہوئے۔

باقی سولہ سو پیسے میں ایک ماہ تک دن دن بھر بیٹھ کر میں نے اس ہال کی چھت ڈلوادی جس میں دبیر مرحوم کی قبر ہے۔ فرش مرنگ اور سیمنٹ کا پختہ کرادیا۔ دبیر مرحوم کی قبر پر سنگ مرمر لگوا دیا۔ دیواروں کی مرمت کرا کے ان پر پلاسٹر ہو گیا۔ لکھوری اینٹوں اور ملبہ کی پہاڑیوں کو صحن میں بچھوا کر کٹائی کرا کے صحن کو ہموار کرا دیا۔ اندر جانے کے لیے جو در تھا وہ اتنا چھوٹا تھا کہ جھک کے جانا پڑتا تھا۔ اس کو کشادہ کرا کے سیڑھیاں بنوا دیں۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں خود خریدنے جاتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر مرزا صادق حسین صاحب عرف بابو صاحب کا پورا تعاون حاصل نہ ہوتا تو اتنا کام ہونا بھی مشکل تھا۔

اس کے بعد میں ایک سال تک سے زیادہ علیل رہا اور اب مجھ میں اتنی سکت نہیں ہے کہ میں خدمت کو انجام دے سکوں جس میں بہت پیچیدگیاں اور مراحل ہیں اور پورے اسکیم کے لیے ڈیڑھ دو لاکھ روپیہ درکار ہے۔ کسی کی توجہ اس طرف پاتا نہیں۔

اتر پردیش کے گورنر عزت مآب اکبر علی خان صاحب کی توجہ بھی میں نے دبیر کی یادگار کے قیام کے متعلق مبذول کرائی تھی جس میں اپنی پیرانہ سالی اور خرابی صحت کا بھی تذکرہ کیا تھا۔ جواباً موصوف نے تحریر فرمایا کہ جب آپ کی صحت اب اس قابل نہیں ہے کہ آپ اس خدمت کو انجام دے سکیں تو اب اس کام کو نوجوانوں کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے۔ موصوف کا مشورہ بالکل درست ہے اور مجھے بھی اس سے پورا اتفاق ہے۔

گل ہو نہ چراغ عمر جلتے جلتے
ہو جائے نہ جاں دھوپ ڈھلتے ڈھلتے
چلنا ہے تو چل جلد زیارت کو دبیر
سر جائے نہ موت راہ چلتے چلتے

گر اس پہ غبار غم سرِ ذرہ بیٹھے
اغلب ہے ابھی فلک زمیں پر بیٹھے
حقا کہ گراں ہے سخن قتل حسین
اس ذکر میں آواز نہ کیونکر بیٹھے

الوداع

تصنیف کردہ مرزا سلامت علی دبیر لکھنوی
از جناب ڈاکٹر سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی پی ایچ ڈی، ریڈر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

واقعات کربلا کا یوں تو ہر منظر درد انگیز ہے مگر رسم "الوداع" کی ادائیگی بھی بڑی دل ہلا دینے والی ہے۔ کسی کو وداع کرتے وقت بہ تقاضائے بشریت، انسان کے دل پر رنج و غم کی فضا طاری ہو جاتی ہے اور اگر وداع کے وقت جدا کی منزل طویل ہوتی ہے تو طرفین کو رنج و غم زیادہ ہوتا ہے جس کے سبب آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں اور انسان رونے لگتا ہے اور یہ انسان کی طبعی فطرت ہے۔ وداع سے متعلق عام واقعات کو دیکھتے ہوئے کربلا کے واقعات میں وداع کے مناظر نہایت اندوہناک محسوس ہوتے ہیں۔ جہاں بھائی بھائی سے بیٹیاں باپ سے اور باپ بیٹے سے بھائی بہن سے دوست دوست سے اور شوہر زوجہ سے وقت وداع ہمیشہ کے لیے جدا ہوتے ہیں بلکہ موت کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ واقعات کربلا میں وداع کے ایسے ایسے دردناک مناظر سامنے آتے ہیں کہ انسان کا دل تڑپ جاتا ہے اور ان کے تصورات سے روح لرز جاتی ہے۔

مرثیہ گو حضرات نے "الوداع" کو بھی موضوع بنایا ہے اور اس موضوع پر نہایت سبک نظمیں لکھی ہیں جو ایام عزا میں بہ نظر حصول ثواب پڑھی جاتی ہیں۔ الوداع عموماً عشرہ عزا کے اختتام پر صبح عاشورہ اور صبح چہلم پڑھی جاتی ہے یا امام باڑہ سے کسی شہید کے تابوت کی رخصت کے وقت پڑھی جاتی ہے جس سے رنج و غم کی فضا میں شدت پیدا ہو جاتی ہے اور حاضرین کی رقت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

میرے وطن جلالی ضلع علی گڑھ میں دو موقعوں پر "الوداع" پابندی کے ساتھ باحزن و ملال پڑھی جاتی ہے ایک صبح عاشورہ اور دوسرے صبح چہلم امام باڑوں میں تعزیہ یا ضریح کے روبرو پڑھی جاتی ہے۔ چند ذاکرین مقررہ و معینہ دردناک انداز میں الوداع پڑھتے ہیں اور الوداع پڑھنے کی یہ رسم قدیم سے جاری ہے۔ صبح کا سہانا وقت اور اس وقت درد انگیز لہجہ میں الوداع کا پڑھنا قلوب حاضرین پر ایسا اثر انداز ہوتا ہے کہ بے ساختہ رقت طاری اور آنسو آنکھوں سے جاری ہو جاتے ہیں۔ یہ مشاہدہ ہے کہ بعد الوداع امام باڑوں کی رونق کم ہو جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ سید الشہداء حضرت امام حسینؑ کی سواری معہ دیگر شہدائے کربلاؑ کی سواری کے آئی تھی جو رخصت ہو گئی۔

جلالی، شمالی ہند میں سادات ہمدانی کی آباد کردہ ایک قدیم بستی ہے یہ بستی عزاداری کے لیے قدیم سے مشہور ہے۔ سادات جلالی کا تعلق نوابان اودھ اور اودھ کے مراکز فیض آباد اور قدیم لکھنؤ سے رہا ہے۔ نواب شجاع الدولہ بہادر نے ۱۷۷۴ء میں عشرہ محرم کی عزاداری جلالی میں کی آپ معہ لشکر وارد جلالی ہوئے۔ نواب فرخ آباد نواب مظفر جنگ بنگش بھی آپ کے ہمراہ تھے اور یہ زمانہ عشرہ محرم جلالی میں شیعہ ہوئے جیسا کہ فرخ آباد کی تاریخوں

سے واضح ہے نواب آصف الدولہ بہادر نے موضع مبارکپور (ضلع ایٹہ) بہ رسم سید خیرات علی معہ فرزندان وقف و معاف علی الدوام کر جس سے امام باڑہ سید خیرات علی واقع حصار جلالی کے مصارف تاحال تکمیل پاتے ہیں. سادات جلالی نے عزاداری کے فروغ کے سلسلہ میں مرکز اودھ لکھنؤ سے بہت استفادہ کیا ہے. سادات جلالی نے میر انیس و مرزا دبیر اور آپ کے ممتاز شاگردان کے منتخب مراثی اور دیگر کلام حاصل فرمایا اور انہیں ایام عزا میں رواج دیا. لکھنؤ کی طرز پر عالیشان امام باڑے تعمیر کرائے اور اعلیٰ پیمانہ پر عزاداری کو رواج دیا. مرزا دبیر علیہ الرحمہ کا جو کلام جلالی میں رائج ہے اس میں "الوداع چہلم" نمایاں حیثیت رکھتی ہے اس لیے کہ پابندی کے ساتھ قدیم سے تاحال اس کا صبح چہلم جلالی کے امام باڑوں میں جاری ہے.

جلالی میں صبح عاشورہ جو الوداع قدیم سے پڑھی جاتی ہے اس کے مصنف جناب کاتب علیہ الرحمہ ہیں جن کا تاریخی تعارف حاصل نہ ہو سکا. جناب کاتب نے یہ الوداع ۱۱۵۹ھ میں تصنیف فرمائی تھی جیسا کہ اس الوداع کے مقطع سے واضح ہے ملاحظہ ہو ؎

یکہزار و یکصد و پنجاہ و نہ ہجری کے سال
ہو چکے ہیں جب کہ کاتب نے کہا ہے الوداع

اس الوداع کا مطلع حسب ذیل ہے ؎

جب حسینؑ رن کو چلے رو رو کہا ہے الوداع
سب حرم کے تئیں بلا کر یوں کہا ہے الوداع

جناب کاتب نے اس الوداع میں سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کا روز عاشورہ اپنی بہن حضرت زینبؑ اور اپنی پیاری بیٹی حضرت سکینہ علیہا السلام اور دیگر حضرات اہل حرم علیہم السلام سے وداع ہونا اور سب کو صبر و رضا کے ساتھ تسلی و تشفی دینا نہایت غم انگیز انداز میں نظم فرمایا ہے کہ صبح عاشورہ جس کو سن کر حاضرین بے تاب و بیقرار ہو جاتے ہیں. اور یہ رسم عزا ایک ایسا طریق توسل ہے جو موجب ثواب دارین ہے.

تاریخ عزاداری کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ شمالی ہند میں اولاً عشرۂ محرم کی عزاداری جاری ہوئی تھی. نوابان اودھ نے عزاداری کو لکھنؤ میں فروغ دیا اور چہلم تک بڑھایا تو دیگر مقامات پر بھی عشرۂ چہلم میں عزاداری جاری ہوئی. عشرہ محرم میں چونکہ الوداع کا رواج عام تھا اور یہ ایک مقبول عام رسم عزا تھی لہذا جب مرزا دبیر نے عروج پایا تو آپ نے عشرۂ چہلم کے لیے بھی ایک الوداع تصنیف فرمائی جو لکھنؤ اور دیگر مقامات عزا پر جاری ہوئی اور سادات جلالی نے بھی لکھنؤ سے اس الوداع کو حاصل فرمایا اور صبح چہلم اپنے عزاخانوں میں اس الوداع کو جاری کیا اور پھر ایسی مقبول ہوئی کہ جلالی میں تاحال اس کا رواج پابندی کے ساتھ جاری ہے.

مرزا دبیر علیہ الرحمہ نے الوداع چہلم میں سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کے اہل حرم کا روز چہلم شہدائے کربلا کے مزاروں سے وداع ہونا اور مزاروں کو رخصت کرنا نہایت مکمل طریقے پر نظم فرمایا ہے خصوصاً اس موقع پر حضرت زینب علیہا السلام کے بین بڑے غم انگیز انداز میں بیان فرمائے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک بے مثل الوداع ہے جو بیحد مقبول ہوئی ہے

مرزا دبیر کی تصنیف کردہ الوداع چہلم ذیل میں ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں.

اربعین کے سوگوارو الوداع
شاہدین کے دوستدارو الوداع
خاتمہ بالخیر چہلم کا ہوا
الوداع اے اشکبارو الوداع

کہہ رہے ہیں مرقدوں پر اہلبیت
فاطمہؑ زہرا کے پیارو الوداع

دشت سونا پاس بستی بھی نہیں
بے دیاروں کے مزارو الوداع
کربلا کے چاند کو سونپا تمہیں
عرش اعظم کے ستارو الوداع
اکبر و اصغر علیؑ کی ضا منی
نوجوانو خیبر خوارو! الوداع
کہتی تھی مذینبؑ یہ قبر شاہ سے
تم بھی زینبؑ کو پکارو الوداع
قبر سے آواز ہوتی تھی بلند
لو بہن زینب سدھارو الوداع
بخیۂ و مرہم نہ زخموں کا ہوا
مرتضیٰ کے رشتہ دارو الوداع
گھر کہیں کنبہ کہیں قبریں کہیں
اے غریبو بے دیارو الوداع
قبر پر بیٹوں کی زینبؑ نے کہا
ماں وطن جاتی ہے پیارو الوداع
تو بھی اپنا پیٹ کر سر کہہ دبیر
فاطمہؑ کے گلعذارو! الوداع

الحاج جناب سید وصی الحسن صاحب ایڈوکیٹ جلالوی (ساکن حال آناؤ) جلالی میں الوداع کی مقبولیت کے پیش نظر جناب کاتب علیہ الرحمہ کی الوداع محرم اور جناب دبیر علیہ الرحمہ کی الوداع چہلم بنظر ثواب عرصہ ہوا شائع فرما چکے ہیں اور حال میں آپ کے برادر محترم فخر قوم الحاج خان بہادر سید محمد عباس صاحب جلالوی نے الوداع اور مہندی کے سلام بھی امامیہ مشن لکھنؤ سے شائع کرا کے تقسیم فرمائے ہیں پروردگار عالم ان بزرگوں کو اس مقبول و متبرک کلام کے تحفظ میں سعی کے لیے ثواب دارین سے نوازے۔
آمین

قطعۂ تاریخ وفات دبیر

آپ کے شاگرد منیر شکوہ آبادی نے آپ کے انتقال پر قطعۂ تاریخ کہا:۔

آہ ز دستِ جہاں جانبِ باغِ نعیم	باد ل شاداں گرفت راہ جناب دبیر
مرثیہ گوئی از او دولت معراج یافت	بود دریں مملکت شاہ جناب دبیر
سال وفاتش چنیں گفت منیر حزیں	ذاکر آل نبیؐ آہ جناب دبیر

(۱۲۹۲ھ)

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

مرزا سلامت علی دبیر

(ایک تحقیقاتی اضافہ)

مرزا سلامت علی دبیر تخلص، دہلی میں محلہ بلی ماران متصل لال ڈگی میں ۱۱؍جمادی الاول ۱۲۱۸ھ ہجری مطابق ۲۹؍اگست ۱۸۰۳ء کو پیدا ہوئے۔ "بخت دبیر" مادۂ تاریخ ہے جس سے ۱۲۱۸ برآمد ہوتے ہیں۔ دبیر کے تفصیلی حالات کے لئے راقم الحروف کی کتاب "شاعر اعظم مرزا سلامت علی دبیر" مطبوعہ اردو پبلشرز لکھنؤ ملاحظہ کریں۔

مرزا دبیر اردو کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ معاصرین انھیں ایک خوش فکر، بلند خیال اور مسلّم الثبوت اُستاد تسلیم کرتے تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور انھیں باکمال مرثیہ گو سمجھتے تھے[۱] مرزا غالب کی رائے میں وہ مرثیہ کے فن میں سب سے سبقت لے گئے تھے[۲] مرزا دبیر طلاقت بیان اور پرگوئی کے سبب مشہور تھے۔ نجات عظیم آبادی ۱۲۵۹ھ ہجری مطابق ۱۸۴۳ء میں لکھنؤ کی ایک سیاحت پر آئے تھے۔ اُنھوں نے قیام لکھنؤ میں مرزا دبیر کی مجلسیں کئی مرتبہ سنیں۔ وہ اپنی قلمی غیر مطبوعہ کتاب سفرنامہ میں اُن کی مرثیہ گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:[۳]

"بتاریخ بست و نہم رمضان راقم با اماماباڑہ میر باقر برائے استماع نمودن مرثیہ از زبان مرزا دبیر صاحب در حال شہدائے کربلا کہ در ۶۱ ہجری شربت شہادت چشیدند امام باڑہ رسید با کمال تکلفات از جھاڑ و فانوس رنگا رنگ و دیوارگیر معائنہ کردہ۔ لیکن مرد برآنکہ جناب مرزائے دبیر بہ منبر رفتہ، مرثیہ طولانی بکمال بلاغت و متانت در حال شہدائے کربلا کہ در ۱۲۵۸ہجری بماہ ذی الحجہ از جور وجفائے بغدادیان درین ایام اتفاق افتادہ۔ چنانچہ ذکر آن در بعضے تاریخہا نیز بقلم آمدہ خواند، حضار مجلس را کہ از زار زار نالیدند بگریہ در آوردند۔ الحق کہ شاعر در طلاقت بیان و پرگوئی و خوش خوانی نظیر ندارد۔"[۴]

نجات عظیم آبادی ایک اور جگہ مرزا دبیر کے حلیہ کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ:

"بتاریخ بست و ہشتم ۲۸ روز پنجشنبہ

باوجود ناد رستی طبع نیم و پاس روز برآمدہ
بمجرد تشریف آوردن نواب مرزا صاحب
بشوق سماعت مرثیہ از زبان مرزا دبیر
صاحب بمکان امام باڑہ محمد مرزا صاحب
کہ رئیس میرٹھ صاحب جاگیر و اہل ذیفقہ
اند رفتہ مگر تا آن زمان مجلس تمام شدہ بود
مرزا دبیر صاحب از منبر فرود آمدہ بودند
وبعد فراغ از تقسیم شربت نواب مرزا صاحب
... تمنائے این غریب الدیار بعید الوطن
پیش وحید زمن یگانہ وقت در شعر و سخن
— جناب مرزا دبیر کرچشمہ منحنی
قامت میانہ و سبزہ رنگ مائل بہ سیاہی
دارند ردائے مناسب و سرخ رنگ
بر دوش زیر منبر نشستہ بودند رفتہ ذکر
ایشان راقم بادشاں عرض داشتند و راقم
را قریب طلبیدہ بملاقات در پیش خانہ
مرزا کریم بیگ مستفید گردانیدہ" [۵]

مرزا دبیر اپنے استاد میر ضمیر (متوفی ۱۲۷۲ ہجری مطابق ۱۸۵۵ء) سے منحرف ہو گئے تھے۔ اس کی تصدیق سعادت خان ناصر[۹] اور مولوی محمد حسین آزاد سے بھی ہوتی ہے[۱۰]۔ نجات عظیم آبادی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں کہ ایک دن وہ گیارھویں کی مجلس میں مرزا دبیر کے گھر مجلس سننے گئے تھے۔ اُنھوں نے اپنا نیا مرثیہ تحت اللفظ میں پڑھا۔ مجلس میں منیر شکوہ آبادی نے بھی اپنا مرثیہ پڑھا۔ جس طرح دبیر اپنے اُستاد سے منحرف ہو گئے تھے اُسی طرح ایک دن منیر بھی اپنے اُستاد (مرزا دبیر) سے انحراف کریں گے۔ مشہور ہے چاہ کن را چاہ در پیش[۱۱]
اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی ہے کہ منیر مرزا دبیر سے کبھی بگڑ گئے تھے۔

سید احمد حسن فرقانی اپنے وقت میں بہت بڑے انشا پرداز اور صاحب دیوان تھے۔ فارسی کے وہ یگانہ روزگار ادیب تھے۔ انشا پردازی میں "انشائے فرقانی" اُن کی عدیم النظیر تصنیف ہے۔ وہ مرزا دبیر کے بڑے عقیدت مندوں اور مداحوں میں تھے اور اُن کے کمال سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ ذی الحجہ ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں اپنے وطن میرٹھ سے سفر کی صعوبتیں اُٹھا کر مرزا کی ملاقات کے لئے لکھنؤ گئے۔ مرزا اُس زمانے میں عظیم آباد گئے تھے۔ فرقانی صاحب بغیر ملاقات کے بے نیل مرام واپس لوٹے۔ اس ناکامی سے اُنھیں بے حد افسوس ہوا۔ اُنھوں نے ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹ء میں مرزا دبیر کو دو خط لکھے۔ ان میں اُن کی شاعری کو بہت سراہا گیا۔ وہ مرزا کا بے حد احترام کرتے تھے اور انھیں "سرخیل صاحب کمالان" "صدر بدر انجمن" "جامع مقالات سحر آیات" "امہات اثر یگانہ عناصر و جہات" کہتے تھے[۸]۔ اُن کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ دلی میں مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی کی دھوم مچی تھی اور بعض اوقات اس چرچے کی نوبت بحث و مناظرہ تک پہنچتی تھی۔ چنانچہ ایک خط میں مرزا دبیر کو لکھتے ہیں:

" سلامیکہ مشکبت زبان و عبیر
برائے صبا از رہے بر دبیر
از آنجا کہ صیت کمال و شہرت اخلاق
آن گزین اعصار را دوار لب تا لب گیتی فرا
رسیدہ است۔ دہانے فصاحت آن شہباز قلمرو
مجد و اعتلا بر تمامی روئے زمین سایہ افگندہ
پیوستہ آرزوئے لقائے شریف می بود بہفت
ہشت سال در دہلی با جمعی پریشان بود اندیشا
... بصحت حال اینجا نست نوبانہ ایضحیت
در صحبت خدام بر جملہ شعرائے بشدہ تحسین
دقائق و لطائف کہ در مطلع مراثی رواج یافتہ

بمباحثہ و مناظرہ می رفت ... و از ایرادات شانِ شرعی جواب تازہ می آمد کہ موجب حیرت و استعجاب ہمگناں می گردید"[54]

سعادت خاں ناصر لکھنوی بھی مرزا دبیر کی تعریف میں رطب اللساں ہیں۔ کہتے ہیں کہ :-

"عطارد نظیر میاں دبیر۔ جودت اس کی طبع کی تقریر سے باہر اور تحریر سے زیادہ، طبیعت اس کی مضمون کے پیدا کرنے پر آمادہ، مرثیہ گوئی میں گوئے سبقت ہمگناں سے لے گیا ہے اور زمین سلام کو اُس کی فکرِ بلند نے آسمان کیا۔ مرثیہ لاجواب، ہر بند اس کا انتخاب۔ ایک ہم کیا ہزار زبان سے اس کا اشتہار، جو شہرت اس نے پیدا کی ہے بیان اس کا خیلے دشوار ہے ... خوش تقریر طرۂ دستار میر ضمیر ہے۔"[55]

اردو کے نامور محقق جناب مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی ثم پاکستانی جو مرزا غالب کے دوست نواب ذوالفقار الدولہ حسین میرزا کے خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کے کتاب خانے میں مرزا دبیر کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مرثیوں کے علاوہ کچھ فارسی خطوط بھی محفوظ ہیں۔ ان میں سے ایک خط مولانا سید محمد عنایت حسین تخلص متین ساکن سہارنپوری کے نام تحریر فرمایا ہے۔ مرزا دبیر متین سہارنپوری کو بہت مانتے تھے۔ فاضل لکھنوی نے یہ خط ماہِ نو کراچی کے دبیر نمبر مطبوعہ ۱۹۷۵ء میں شایع کیا ہے۔ ذیل میں اس کی نقل پیش کی جاتی ہے :-

"ضیاء المشرقین، کہف الثقلین، فرازندۂ چتر دین مبین، فروزندۂ شمع شرع متین، دام مجدکم۔

بعد سلامیکہ از اقتداش چمن اسلام در تبسم و از ارتقامش گلشن کلام نضارت انضمام است۔ گزارش آنکہ تراویدہ انامل تقدیس شمائل را اگر سرمایۂ صد مفاخرت دانم بجا، چون صحیفہ امرماید عادت خواتم سویدا خاطران دل بسرتن ... وام عقیدت خدام رہائے ارادت بحوادج ترقی مدام زنانِ اشتیاق در کام زبادہ تمنا دریں مراست مگر دریں دو لب ترد عزم سفر تقدیم لوازم عیادت معذور ... خدمت سراپا برکت اُو درِ ما نرم تا عجیج سواری شوم و اگر حیات مستعار باقی است بعد معاودت استفادۂ صحبت سراسر افادت کی کنم شافی حقیقی صحت کامل و شفائے عاجل کرامت دخول حیات عنایت فرماید۔ والسلام۔"

لفافہ پر مرزا دبیر کی تحریر یہ درج ہے :-

"بعوت وعاید، بنفقہ رفعت از عرش معراج، پیغمبر فصاحت، ظہیر رابہ، نور کلیم بلاغت، شمس اصابع تقدس منابع، ضیاء المشرقین کہف الثقلین فرازندۂ چتر دین مبین، فروزندۂ شمع شرع متین جناب کرامت انتساب حضرت مولوی سید عنایت علی صاحب حسینی دام مجدہ فائز باد۔

داعی بقا مشتاق لقا

دبیر عفی عنہ"

"شمس الضحیٰ" میر صفدر حسین کی ایک نایاب تصنیف ہے۔ جو مرزا دبیر کے حالات زندگی پر پہلی مستند کتاب قرار دی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۲۹۸ھ میں شائع ہوئی۔ اس میں صفحہ ۱۹۴ پر مرزا دبیر کے نام میر ضمیر کا ایک خط بھی درج ہے جس کی نقل ذیل میں پیش کی جاتی ہے :-

"مکتوب اُستاد الشعرا جناب میر مظفر حسین صاحب قبلہ متخلص بضمیر بنام مرزا دبیر"

مرزا دبیر صاحب۔ بُرہانِ من، اعتضاد من، اعتماد من سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد اشتیاق دیدار فرحت آثار واضح رائے باد کہ از چند روز درم کلہ تا بر ذقن و حرارت تپ و شدائد اوجاع بکدے دارم کہ قابل تحریر نیست عندالملاقات مشاہدہ خواہند نمود۔ چونکہ تاریخ نسبت دسیوم مقرر کردہ آں عزیز باتمیز است در ادائے تحائف تخواہد شد۔ بہماں وقت تحصیل ثواب نمایند و یوم الجمعہ در عدم ملاقات تا سعیا خوردم بسلامی علیکم وتحیٰی لدیکم۔

رقیمہ ضمیر عفی عنہ۔"

مرزا دبیر کا انتقال ۹ مارچ ۱۸۷۵ء کو ہوا۔ اُن کے انتقال کے بارے میں اودھ اخبار لکھنؤ میں جو خبریں اور مضامین شایع ہوئے تھے۔ وہ مرزا صاحب کی زندگی اور مرثیہ گوئی پر اچھی خاصی روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ اخبار اب نایاب ہے۔ راقم کو اس کی ایک فائل ۱۸۶۷ء سے ۱۸۷۵ء تک لکھنؤ میں دستیاب ہوئی تھی اس لئے ذیل میں مرزا دبیر سے متعلق بعض اہم اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔

اودھ اخبار مورخہ ۱۰ مارچ ۱۸۷۵ء مطابق یکم صفر ۱۲۹۲ھ

"جناب مرزا دبیر کی رحلت

ہیہات۔ ہیہات۔ ہیہات۔ صد ہزار حیف کہ اقلیم سخن لٹ گئی۔ آفتاب کمال غروب ہوگیا۔ مرثیہ گوئی کا خاتمہ بالخیر ہوا۔ یعنی افصح الفصحا، ابلغ البلغا، سحبانِ زمان، طوطی ہندوستان، شاعر بے نظیر جناب مرزا دبیر نے دفعتہً اندوہ انیس ہوکر شمع ساں اپنے جسم ناتواں کو گھلا دیا۔ اور آخر کار چند روز بے آب و دانہ رہ کر امراض زدم کبد وغیرہ میں اس عندلیب معانی نے گلزار اقدس کا رستہ لیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس واقعہ حسرتناک سے تمام لکھنؤ میں کہرام مچا ہے۔ ہر کہ و مہ کی جان پر وہ سخت صدمہ ہے کہ جس کا بیان قلم اندوہ رقم سے نہیں ہو سکتا۔ واضح ہو کہ منگل کی اخیر شب کو یعنی ۲۹ محرم کو یہ حادثہ واقع ہوا۔ تمام عمائد و امرا و ہزارہا اشخاص لکھنؤ کے اس خبر وحشت اثر کو سن کر جوق جوق جناب مغفور کے مکان پر چلے آتے ہیں روتے ہیں، پیٹتے ہیں، چلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے۔ تجہیز و تکفین کی کیفیت آئندہ رقم ہوگی۔ ایسے شہنشاہ سخنوری کے اٹھ جانے سے کسی کو بھی اس وقت تاب تحریر اور طاقت تقریر نہیں ہے۔ ہائے ہائے کیسا شخص مرگیا۔"

اودھ اخبار لکھنؤ۔ مورخہ ۱۴ مارچ ۱۸۷۵ء مطابق ۵ صفر ۱۲۹۲ھ

"مختصر سوانح عمری حضرت دبیر مغفور

جناب مرزا سلامت علی صاحب المتخلص بہ دبیر فن مرثیہ گوئی میں بے مثل اور لاجواب تھے۔ ہندوستان میں آفتاب تھے۔ سوا اس کے عابد شب زندہ دار تھے اور خاتم روزہ دار تھے۔ پندرہ سولہ برس کا سن تھا کہ شوق ماتوق سلام اور مرثیہ گوئی کا ہوا اور اصلاح وغیرہ

وغیرہ میاں دلگیر شاعر بے نظیر سے تھے لہٰذا ان
مرثیہ گوئی وغیرہ میں نام عالی پیدا
کیا۔ میاں دلگیر صاحب ایسا شاگرد پا کر خوشی
سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ سوا ان کے اور
کسی کو دل لگا کر نہ بتاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ایسا
نام پیدا کیا کہ سرکاروں میں پہنچے۔ نواب اصغر علی
خاں جنت آشیاں علیین مکان والد ماجد
نواب ممتاز الدولہ بہادر کے ملازم ہوئے
اور یہی وجہ اور قدامت ہے کہ نواب ممتاز الدولہ
بہادر آج تک مانتے اور اپنا ملازم قدیم
جانتے تھے۔ بوجہ قدامت و مداحی جناب
سید الشہدا علیہ الاف التحیات تعظیم
فرماتے تھے اور اپنے برابر بٹھاتے تھے اور
بھی سرکاروں میں اُن کی عظمت و رفعت
ہونے لگی اور مہاراجا میسور رام راجہ بہادر
بانیان و شکرگزار اُن کو بدل و جان مانتے
تھے۔ بادشاہان رفیع المکان منیع الشان
اودھ نے اُن کی نہایت قدردانی کی بالتخصیص
حسب۔ بہ بادشاہ سے تا حضرت واجد علی شاہ
بادشاہ سب نے مہربانی کی۔ چنانچہ جب
بارہ سو اکہتر ہجری میں مرزا صاحب
کلکتہ تشریف لے گئے۔ واجد علی شاہ
بادشاہ کی خدمت میں عرضداشت بھیجی
اور یہ شعر بادشاہ نے دستخط فرمایا ؎

گریہ سر و چشم من بیائی
بر قلب نہم کہ کیمیائی

جب مرزا صاحب پہنچے جس مکان میں تھے
اس کے دوسرے درجہ تک حضرت واجد علی
شاہ آئے اور پیشوائی کر کے لے گئے اور
اس قدر تعظیم و تکریم فرمائی کہ جیسے کوئی
برابر والے کی عزت اور توقیر کرتا ہے
اور اپنے مرثیہ میں شاہ اودھ نے بہت
سے بند اُن کی تعریف اور توصیف میں
پڑھے۔ چنانچہ یہ مصرع ارشاد حضرت ظلِ
سبحانی ہے ع

"جس کے ہنر سے عاشق نظم دبیر ہوں"

اس وقت مرزا صاحب مغفور نے بھی
کھڑے ہو کر یہ مصرع پڑھا ع

"تعظیم کلام کو دبیر اُٹھا ہے"

شاہ اودھ نے فرمایا۔ آپ بیٹھ جائیں اور
بعد فاتحہ خوانی کے شاہ نے عزت افزائی
کیا اور پانچ سو روپے دوبارہ عنایت، خلعت
فرمائے اور مثل سال گزشتہ امسال بھی
عظیم آباد سے مرزا صاحب نے عرضی بھیجی
چنانچہ پانچ سو روپے جناب مرزا صاحب
مغفور دوبارہ عطا فرمائے۔ بہتر سال کا
سن تھا۔ طاقت جواب دے چکی تھی۔ امسال
عظیم آباد میں تشریف لے گئے اور نو دن
تاریخ تک مومنین و سامعین بہت جمع تھے
مرثیہ طولانی بہت زور و شور سے پڑھا
اسی وقت سے اختلاج قلب شروع ہوا۔
دیر پر اپنے گھر آئے۔ دس دن تک
نہایت علیل رہے۔ ۲۹ محرم کو رحلت
فرمائے دارالبقا ہوئے۔ گروہ مومنین
و سامعین خواص و عوام جنازہ کے ہمراہ تھا۔
گریہ و بکا سے سب کا حال تباہ تھا۔ جمعرات
کو بتاریخ دوم صفر سوم ہوا۔ نواب ممتاز الدولہ
بہادر نے شریک سوم ہو کر عزت افزائی

فرمائی۔ جناب مرزا اوج صاحب پسر مرزا صاحب نے قریب دس بارہ رباعیوں کے حسب حال اپنے اور وفات پدر بزرگوار پڑھیں جن کا سماعت کرنا اہل مجلس کو دشوار تھا۔ اور ہر ایک بشر گریہ و زاری سے بیقرار تھا۔ کہرام پڑ گیا۔ عجائب مضامین عالی تھے۔ گویا مرزا دبیر مرحوم پڑھ رہے تھے۔ تمام شہر کو ان کی مرثیہ گوئی میں جو شبہہ تھا دفع اور رفع ہو گیا۔ ہر شخص اُن کے پڑھنے کی تعریف کرنے والا اور مداح تھا اور ہر صغیر و کبیر کی زبان صدق بیان پر یہ کلمہ حق جاری تھا کہ الولد سرٌ لابیہ۔ مرزا صاحب کو یاد کر کے ہر شخص رونے لگا۔ کہرام پڑ گیا۔ رخصت مجلس شریف کے وقت نواب ممتاز الدولہ بہادر نے مرزا محمد جعفر صاحب متخلص بہ اوج کو گلے لگایا اور کل طلب فرمایا ہے یقین صادق ہے کہ خلعت عطا فرمائیں گے۔ مگر مضامین رباعیات سے پایا جاتا ہے کہ یہ مرزا صاحب مغفور کا نام روشن کریں گے کہ اچھوں کے اچھے ہوتے ہیں اور جناب مرزا صاحب کچھ فقط لکھنؤ میں نامور نہ تھے۔ حیدرآباد، عظیم آباد، سندھ بلکہ تمام ہندوستان میں حتیٰ کہ کربلائے معلیٰ تک مشہور تھے۔ اُن کے نام نامی کو گویا عالمگیر کہنا چاہئے۔ خاک اس گردش دوراں پر کہ اس کی گردش سے ایسا کامل پردۂ خاک میں مل جائے۔ مگر سوائے صبر کے کیا چارہ ہے۔ مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ اب خدا سے یہی دعا ہے کہ خدا مرزا اوج کو سلامت

رکھے کہ تسکین بخش زمانے رنجور ہیں۔ یادگار جناب مرحوم مغفور ہیں۔ آئندہ جو سنا جائے گا لکھا جائے گا۔ ان دنوں لکھنؤ میں ایک نامی گرامی شاعر منور علی خاں غنایاں تشریف لائے ہوئے ہیں۔ ذوقؔ کے شاگرد رشید اور متوطن چھنگرہ کے ہیں۔ آپ ہی کی وجہ سے ایک صحبت خاص مشاعرہ کی جناب منشی مظفر علی خاں بہادر کے صاحبزادوں کے اہتمام سے درمیں وال منعقد ہوئی تھی۔ ایک واسوخت آپ کا مطبع اودھ اخبار میں چھپا ہے اور دیوان عنقریب چھپے گا۔ چونکہ اس عرصے میں مرزا دبیرؔ نے انتقال فرمایا پس حضرت غنایاں نے ایک نہایت عمدہ تاریخ قطعہ لکھ کر بھجوایا جس کو ہم درج اخبار کرتے ہیں۔ جزاہ اللہ۔

" داغ الم دبیر ۱۲۹۲ھ

دبیر سخنور چوں رفت از جہاں
سخن شد سیہ پوش ماتم تمام
سر پائے خود را فرا باختند
فصاحت بلاغت طلاقت تمام

اودھ اخبار مورخہ ۱۷ مارچ ۱۸۷۵ء مطابق ۹ صفر روز چہار شنبہ ۱۲۹۲ ہجری کے شمارے میں درج ذیل عبارت شائع کی گئی ہے :۔

"۔۔۔ مارچ میں مختصر سوانح عمری حضرت دبیر صاحب مغفور کی لکھی گئی تھی اس میں ایک غلطی ہو گئی ہے کہ بجائے ضمیر کے مرزا صاحب کو شاگرد میاں دلگیر کا لکھا ہے اور کچھ حال اور باقی رہ گیا تھا۔ وہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کو ایک بڑا توسل سرکار ملکہ زمانیہ اور نواب سلطان عالیہ دختر نواب ملکہ زمانیہ سے بھی تھا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے

کا سلوک انھیں دو سرکاروں نے کیا تھا اور آج تک نواب ممتاز الدولہ بہادر سلوک فرماتے ہیں۔ جب مرزا صاحب کے انتقال کا وقت آیا، پانچ بجے صبح کو نماز صبح پڑھی اور حال ابتر ہونے لگا۔ اُس وقت میاں اوج نے کہ فرزند مرزا صاحب کے ہیں کر پوچھا کہ "مجھ کو کس کے سپرد کیا؟" فرمایا "تمھیں خدا کو سونپا" اور انتقال کیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ از بسکہ بروز سوم حالت طبیعت داری میاں اوج صاحب کا بخوبی سب کو دریافت ہو گیا کہ اکثر رباعیات تصنیف فرما کر پڑھیں۔ اب وہ رباعیاں بھی واسطے ملاحظہ ناظرین سخن فہم کے درج اخبار کرتے ہیں"۔ (کل رباعیاں ۱۰) ذیل میں چند رباعیاں درج کی جاتی ہیں: ۔

ناکام کو کامیاب کر دیتا ہے
وہ غیب سے فتحیاب کر دیتا ہے
کافی ہے اُسی کی مہربانی اے اوج
جو ذرّے کو آفتاب کر دیتا ہے

... ...

رو رو کے بجا ہے دیں اگر دم اپنا
تھا سلخ کو غرۂ محرم اپنا
اُن کا ماتم تو کیا کریں گے اے اوج
ہاں آج سے ہم کریں گے ماتم اپنا

... ...

افسوس بلیغ نکتہ پرور نہ رہا
نہ قدر شناس اہل جوہر نہ رہا
روشن ہے کلام کی بقا سے اے اوج
آئینہ رہا مگر سکندر نہ رہا

... ...

شعلہ سینے سے بر زباں اُٹھتا ہے
نالۂ خونبار خوں فشاں اُٹھتا ہے
اے آتش غم بس اب کلیجے کو نہ پھونک
مجلس بے چین ہے دھواں اُٹھتا ہے

... ...

اخبار کی اس اشاعت میں جو تاریخی قطعات مختلف شاعروں کے شائع ہوئے ہیں اُن میں سے بعضوں کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں: ۔

(۱) عبد العلی آسی (۱۷ شعر)
پرسیدم از دبیر فلک حال رحلتش
پیوستہ آں بہ رحمت حق گفت سال او
۱۲۹۲ ہجری

(۲) ہدایت اللہ خاں ہدا (۴ شعر)
سال تاریخش چو جستم از فلک آمد ندا
سدرہ بے روح القدس ہیند و منبر بے دبیر
۱۲۹۲ ہجری

(۳) منشی محمد مرزا جان صاحب محمود (۹ شعر)
فلک کے یادر ہیں گے ہمیں یہ جور و ستم
کہ ایک رنج سے ہے رنج دوسرا توام
لکھی فلک کی شکایت میں اس طرح تاریخ
غم انیس میں ہے ہے "زیادہ دبیر کا غم"
۱۲۹۱ھ　　۱۲۹۲ ہجری

(۴) سید حسن الفت (۱۲ شعر)
روز شنبہ تھا اور سلخ محرم وقت صبح
ماتم شہ میں ہوئے یہ ماہ غم کے ساتھ اخیر
ہر طرح اللہ نے اُن کو کیا تھا اہل دل
تھے رجوع قلب سے شاگرد دلگیر و ضمیر
ہاں الم سے سر اُٹھا تاریخ لکھدی تحریر
باغ بے بلبل ہے ہندوستان لطافت بے دبیر
۱۲۹۲ھ

(۵) منشی سید باقر علی حیرت (۴ شعر)

در بزم لبِ لعل چو بکشود دبیر
جز مدحتِ شہ زباں نہ فرمود دبیر
حقا خضرِ سخنوری بود بدہر
میدانِ بدیع مدح پیمود دبیر
ایں مصرع زباں شمع خواند بہ بزم
مصباحِ شبستانِ علی بود دبیر
۱۲۹۲ ہجری

(۶) منشی محمد فدا علی فارغ

انیسویں کو ماہِ محرم کی چرخ نے
کیا لکھنؤ میں فتنۂ ماتم بپا کیا
یعنی کہ نقشِ ہستیِ مرزا دبیر کو
حرفِ غلط کی طرح سے یکسر مٹا دیا
فارغ نے پوچھا دل سے کہ ہے کوئی اس کا مثل
تو اس نے یہ جواب اُسے برمحل دیا
حق تو یہ ہے کہ آپ ہی اپنا تھا وہ نظیر
ہاں منہ بھی مدعی کا کسی نے نہیں کیا
لیکن ہمارا قول یہی ہے کہ بالیقیں
طے ہوگیا دبیر محقق پہ مرثیہ
۱۲۹۲ھ

مشہور ہو تو مصرعِ تاریخ یوں بھی ہے
طے ہو چکا دبیر محقق پہ مرثیہ "
۱۲۹۲ھ

اسی اشاعت میں ذیل کی تاریخیں بھی درج ہیں :۔

(۱) " دبیر عطار منش حیف شد " = ۱۲۹۲ھ
(۲) خواندم سال دبیر سطرِ اجل = ۱۲۹۲ھ
(۳) ہے ہے دبیر مرثیہ گو مر گئے = ۱۲۹۲ھ
(۴) پورا کیا دبیر نے دادی مرثیہ = ۱۲۹۲ھ
(۵) ذاکرِ سیدِ دیں بود دبیر = ۱۲۹۲ھ
(۶) مروجِ ملکِ مرثیہ بودہ دبیر = ۱۲۹۲ھ

اودھ اخبار میں مرزا دبیر کے چہلم کا حال ذیل کے الفاظ میں درج ہے :۔

" تاریخ ۲۳ صفر کو مرزا دبیر کا چہلم ہوا مجلس میں صدہا رئیس اور شاہزادے اور امیر و اُمرا جمع تھے۔ مرزا اوج نے اول رباعیات تو تصنیف پڑھیں۔ تمام محفل میں وجد کا عالم تھا۔ بعدہٗ قطعۂ تاریخ وفات پڑھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ بعینہٖ مرزا صاحب پڑھ رہے ہیں۔ اس کے بعد حضرت امام زین العابدین کے دربار میں تشریف لے جانے اور حاکم کے انصاف نہ کرنے کا حال پڑھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ بعینہٖ مرزا صاحب پڑھ رہے ہیں۔ اس وقت گویا قیامت برپا ہوگئی تھی۔ آخرش مرثیہ نہ پڑھ سکے ؎

خاک بر سر کن صبا در ماتمِ سلطانِ غم
حیف شد برباد اقلیم بلاغت بے دبیر
نیست آں نسم انشر دیباچۂ معنی و لفظ
ہست اکنوں ابتر اجزائے طلاقت بے دبیر
بنگر اندر بوستاں بر سرِ نخل ماتم است
در چمن نرگس سراپا چشمِ حیرت بے دبیر
غیر ممکن طالبِ دیدار در شام و سحر
اندریں فرقت سرایک لحظہ راحت بے دبیر
نے دلِ مہجور را آرام بے وصلِ حبیب
نے مذاقِ زندگانی را حلاوت بے دبیر
مصرعِ تاریخ تو نقش منشیِ گردوں نوشت
آسماں بے بہرہ نہیم فصاحت بے دبیر "

مورخہ ۹ فروری ۱۸۷۵ء کے اودھ اخبار میں کسی نامعلوم شخص کا ایک طویل مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں مرزا دبیر کے معرکہ آرا قطعۂ تاریخ وفات میر انیس کے اس مصرعہ پر ع

طورِ سینا بے کلیم اللہ منبر بے انیس

اعتراضات کئے گئے۔ دبیر ہی کی طرف سے ان اعتراضات

کے جواب بھی اخبار کی اسی اشاعت میں چھپے ہیں۔ اخبار کے صفحہ ۱۸۹ میں مادۂ تاریخ کی صحت کے بارے میں مرزا دبیر کا ایک رقعہ بھی شائع ہوا ہے۔ اس خط کا خود راقم کی نظر سے اور کہیں نہیں گزرا۔ اور غالباً مرزا دبیر کے آخری مکتوبات میں ہے۔ خط فارسی میں ہے اور ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"رقعہ"

سال تاریخش بزبر و بینہ مرقوم شد
طورسینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

در مصرع تاریخ ارباب اشغال کثیرہ فرصت ملاحظہ قواعد تاریخ و معمائی ندارند۔ شاید بتکمیل اعداد کہ فی الحقیقت کامل است گمان تنقیص می نمایند۔ لہٰذا جہت رفع توہم اعداد و حروف مرقوم می شود در زبر و بینات۔

طورسینا	بے منبر	کلیم اللہ	و بے انیس
۸۶	۹۰	۵	۳

آحاد	عشرات	آت	آحاد	عشرات زبر
۴۰۶	۴۰	۴	۵	۳

در کتب مورخان مستند مصنف را مخیر ساختہ کہ اختیار است خواہ بلفظی زبر و بینہ بگیر خواہ بلفظی نقط بینہ بگیرد جائز است و قطعۂ ثانیہ انشاء اللہ تیاری شود قدم رنجہ فرمائید تا التماس ضروری بمعائنہ نمودہ شوند۔

والسلام

"دعا گوئی بقا مشتاق لقا دبیر عفی عنہ"

مرزا دبیر کی تائید میں مرزا حاتم علی مہر اپنے "رسالہ در ثبوت صحت تاریخ" صفحہ ۳ میں لکھتے ہیں کہ

"دبیر نے جو تاریخ صاحب بیان سلیس و طبع نفیس جناب میر ببر علی صاحب انیس کے انتقال کی باقاعدہ زبر و بینہ کمال جدت کے ساتھ فرمائی۔ اس کی سمجھ میں نابلدان کوچۂ تحقیق کو انتہائی پریشانی ہوئی کہ آخر سمجھانے کی نوبت آئی۔ سید بادشاہ علی صاحب متخلص بہ بقا ابن میر وزیر علی صاحب صبا اسکنہ اللہ فی الجنتہ المادی خویش مرزائے مغفور نے اس کی کیفیت واقعی ناواقفوں کے ذہنوں پر جالی کرنے کا طریقہ سوال و جواب کا ایجاد کیا اور انجام تفہیم نکات و غوامض سے طبیعت مستفیدین کو شاد کیا۔"

مہر کی عبارت بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا ۹ فروری سنہ ۱۸۷۵ء کے اودھ اخبار کی اشاعت میں دبیر کی حمایت میں جو بحث چھڑ گئی تھی اور جس میں مضمون نگار نے اپنا نام نہیں دیا تھا اُس کے محرک مرزا دبیر کے خویش میر بادشاہ علی بقا لکھنوی ہیں۔

مجموعۂ مراثی دبیر

اردو کے محسن عظیم جناب منشی نول کشور آنجہانی کی فیاضی، رواداری اور علم دوستی کا کیا کہنا۔ اُنھوں نے مرزا دبیر کے انتقال کے چند ہی مہینوں کے بعد مراثی دبیر کی دو جلدیں مطبع اودھ اخبار لکھنؤ سے شائع کیں پہلی جلد دسمبر سنہ ۱۸۷۵ء مطابق ذی الحجہ سنہ ۱۲۹۲ھ اور دوسری جلد اپریل سنہ ۱۸۷۶ء مطابق ماہ ربیع الاول سنہ ۱۲۹۳ ہجری میں چھپی۔ دونوں جلدوں کے آخر میں "خاتمۃ الطبع" کے عنوان سے غلام محمد خاں ایڈیٹر اودھ اخبار کی تقریظ درج ہے جو ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔ اس تقریظ سے مرزا دبیر کے بارے میں بعض نئی معلومات فراہم ہوتی ہیں:

"زمانہ کو ہمیشہ اس بات کی حسرت رہی کہ میر انیس اور مرزا دبیر کا کلام یکجا دیکھیں۔ طبع ہونا تو درکنار یوں بھی کسی کو نہ ملتا تھا پس یہ آرزو کیوں کر حاصل ہو سکتی اس واسطے کہ ہزاروں روپیہ کے صرف کرنے پر بھی ایسی امید کا بر آنا محال تھا۔ یہ دونوں شاعر جو مرثیہ گوئی میں بے نظیر تھے ان کا ایک ایک مرثیہ گنجینۂ گوہر شاہوار تھا۔ لطف یہ ہے کہ باوصف اس بات کے یہ نامی شاعر ہمیشہ اپنے

کلام کو پوشیدہ کرتے رہے۔ تاہم تمام جہان میں یہ شہرت پائی کہ شاید اپنے زمانے میں انوری اور قاآنی کو بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ الغرض یہ متاخرین کے افتخار اس زمانے میں گزرے جن کا مثل نہ پیدا ہوا نہ ہوگا۔ مرزا دبیر کی فصاحت و بلاغت اور سخن سنجی کا بیان کرنا ایسا ہے جیسا کوئی سحبان وائل کا ذکر کرے اور پھر لکھے کہ وہ کس کا شاگرد تھا اور کیسا فصیح اللسان گزرا۔ گویا ایک فعل عبث ہے۔ مگر ہاں یادگار زمانہ کے لئے اتنا لکھ دینا کافی ہوگا کہ حضرت مرزا دبیر علاوہ مرثیہ گوئی اردو کے علم و فضل میں بھی پایۂ عالی رکھتے تھے اور بہت بڑے مرتاض اور عابد و پرہیزگار تھے۔ مختصر ایسے بڑے کہ مدت العمر میں لاکھوں روپیہ پیدا کیا مگر روپیہ کو خذف ریزہ سے بدتر سمجھا۔ ایسے شخص کو اگر اپنے وقت کا حاتم کہئے تو سزاوار تھا۔ اکثر اوقات جب کچھ روپیہ پاس نہ ہوتا تھا تو نقد کلام یا گھر کے برتن تک سائل کی نذر کرتے تھے۔

یہ ایک مشہور بات ہے کہ ایک سائل کو حضرت دبیر نے اپنا مرثیہ عطا کیا۔ وہ حیدرآباد لے گیا اور وہاں ایک ہزار روپیے کو بیچ دیا۔ خلاصہ یہ کہ کبھی سوال سائل کا رد نہ کرتے تھے۔ ہمیشہ توکل پر گزران تھی اکثر شاگرد آپ کے از راہ دل سوزی کبھی کبھی گستاخ ہو کر اگر عرض بھی کرتے کہ آپ اولاد کا حق تو رکھا کیجئے تو فرماتے کہ بھئی خدا مالک ہے۔ غرضیکہ ایک ہی مخیر و متوکل تھے۔

اس برگزیدہ شاعر نے ۷۲ برس کے سن میں بعارضۂ اختلاج و امراض کبد وغیرہ محرم الحرام کی ۲۹ تاریخ منگل کے دن وفات پائی تھی چونکہ کلام فصاحت نظام اس بلبل ہندوستان کا ایک زمانہ مشتاق تھا۔ اس واسطے جناب مالک مطبع اودھ اخبار نے چاہا کہ جس طرح ہو سکے اس کو طبع کیجئے چنانچہ جناب مرزا محمد جعفر صاحب اوج فرزند حضرت دبیر مرحوم سے استدعا کی۔ مرزا صاحب موصوف نے جس قدر مسودے تمام مرثیوں کے بہم پہنچے سب عنایت کئے۔ پھر کیا دیر تھی۔ فی الفور مجموعہ مرثیہ مرزا دبیر طبع ہونا شروع ہوا۔ چونکہ یہ مرثیے مرزا اوج صاحب کے عنایت کئے ہوئے ہیں۔ اس واسطے یقین ہے کہ صحیح اور بلا تصرف ہوں گے۔ اس میں کلام نہیں کہ مرزا اوج صاحب نے اس خصوص میں نہایت فیاض چشمی سے کام کیا اور حفظ وصیت کیا کیوں کہ کوئی کلام بدون طبع ہونے کے کامل طور پر محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس کلام معجز نظام کی کیا تعریف ہو سکے۔ انصاف یہ ہے کہ اگر شاعری پیغمبری ہوتی اور اس کا اردو زبان کی فصاحت پر انحصار و دار و مدار ہوتا تو مرزا دبیر ہی کا حق تھا۔ ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ بفضلہ اب یہ مجموعہ مطبع نول کشور مقام لکھنؤ ماہ دسمبر ۱۸۷۵ء میں چھپ کر شائع ہوا۔"

مطبع اودھ اخبار کی یہ دونوں جلدیں اب نایاب ہیں اور عنقا کا حکم رکھتی ہیں۔ ان جلدوں کے بعد دو جلدیں مطبع نولکشور لکھنؤ سے چھپیں۔ یہ بھی نایاب ہیں۔ علاوہ اس مجموعہ مراثی دبیر کے دفتر ماتم جلد اول کے نام دبیر کے مرثیے ۱۳۰۰ ہجری مطابق ۱۸۸۲ء اور دفتر ماتم جلد دوم ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں باہتمام قاری یعقوب علی نصرت مطبع شوکت جعفری لکھنؤ سے شائع ہوئے۔ دبیر کے مرثیے دفتر ماتم کی بیس جلدوں میں چھپ گئے۔ سید سرفراز حسین خبیر لکھنوی شاگرد مرزا اوج نے "سبع مثانی" مؤلف مہذب اللغات سید محمد میرزا نے شعائر دبیر کے نام اور رام نرائن لال بینی مادھو نے انتخاب مراثی شائع کیا۔ حال ہی میں مکتبۂ جامعہ دہلی سے بھی مرزا دبیر کے چند مرثیوں کا انتخاب چھپا۔ یہ بھی مرثیے دفتر ماتم کی جلدوں میں شامل ہیں۔ دفتر ماتم کی ۲۰ جلدیں نایاب ہیں۔

بقول سید افضل حسین ثابت لکھنوی مصنف حیاتِ دبیر دفترِ ماتم کی جلدوں میں درج ذیل مرثیے الحاقی شامل ہو گئے ہیں :-

نمبر شمار	مطلع	دفترِ ماتم
(۱)	جو زائرِ حسین علیہ السلام ہو	جلد ۴ مرثیہ ۵ ص ۱۸۱
(۲)	شیرِ خدا کا شیر ہے آ جو نے مصطفےٰ	" ۵ " ص ۱۳۵
(۳)	عباسؑ کو جو سبطِ نبی نے علم دیا	" ۷ " ص ۶۷
(۴)	شاہ مرداں سے کم نہیں ہیں غلامانِ مصطفےٰ	" ۸ " ص [illegible]
(۵)	یا رب غم حسین کی عزت عظیم ہے	" ۹ " ص ۱۶۷
(۶)	کیا ذاتِ ذو الجلال غفور و رحیم ہے	" ۱۱ " ص ۳۰

ثابت لکھنوی مطبع اودھ اخبار لکھنؤ میں چھپے ہوئے مرثیوں میں ذیل کے مرثیے کو بھی الحاقی گردانتے ہیں۔

ع مرآۃ علم ہے یہ عزا خانہ بےکس کا

لیکن راقم الحروف کو یہ مرثیہ جناب محمد رشید صاحب کے ذخیرۂ مراثی میں مرزا دبیر کے تخلص سے ملا ہے اور اس پر ۱۲۷۹ھ کی تاریخ بھی درج ہے۔ لہٰذا ثابت لکھنوی کا یہ کہنا درست نہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرثیہ دبیر کے بھائی نظیر کی تصنیف ہے۔

دفترِ ماتم کی ۲۰ جلدوں میں پہلی جلد سے چودھویں جلد تک مراثی ہیں۔ ان کی تعداد ۳۶۸ ہے۔ تفصیل یہ ہے :-

نمبر شمار	تعداد مراثی
جلد ۱	۲۵
" ۲	۲۵
" ۳	۲۹
" ۴	۲۷
" ۵	۲۷
" ۶	۲۹
" ۷	۲۵
جلد ۸	۳۰
" ۹	۲۶
" ۱۰	۲۷
" ۱۱	۲۷
" ۱۲	۲۹
" ۱۳	۲۳
" ۱۴	۱۹

میزان جلد ۱ تا جلد ۱۴ = ۳۶۸

جلد ۶ اور جلد ۱۲ میں مرثیہ

"اے مومنو کر لو علی اکبر کی زیارت"

کی تکرار ہے۔ یہ اور الحاقی ۶ مرثیے وضع کر کے (۷-۳۶۸) دفترِ ماتم کی پہلی ۱۴ جلدوں میں مرثیوں کی تعداد ۳۶۱ ہے۔

دفترِ ماتم جلد ۱۵ : اس جلد میں دو مثنویاں ہیں۔ پہلی مثنوی کا نام "احسن القصص" ہے۔ اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات ولادت و وفات نیز معجزات بنظم کیے گئے ہیں اور دوسری مثنوی بعنوان معراج نامہ ہے۔ یہ ص۱۹۳ سے شروع ہوتی ہے اور ص۱۹۵ پر خاتمہ درج ذیل اشعار پر ہوتا ہے ؎

بحقِ رسولانِ عالی وقار
بحقِ امامانِ والا تبار
رہے جب تلک سیرِ باغِ جہاں
رہے جب تلک آب قلزم رواں
رہیں جب تلک روز و شب مہر و ماہ
رہے جب تلک چرخ انجم سپاہ
بری رنج و غم سے رہیں مومنیں
فرحناک و شاداں رہیں اہلِ دیں

مثنوی "احسن القصص" کی ابتدا ذیل کے اشعار سے ہوتی ہے :-

جسے حق نے بخشی ہے تدبیر وضیع
وہ برحق یہ پہلا ہے ماہ ربیع
خصوص آج کا روز کیا روز ہے
کہ شادی ہے ہفتہ کہ نوروز ہے
جھکے ہیں فلک کس کی تسلیم کو
کھڑی ہے زمیں کس کی تعظیم کو

دفتر ماتم جلد ۱۶ تا ۱۸

دفتر ماتم کی ان تینوں جلدوں میں الف سے لے کر ے تک ۳۳۳ مسلسل ردیف وار سلام ہیں۔ جلد ۱۶ میں ۱۱۰، جلد ۱۷ میں ۱۲۴ اور جلد ۱۸ میں ۹۸ سلام ہیں۔ ان میں سے کچھ سلام مرزا دبیر کے شاگردوں کے ہیں جن کا [illegible] سلام سے معلوم ہوتا ہے۔ مؤلف حیات دبیر نے بھی چند سلام ہیں۔

دفتر ماتم جلد ۱۹

اس جلد میں ۴۲ مخمس سلام ہیں۔ انھی میں وہ مخمس بھی ہے جو بمنقبت بند ملا کاشی علیہ الرحمہ پر فارسی میں مصرع لگا کر دبیر نے تخمس کیا ہے۔ یہ پہلے شمس المرثین کے نام سے چھپ چکا تھا۔ مصرعے اکثر اچھے لگائے ہیں کہ پانچوں مصرعے ایک ہی شخص کے معلوم ہوتے ہیں۔ یہی حال اکثر مخمسوں کا ہے۔ اس مخمس کے بارے میں میر صفدر حسین لکھتے ہیں:۔

"ملا حسن کاشی در مناقب جناب
امیر المومنین ہفت بند نظم نمودہ مرزا
دبیر بر حیثیت ایں مخمس نمودہ و بر ہر بند
مصرع سہ مصراع افزودہ۔ لاریب کہ
آنجناب در فارسی و اردو و عربی در
ہمہ زبان نظم فرماید۔" ۱۲

دفتر ماتم جلد ۲۰

یہ مراثی دبیر کے دفتر ماتم کی آخری جلد ہے۔ اس میں ردیف وار رباعیاں، نوحے اور واقعات اور نظمیں اور مناجات وقطعات وغیرہ متفرق کلام ہے۔ جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

دفتر ماتم میں کوئی قصیدہ مرزا دبیر کی تصنیف سے نہیں ہے۔ لیکن وہ قصیدے بھی کہتے تھے۔ مرزا اوج نے اپنی کتاب مقیاس الاشعار ۱۳ میں اُن کا ایک قصیدہ بجواب قصیدۂ رشید الدین وطواط لکھا ہے۔

مرزا دبیر کے غیر مطبوعہ اور نایاب مرثیے

مرزا دبیر زود نویس اور بسیار گو تھے۔ اُن کے مرثیوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تھی۔ اُن کی زندگی میں اور اُن کے کارناموں پر جو کتاب سب سے پہلے لکھی گئی ہے وہ میر صفدر حسین کی شمس الضحیٰ ہے۔ کتاب کی تصنیف کے وقت مرزا دبیر کا سن پچاس سال سے اوپر تھا۔ اس وقت تک مرزا دبیر تقریباً ہزار مرثیوں کے مصنف تھے۔ چنانچہ میر صفدر حسین کہتے ہیں:۔

"قریب دو ہزار مرثیہ در مصائب
و مناقب اہل عصمت است۔ یا در ذکر
سلامیات نذر جناب رسالت و از تعداد
رباعیات و تضمینات و سلامیات می سبب
ہم معترف بعجز و تصدیر است" ۱۴

مرزا دبیر کا بہت سا کلام دست برد زمانہ ہوا۔ راقم کی نظر سے اُن کے جو مرثیے نظر سے گزرے ہیں۔ اُن کی تعداد ۵۷۰ کے لگ بھگ ہے۔ جب کہ دفتر ماتم کی ۲۰ جلدوں میں ۳۶۱ مرثیے درج ہیں۔

راقم الحروف کو جناب سید محمد رشید صاحب کے ذخیرۂ مراثی میں دفتر ماتم کی ۲۰ جلدوں کے علاوہ ایسے بہت سے غیر مطبوعہ مرثیے دریافت ہوئے ہیں جو دفتر ماتم میں درج نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ موصوف کے کتاب خانے

میں مرزا دبیر کے قلمی مراثی کی چھ ضخیم جلدیں محفوظ ہیں۔ اُن میں تقریباً ایک سو سے زیادہ مرثیے ہیں جو دبیر کی زندگی میں نقل کیے گئے ہیں۔ بہت سے مرثیے ۱۲۵۳ھ اور ۱۲۹۲ھ کے درمیان لکھے گئے ہیں اور اُن میں بہت سے مرثیے ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ اردو کے تمام مرثیہ گویوں میں مرزا دبیر ہی ایسے واحد شاعر ہیں جنھوں نے زیادہ مرثیے کہے ہیں۔ اُنھوں نے اردو زبان کو اپنے کلام معجز نظام سے مالا مال کیا۔ کس قدر افسوس ناک اور دل خراش بات ہے کہ اتنے عظیم شاعر کی صد سالہ برسی بھی نہیں منائی گئی اور کسی ادارے نے آج تک ایک خصوصی شمارہ بھی شائع نہیں کیا۔

ذیل میں مرزا دبیر کے وہ غیر مطبوعہ اور نایاب مرثیے درج کیے جاتے ہیں جو راقم الحروف کو دریافت ہوئے ہیں۔ ان مرثیوں کے مطلعے حروف تہجی کے اعتبار سے لکھے جاتے ہیں۔

غیر مطبوعہ مراثی

نمبر شمار — مطلعے — کیفیت

(الف)

(۱) آتا ہے رن میں کون کہ ایماں کا زور ہے۔
(۲) آمد خزاں کی گلشن خیر الوریٰ پہ ہے
(۳) آمد ہے تاجدار ثریا جناب کی
(۴) آمد ہے خداوند شجاعان زمن کی
(۵) آیا خط مسلم جو امام مدنی کو
(۶) ارشاد مجھے یہ لوح و قلم سے
(۷) اصغرؑ کو جب کہ پیاس کی شدت سوا ہوئی
(۸) اسیر سے شہ بیکس و بے یار کی آمد
(۹) اہل فلک علیؑ کو اکرم خوردہ کہتے ہیں
(۱۰) اے آسمان زمین عدم میں نہاں ہو آج
(۱۱) اے باغ طبع رنگ بہار سخن دکھا۔
(۱۲) اے خالق سبحان تو مری عقل رسا کر

مکتوبہ ۱۲۶۲ ہجری
نام کاتب تفضل علی کا پور

(۱۳) اے دشت قتل دامن صد کوہ طور ہو۔
(۱۴) اے کلک قلم سلک قلمدان سے جدا ہو
(۱۵) انگشتری عرش کا یارب نگیں دکھا۔

(ب)

(۱۶) پامال جب کہ گلشن خیر الوریٰ ہوا۔
(۱۷) پیری میں اگر بخت جوان ہو تو مزا ہے

(ج)

(۱۸) جب تیغ انتقام دربند خدا نے کی
(۱۹) جب داخل وطن حرم مصطفےٰ ہوئے
(۲۰) جب رن میں آستین چڑھائی حسینؑ نے
(۲۱) جب رن چکے شبیرؑ عزیز و رفقا کو
(۲۲) جب زیب وہ منزل اول ہوئے شبیرؑ
(۲۳) جب زہر سے شہید جناب رضا ہوئے
(۲۴) جب شام میں ہر ایک طرف یہ خبر آئی
(۲۵) جب قرب ہوا آمد شہ پر نشور کا

اس کا ایک مخطوطہ ۱۱ر جمادی الاول ۱۲۴۸ھ کا مرتضیٰ حسین ناطق لکھنوی کے پاس ہے۔

(۲۶) جب کوفے میں پابند بلا ہو گئے مسلم
مکتوبہ ۱۲۷۴ھ

(۲۷) جب محفل حاکم میں شہ دیں کا سر آیا
مکتوبہ ۱۴ ذی الحجہ ۱۲۴۴ھ

(د)

(۲۸) دریائے نور کا دُرِ یکتا حسینؑ ہے

(ذ)

(۲۹) ذرہ ہے آفتاب در بوتراب کا۔

اس معرکہ آرا مرثیہ پر مرزا دبیر اور میر ضمیر میں راجہ میرا رام کے امام باڑے میں نا اتفاقی اور ناراضگی ہو گئی تھی۔

(۳۰) ذی قعدہ میں وہ قاعدے نہ جو سخن میں

(۳۱) زنداں میں　جہلم جو ہوا اہلِ حرم کو

مکتوبہ ۱۲۹۵ھ

(۳۲) زنجیر جہنم سے جب آزاد ہوا حُر

(ش)

(۳۳) شاہ شہدا مطلع تسلیم و رضا ہے

(ص)

(۳۴) صبحِ عاشور ہوا گرم جو بازار قضا

(ض)

(۳۵) فرجِ خدا ہے یا کہ کتاب خدا ہے یہ

(۳۶) فہرست پہ شبیرؑ کے لشکر کی رقم ہے۔

(ق)

(۳۷) قبضہ ہے علقمہ کی ترائی پہ شیر کا

(مکتوبہ بحیات دبیر)

(ک)

(۳۸) کس کے گل حدوث میں خوشبو قدم کی ہے

مکتوبہ بحیات دبیر

(۳۹) کس گھر میں آج حشر بپا ہو گا صاحبو

(۴۰) کیوں چرخ میں گردوں کی طرح رن کی زمیں ہے

(گ)

(۴۱) گہوارہ میں ذرندۂ اژدر علی علیؑ

(م)

(۴۲) مسافروں کی مدینے میں جب رسید آئی

مکتوبہ ۷ر جمادی الثانی ۱۲۸۶ھ

بقلم مظہر علی

(۴۳) مرمنوا شک بہانے کہ محرم آیا

(۴۴) مہر علم سرزد ہوا کرم ہوا طالع

بے نقط مرثیہ۔ خواجہ آتش نے اس کی بے حد تعریف کی تھی۔

(ہ)

(۴۵) ہر جلسے میں مشتاق یہی کہتے تھے رو رو

(۴۶) ہم ہیں وطن میں اور طبیعت سفر میں ہے

(۴۷) ہے مظہر العجائب معجز نما علیؑ

(ی)

(۴۸) یہ ترجمۂ آئینۂ لولاک نما ہے

مکتوبہ ۱۶ر صفر ۱۲۷۴ھ

بقلم محمد مہدی علی خاں کربلائی

نایاب مراثی ۱۴ھ

(الف)

(۴۹) آمدِ گل مرا نہ حسن پر خزاں کی ہے

(۵۰) اے طبع رواں سیف قلم جلد علم کر

(۵۱) اے مومنو شبیرؑ دو عالم کے شرف ہیں

(۵۲) اے مومنو کیا باعث ایجاد زمیں ہے

(ب)

(۵۳) بانو کا ہوا عقد جو سلطان امم سے

(ج)

(۵۴) جب حرم قلعۂ شیریں کے برابر آئے۔

اثر لکھنوی نے اسے انیس کی مرثیہ نگاری میں شامل کیا۔

(۵۵) جب رن میں ابن شیر خدا حملہ ور ہوا

(۵۶) جب صبح شب قتل نمایاں ہوئی رن میں

(۵۷) جب رن میں نخلِ شاخ امامت قلم ہوئی

(۵۸) جب صبح شب قتل نمایاں ہوئی رن میں

(۵۹) جب عابدِ مریض کو داغِ پدر ملا
(۶۰) جب عریضہ شہ کو صغرا نے بچشمِ تر لکھا
(۶۱) جب لالۂ شفق نے دکھائی بہارِ صبح

(س)

(۶۲) سلطینِ شہ قلعہ شکن آتے ہیں رن میں

(ع)

(۶۳) عاشورہ حسین کا واقعہ شدید ہے
(۶۴) عباسؑ جب کہ جانبِ کوثر رواں ہوئے
(۶۵) عباس علی جوہرِ شمشیرِ وفا ہیں
(۶۶) عزیزو حادثہ نو فلک دکھاتا ہے

(غ)

(۶۷) غل ہے کہ شہر میں اسیرانِ حرم آتے ہیں

(ف)

(۶۸) فولادی غربت میں کسی کا مزار ہے

(ق)

(۶۹) قریہ جو ہوا رشکِ چمن فصلِ چمن میں

(گ)

(۷۰) گلگونۂ رخسار فلک گرد ہے ان کی

(م)

(۷۱) ماتم کا مرتبہ ہے کہ خاموش ہے مجلس
(۷۲) مفتاح باغِ فصلِ سخن ہے زباں میری
(۷۳) متصل ہے چمن فصلِ بہاری کی ہے آمد

(و)

(۷۴) وہ کون دو یوسف ہیں کہ خوبی میں ہیں یکتا

(ہ)

(۷۵) ہاں اے قلم مرتبہ قدرت تو دکھا دے
(۷۶) سر سنگ بنا لعل و گہر مہرِ علی سے
غیر مطبوعہ

ابواب المصائب

مرزا دبیر نے مصائبِ کربلا پر نظم کے علاوہ نثر میں بھی اپنے زورِ قلم کا مظاہرہ کیا ہے۔ انھوں نے نثر میں ابواب المصائب کے نام ایک یادگار تصنیف چھوڑی ہے۔ یہ تصنیف مدت دراز سے ناپید ہے اور صاحبِ حیاتِ دبیر کو بھی اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا تھا۔ راقم الحروف کو اس کا ایک مکمل نسخہ جناب سید محمد رشید صاحب سے حاصل ہوا۔

ابواب المصائب رجب علی بیگ سرور (م ۱۲۸۶ھ) کے فسانۂ عجائب (سالِ تصنیف ۱۲۴۰ھ) کے بعد دبستانِ لکھنؤ کی دوسری نثری تصنیف ہے۔ یہ عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ (۱۲۴۳ھ — ۱۲۵۳ھ) میں لکھی گئی تھی۔ مرزا دبیر نے دیباچے میں بادشاہ کے کردار و اخلاق، سیرت اور عزاداری پر روشنی ڈالی ہے۔

مرزا دبیر نے "ابواب المصائب" میں حضرت یوسف کے واقعات پر آلِ عبا کے مصائب بیان کئے ہیں۔ ابتدا کے دس صفحوں میں دیباچۂ مصنف ہے۔ دبیر سببِ تالیف کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ:

"دریں ولا بتائیدِ غیبی اور بالہام لاریبی بندۂ حقیر کثیر التقصیر اعنی دبیر کا یہ عزم بالجزم ہوا کہ ترجمۂ سورۂ یوسف کا مشتمل بمصائبِ جنابِ سید الشہدا علیہ التحیۃ والثنا بطریقِ تازہ اور بحسن بے اندازہ اور دو نے تفاسیرِ معتبرہ اور احادیثِ معتمدہ کے تعزیہ داران جنابِ ابا عبداللہ الحسین علیہ السلام کے مطالعہ کے واسطے زبانِ اردو میں معنی کرے۔"

ابواب المصائب مرزا دبیر نے عالم شباب میں ۲۷ برس کے سن میں ایک ہفتہ میں ۱۲۴۵ھ میں تصنیف کی۔ سالِ تصنیف خود مصنف نے اشعارِ ذیل میں کہا ہے

اے زہے این کتاب حزن اثر
کہ مزین بنام آلِ عبا ست
در معانی ز لفظ ہر ذر فش
محضرِ خون سید الشہداست
سطر سطرش بجادہ تاثیر
مدِ آہِ جناب خیر نساست
ہست عاری عبارت از اغراق
چون الف ہست حرف حرف راست
در کتاب زمانہ این اوراق
یادگارِ دبیرِ بے سر و پاست
چون بلطف ائمہ گشت تمام
اے ہمیں لطف خضر منزل ماست
غور کردم بسالِ تاریخش
کہ ز آئینِ فرقۂ شعراست
ناگہاں فرج فرج آمدہ عقل
از چپ و راست داد مژدہ راست
گفت بامن کہ سالِ تاریخش
مصحفِ طاقِ چشمِ اہلِ عزاست
۱۲۴۵ھ

مرزا دبیر کی شہرت دُور دُور تک اُن کے زمانے میں پھیلی تھی۔ چنانچہ بقول صاحب شمس الضحیٰ ان کے مراثی :۔

"اکثر سوز خوانان در مجلس ذاکرین برسر منبر می خوانند ہزارہا مومنین فیض اجتماع یافتہ ... و دیگر امصار و بلدان ملک وسیع الفضائے ہندوستان و نصبات و قریات تا منتہائے کلکتہ و بمبئی و سورت و لاہور و ملتان و دکن و سندھ و کابل و کشمیر و لندن بلکہ در مکہ معظمہ و مدینہ منورہ و جنتہ البقیع و در نجف اشرف و در کربلائے معلیٰ و در روضۂ شاہ ... و در روضۂ خیر الناس حضرت عباس و خیمہ گاہ و در مجالس زوار کاظمین شریفین و سامرہ و در خراسان کہ اہل ہند مجالس تعزیت منعقد می سازند مراثی نظم نمودۂ آنجناب خواندہ می شوند۔"[1]

قدردانی کا یہ عالم تھا کہ خود بادشاہِ وقت واجد علی شاہ ایک مرتبہ دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لیے دورانِ مجلس ہاتھ میں چھتری لے کر مرزا دبیر پر سایہ فگن رہے۔ چنانچہ مذکور ہے :۔

"روزے در مجلس بالائے منبر بحضور اعلیٰ حضرت بخواندن مرثیہ اتفاق افتاد۔ ناگاہ شامیانہ کہ بالائے منبر ہمچو ابرِ رحمت سایہ گستر بود از ہوا پراگندہ گشتہ یکسو شدہ و عکسِ آفتاب بر روئے آنجناب (مرزا دبیر) افتاد فی الفور ظلِ اللہ چتر خود گرفتہ قریب منبر استادہ تا اختتام مرثیہ سایہ افگن ماند۔"[2]

حواشی

[1] فسانۂ عجائب ص ۱۵ مطبوعہ ۱۲۶۷ھ

[2] سرد ریاض ص ۲۶ مطبوعہ ۱۸۹۶ مطبع حیدری واقعہ آگرہ کٹرہ حاجی محمد حسین۔ مصنفہ محمد ریاض الدین امجد سندیلوی متخلص بہ ریاض

[3] میر محمد باقر سوداگر۔ محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کے

زمانے میں لکھنؤ کے مشہور و معروف تاجر تھے عزاداری دل و جان سے کرتے تھے اور ایام محرم میں ہزاروں روپے خرچ کرتے تھے۔ انھوں نے چوک لکھنؤ میں ایک خوبصورت اور عالیشان امام باڑہ ۱۲۵۳ھ ہجری مطابق ۱۸۳۷ء میں تعمیر کیا جو آج بھی اچھی حالت میں موجود ہے۔ اس میں میر ضمیر اور مرزا دبیر پڑھتے تھے۔ مرزا اوج نے اسی امامباڑے میں مرزا دبیر کے چہلم کے موقع پر مجلس پڑھی تھی۔ برق نے امامباڑہ کی تاریخ لکھی ہے ؎

میر باقر در دریائے سخا بحر عطا
سید و باقر و عالی نسب و ذی جاہی
تعزیہ خانہ بنا کرد چو برج خورشید
روشن از روزنِ پُر نور بہ گردِ ماہی
از چہ تشبیہ دہم عقل و خرد حیرانست
دیدہ بہر فلک مثل نہ دیدہ گاہی
بسکہ از بہر زیارت ز فلک می آیند
می شنیدند ز ارواح و ملک راہی
ہر کہ بیند بہ جہاں جن و بشر می گوید
نیست بالائے زمیں مثل چنانی گاہی
گفت تاریخ بنا روح امین نکرم
قبلۂ اہلِ جہاں مسند شاہنشاہی ۱۲۵۳ھ
(دیوانِ برق ص۱۵۴ مطبوعہ ۱۸۵۳ء)

۵۴ سوانح لکھنؤ۔ مولفہ جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب۔
۵۵ سوانح لکھنؤ
۵۶ خوش معرکۂ زیبا قلمی ورق ۱۲۴ ب۔ لکھنؤ یونیورسٹی۔
۵۷ آبحیات ص۵۳۷
۵۸ سوانح لکھنؤ۔
۵۹ انشائے ترقانی ص۳۰

۶۰ انشائے ترقانی ص۳
۶۱ تذکرہ خوش معرکۂ زیبا قلمی۔ سال تصنیف ۱۲۶۱ھ
۶۲ شمس الضحیٰ ص۹۹ مطبوعہ ۱۲۹۵ھ ہجری
۶۳ مرزا اوج (متوفی ۱۸ اپریل ۱۹۱۷ء) نے ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں علم عروض پر بڑی تقطیع میں ۳۳۶ صفحات میں ایک معرکہ آرا کتاب تصنیف کی۔ اس کا تاریخی نام "ارمغان" ہے جس سے ۱۲۹۲ کے اعداد نکلتے ہیں۔ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں عروض اور فن شعر سے متعلق بحث ہے۔ اس کتاب کے بارے میں داغ دہلوی لکھتے ہیں کہ "یہ تو سمجھو کہ آج عروض کا ماہر مرزا اوج سے بڑھ کر کوئی ہندوستان میں نہیں رہا ہے۔ ان کی کتاب علم عروض میں مقیاس نام ان کی عروض دانی میں اکمل ہونے پر دلیل روشن ہے۔ (معراج الکلام ص۱۴۷) اوج نے ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۵ء میں علم عروض پر ایک رسالہ لکھا۔ منیر شکوہ آبادی نے اپنے کلیات ص۵۰۶ میں اس عنوان کے تحت تاریخ لکھی ؎

"تاریخ تالیف رسالہ عروض مخدومی جناب مرزا محمد جعفر اوج خلف مرزا دبیر"

جناب اوج نے لکھی کیسے اصول عروض
کہ جس کی مدح میں رطب اللساں ہیں اہل زباں
منیر نے لکھی ہجری و عیسوی تاریخ
اصول نظم معلّی ہے خضر راہ جہاں
۱۲۸۲ ہجری		۱۸۶۵ء

۶۴ شمس الضحیٰ ص۹۸
۶۵ جناب سید محمد رشید صاحب لکھنؤ کے خاندان نقصوی کے چشم و چراغ ہیں۔ نہ علم و ادب کے قدردان جناب سید احمد مہدی مدظلہ راجہ صاحب پیرپور کے

خالہ زادی بھائی ہیں۔ رشید صاحب کے پاس ذخیرۂ مراثی کا بیش بہا خزانہ ہے۔ راقم نے ان کے کتاب خانے سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ موصوف کے پاس میر انیس اور دیگر مرثیہ گو شعرا کے غیر مطبوعہ مرثیے بھی وافر تعداد میں محفوظ ہیں۔ (اکبر حیدری)

۱۵ یہ دبیر کے وہ مطبوعہ مراثی ہیں جو دفتر ماتم کی جلدوں میں درج نہیں ہیں۔

۱۶ شمس الضحیٰ ص۱۰۹ ۔ ۱۷ شمس الضحیٰ ص۱۹۶

نوحہ بزبان حضرت زینبؑ

(مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ)

جب شمر نے تن سے سر شبیر اتارا ۔ واحسرت و دردا
زینب نے در خیمہ سے رو کر یہ پکارا واحسرت و دردا

دنیا سے اٹھا لے مجھے اے خالق داور از بہر پیمبر
بن بھائی کے جینا نہیں اب مجھ کو گوارا واحسرت و دردا

منہ کر کے سوئے لاشۂ شہ پھر یہ پکاری وہ بیکس و نالاں
کچھ بین کروں آ کے جو ہو حکم تمھارا واحسرت و دردا

جب کچھ نہ صدا آئی تو با حالت مضطر میداں میں جا کر
لاشے کی بلائیں لیں یہ رو رو کے پکارا واحسرت و دردا

بھیا ترے صدقے مجھے آواز سنا دے میں تیرے تصدق
اب اٹھ کے گلے مجھ کو لگا لے تو خدارا واحسرت و دردا

بھیا مجھے پردیس میں در در نہ پھراؤ پاس اپنے بلاؤ
اعدا کی نہیں ٹھوکریں کھانی ہیں گوارا واحسرت و دردا

بھیا مرے آنسو تو ذرا پونچھ لے اٹھ کر میں روتی ہوں کب سے
کھول آنکھوں کو اور دیکھ تو ذرا حال ہمارا واحسرت و دردا

سید کہوں بیکس کہوں بے گھر کہوں تم کو کیا کہہ کے میں رو دوں
اللہ کا پیارا کہوں یا نانا کا پیارا واحسرت و دردا

یا روضۂ احمدؐ کا مجاور کہوں بھائی یا حاجی و زائر
یا آنکھوں کی حیدر کا کہوں تم کو میں تارا واحسرت و دردا

یہ بین کیے اور ہوئی غش لاش پہ جا کر زینبؑ جگر افگار
اس غش میں بھی کہتی تھی مرے بھائی کو مارا واحسرت و دردا

حاجت نہیں کچھ طول طلاقت کی دبیر اب اس مجلس غم میں
گھر فاطمہؑ کا دشت میں ویراں ہوا سارا واحسرت و دردا

مرزا دبیر کا شاعرانہ منصب

جناب پروفیسر ظاہر حسین صاحب شاد
"مرزا ہاؤس" علی مرزا روڈ، مظفر پور، بہار

شبلی کی کتاب "موازنہ انیس و دبیر" کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے مگر جہاں میر انیس کے شاعرانہ اوصاف کی طرف اس کی وجہ سے لوگ متوجہ ہوئے وہاں اس کی وجہ سے انیس کے ایک بلند پایہ ہمعصر شاعر مرزا دبیر کا کلام بے توجہی کا شکار ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ ادبی تنقید کی دنیا میں موازنہ و مقابلہ کا طرز مطالعہ نامناسب ہے۔ ہر شاعر کا اپنا امتیاز ہوتا ہے۔ مخصوص اوصاف ہوتے ہیں اور سب کی الگ الگ انفرادیت ہوتی ہے، ایک کے لب و لہجہ کی خصوصیات، شاعرانہ آہنگ کے انداز اور تخلیقی مزاج کی ندرتوں کو کسی دوسرے شاعر کے کلام میں تلاش کرنا غیر مستحسن ہے۔ ضروری نہیں کہ تمام شاعروں میں ایک ہی طرح کے اوصاف مل جائیں اور اگر ایسا ہوا تو ادبی دنیا شاعرانہ ندرتوں اور فکر و احساس کی رنگا رنگی سے محروم ہو جائے گی۔ طرز کا فرق، آہنگ کا فرق، لب و لہجہ کا فرق، تخلیقی شعور کا فرق اور احساس و جذبہ کا فرق شعر و ادب کی دنیا میں تنوعات کو جنم دیتے ہیں اور اسکی وجہ سے فکر و فن کے نئے آفاق روشن ہوتے ہیں اور تخلیقی شعور ارتقائی منزلوں کو طے کرجاتا ہے۔

اردو شاعری کی تاریخ میں مرثیہ نگاری کی روایت بہت قدیم ہے اس صنف شاعری کی بدنصیبی یہ ہے کہ شروع میں شاعروں نے اس کے صنفی امتیاز کو روشن کرنے اور صنفی اوصاف کو نمایاں کرنے کے سلسلے میں انہماک و ارتکاز کے ساتھ تخلیقی کاوشیں نہیں کیں۔ یہ ادبی سعادت میر انیس اور مرزا دبیر کے حصہ کو حاصل ہوئی۔ ان دونوں باکمال شاعروں نے مرثیہ نگاری کی صنف کو رزمیہ شاعری کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ میں حکیم الدین احمد کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ واقعۂ کربلا کی بنیاد پر اعلیٰ رزمیہ شاعری نہیں کی جا سکتی۔ کلیم صاحب لکھتے ہیں۔

> "اگر سارے واقعۂ کربلا کو مسلسل مربوط پیرایہ میں بیان کیا جاتا تو بھی مرثیہ اعلیٰ رزمیہ شاعری کی تمثیل نہ ہوتا۔ رزمیہ شاعری میں قصہ پیچیدہ ہوتا ہے، اس کی ابتدا ترقی اور انتہا ہوتی ہے اور ان حصوں میں مناسبت اور مطابقت ضروری ہے"
>
> (اردو شاعری پر ایک نظر ص ۲۶۳)

سوال یہ ہے کہ ہومر کی "ایلیڈ" اور فردوسی کے "شاہنامہ" کے واقعاتی اور تاریخی پس منظر میں اگر اتنا دم خم ہے کہ وہ اعلیٰ رزمیہ شاعری کی تخلیق کا سبب بن سکیں تو کیا واقعات کربلا میں اتنی توانائی نہیں کہ ان کی بنیاد پر اعلیٰ رزمیہ شاعری کی جا سکے۔ کلیم صاحب اپنے اعتراض کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ رزمیہ شاعری میں قصہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ کیا واقعات کربلا میں پیچیدگی نہیں ہے؟ ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ رزمیہ شاعری کے حصے میں ابتدا، ترقی، اور انتہا ہوتی ہے۔ کیا واقعات کربلا ان مرحلوں سے دوچار نہیں ہوتے؟ تیسری دلیل یہ ہے کہ قصے کے ان حصوں میں مناسبت اور مطابقت ہوتی ہے۔ کیا واقعات کربلا ابتدا سے اخیر تک

گہری مطابقت اور مناسبت نہیں رکھتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کربلا کے واقعات کا موضوع، بہترین رزمیہ شاعری کے لیے نہایت اہم اور وسیع موضوع ہے۔ یہ اور بات ہے کہ واقعات کے اس تاریخی پس منظر میں رزمیہ شاعری کا بہترین نمونہ پیش نہیں کیا جا سکا۔ کلیم الدین احمد کا یہ تنقیدی تاثر بھی ناقابل قبول ہے کہ مرثیہ میں صرف ماتم ہوتا ہے اور فغان و شیون۔ میں اس سلسلہ میں صرف یہ عرض کروں گا کہ جذبات نگاری، کردار نگاری اور فطرت نگاری کے سلسلہ میں مرثیہ نگاروں نے عام طور پر اور بالخصوص انیس و دبیر نے جن شاعرانہ اوصاف اور سخنورانہ کمالات کے مظاہرے کیے انھوں نے مثنوی نگاروں کے ان عناصر کو بھی ماند کر دیا، ان خصوصیات کو نظر انداز کر کے مرثیہ کو صرف فغان و شیون کا حامل قرار دینا حیرت ناک بات ہے۔ سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ اردو شاعری کی کسی صنف میں رزم نگاری اگر ہوئی ہے تو وہ صرف صنف مرثیہ ہے۔ کلیم صاحب مرثیہ کے ماتمی پہلو سے اس طرح متاثر ہوئے کہ رزمیہ پہلو کی وضاحت انھوں نے غیر ضروری سمجھی۔ ظاہر ہے کہ صنف سخن کی حیثیت سے مرثیہ کی تمام خوبیوں کو اگر پیش نظر رکھا جاتا تو موصوف تنقید نگاری اتنی بے نیازی سے عجلانہ فیصلہ صادر نہ فرماتے۔ دبیر کے مرثیوں میں تو بالعموم رزم نگاری کا میلان زیادہ واضح نظر آتا ہے۔ معرکوں کے زور و شور کو مرثیوں میں پیش کرنے کے لیے وہ خاصا اہتمام کرتے ہیں حضرت عباس کی شمشیر زنی اور تیغ آزمائی کی تصویر ملاحظہ ہو۔

ہر بار نئی چال، نیا طور، نیا ڈھنگ
اسواروں کو پیدل کیا، پیدل کیے جو رنگ
گہہ زین پہ گہہ باگ پہ اور گہہ بہ سر تنگ
گہہ تنگ پناگاہ لعینوں کا دل تنگ
بل کھاتی تھی گہہ اژدرِ خوں خوار کے مانند
اعدا کے گلے میں تھی کبھی ہار کے مانند

—

گہہ راست گہے چپ تھی گہے تحت گہے فوق
اعدا کے گلے میں کبھی ہیکل تھی کبھی طوق
گہہ مُردوں پہ گہہ زندوں پہ جاتی تھی بصد شوق
بجلی کی طرح کوندنے کا روندنے کا ذوق
دریا میں کبھی گاہ بیاباں میں چمکی
جا کر کبھی نیزوں کے نیستاں میں چمکی
مغفر سے اگر چھو گئی گردن میں در آئی
گردن سے بڑھی سینۂ دشمن میں در آئی
سینہ کو کیا چاک تو جوشن میں در آئی
جوشن سے جو نکلی تو وہ توسن میں در آئی
توسن سے جو اتری تو نہ پھر دن میں کہیں تھی
واں تھی نہ جہاں گاو زمیں تھی نہ زمیں تھی

سیرت نگاری اور پیکر تراشی کے ساتھ صورت حال کی عکاسی میں بھی دبیر نے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے وہ جس موقع کو پیش کرنا چاہتے ہیں اس کی اس احتیاط و اہتمام سے پیش کش ہوتی ہے کہ قاری و سامع کے سامنے مکمل تصویر آجاتی ہے۔ لفظوں کی بندش تراش خراش اور مصرعوں کے در و بست میں انکی قادر الکلامی کا جوہر چمکتا نظر آتا ہے۔ حضرت امام حسین کے مظلوم قافلہ کی مقدس شان ذیل کے اشعار میں ملاحظہ ہو جس کے ایک ایک مصرعہ سے عزم و استقلال اور پاکیزہ جلال کے عنصر جھلکتے نظر آتے ہیں۔

پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی
پانی ہے کس پھریرے سے ہمت سحاب کی
یہ شان ہے نشانِ رسالت مآب کی
چوبِ علم کلید ہے جنت کے باب کی
نقشِ علم کے پنجہ میں اللہ کا ملا
بندوں کو اس نشان سے نشانِ خدا ملا
صبحِ جہاں شناہ ثریا جناب ہے
فوجِ حسین بن کے ظفر ہمرکاب ہے

مشرق سے واں علم، علم آفتاب ہے
یاں نور کا نشانِ علم بوتراب ہے

روشن علم سے آئینۂ مشرقین ہے
مشرق میں شمس، عکس نشانِ حسین ہے

دامن ہے کبریا کا سراپردۂ جلال
ماہی مراتب اس سے ہو شاہوں کا پائمال
پھریرا اڑا ہے شیر پھریرے کا ہے جدال
شیرِ فلک کو دیکھ کے ہوتا ہے لال لال

تسخیر غرب و شرق اسے کیا محال ہے
پنجہ ہے آفتاب تو ناخن ہلال ہے

مضامین کی بلندی، دقت پسندی اور معنی آفرینی میں تو دبیر اپنی مثال آپ ہیں۔ تشبیہات و استعارات کی تلاش اور استعمال میں بھی دبیر کا رنگ بیان اور حسن کلام زیادہ نکھرا ہوا ہے۔ دبیر کی قوت تخیل مضمون آفرینی اور خیال بندی کے سلسلے میں زبان و بیان کی موزونی اور جدتوں کو برتنے کا خاص اہتمام کرتی ہے۔ مرصع زبان اور بیان کی آرائش ان کے آہنگ میں ایک دلفریب شوکت پیدا کرتی ہے۔ تخیل کی رنگینی اور بلندی اور مناظر فطرت کی مصورانہ عکاسی کے مرحلوں میں خاص طور پر اپنا جوہر دکھلاتی ہے۔ منظر صبح کی ترجمانی کا انداز دیکھئے۔

جب سرنگوں ہوا علمِ کہکشانِ شب
خورشید کے نشان نے مٹایا نشانِ شب
تیر شہاب سے ہوئی خالی کمانِ شب
تانی نہ پھر شجاع قمر نے سنانِ شب

آئی جو صبح زیور جنگی سنوار کے
شب نے سپر ستاروں کی رکھ دی اتار کے

شمشیر مشرقی جو چڑھی چرخ پر شتاب
پھر تیغ مغربی نے دکھائی نہ آب و تاب

تھا بسکہ گرم خنجر بیضائے آفتاب
باقی رہا نہ چشمۂ نیلوفری میں آب

محتاج ماہتاب ہوا آب و تاب کا
باغ جہاں میں پھول کھلا آفتاب کا

چونکہ رزم گاہ کربلا کی صبح کا منظر ہے اسلئے یہاں بھی ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن سے رزمیہ ماحول کی تشکیل ہو سکے، علم، نشان، تیر، کمان، سنان، زیور جنگی، سپر، شمشیر، تیغ، خنجر وغیرہ، یہ الفاظ حق و باطل کی اس صبح معرکہ آرا کا صحیح نقشہ پیش کر دیتے ہیں۔ سورج کے لیے شمشیر مشرقی اور چاند کے لیے تیغ مغربی کا استعمال دبیر کی قوت تخیلہ کی اختراعی صلاحیت کو نمایاں کرتا ہے۔ علم کہکشاں، تیر شہاب، ستاروں کی سپر وغیرہ لفظی ترکیبوں سے دبیر کے جدت پسند لفظیاتی شعور کی وضاحت ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں شبلی نے بھی دبیر کی عظمت فن کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"خیال آفرینی، دقت پسندی، جدت استعارات اختراع تشبیہات، شاعرانہ استدلال شدت مبالغہ میں ان کا جواب نہیں لیکن اس زور کو وہ سنبھال نہیں سکتے۔ اس وجہ سے کہیں خامی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہیں تعقید اور اغلاق ہو جاتا ہے۔ تشبیہات میں پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور کہیں محض تخیل بیان رہ جاتا ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جہاں ان کا کلام فصاحت و بلاغت کے معیار پر بھی پورا اترتا ہے، نہایت اعلیٰ مرتبہ ہو جاتا ہے۔"
(موازنہ ۔ ص ۳۰۲)

ظاہر ہے کہ کسی شاعر کے کلام میں اول تا آخر ایک ہی طرح کی بلندی اور فنی خوبصورتی کا پایا جانا محال ہے۔ میر و غالب جیسے اصحاب طرز شاعروں کے یہاں بھی "پستش بغایت پست" اور "بلندش بغایت بلند" کی کیفیت نظر آتی ہے۔

انیسؔ کے مرثیے بھی تو قید و اخلاق کے عیب سے یکسر پاک نہیں ہیں۔ دبیرؔ کے یہاں بھی ایسی کمزوریاں ہیں مگر فصاحت و بلاغت کی کسوٹی پر ان کے بیشتر مرثیوں کے مختلف حصے اپنے حسن و اثرات کے اعتبار سے بلند مرتبہ دکھائی دیتے ہیں۔ "منظر صبح" ہی کی ایک اور کیفیت دیکھیے ؎

گلگونۂ شفق جو ملا حورِ صبح نے
اسپند مشک شب کو کیا نورِ صبح نے
گرمی دکھائی روشنیٔ طورِ صبح نے
ٹھنڈے چراغ کر دیئے کافورِ صبح نے
لیلائے شب کی رات کو دولت جو لٹ گئی
افشاں جبیں سے مہرِ درخشاں کی چھٹ گئی

پیدا ہوا سپیدۂ طلعت نشانِ صبح
سلطانِ صبح نے کیا قصدِ اذانِ صبح
باندھا عمامہ نور کا پہنا کتانِ صبح
چرخِ چہارم پہ گیا خطبہ خوانِ صبح
منہ سب کے سوئے قبلۂ امید ہو گئے
سرگرم سجدہ عیسیٰ و خورشید ہو گئے

بقول شبلی "مرزا صاحب کی قوتِ تخیل نہایت زبردست ہے۔" دبیرؔ اپنی اس زبردست قوتِ تخیل سے بھرپور صرف بھی لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اسلوب میں ایک امتیازی بلند آہنگی پیدا ہو گئی ہے اور نئی لفظیات کا تخلیقی شعور نمایاں ہوا ہے۔ اور اسی لیے مرثیوں کی معنوی فضا میں تہہ داری کا عنصر ملتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ دبیرؔ کے مرثیوں میں لفظیاتی شعور کی کارفرمائی ایک مستقل موضوعِ مطالعہ ہے۔ دبیرؔ نے الفاظ و بیان کے جو نئے نئے گل بوٹے کھلائے ہیں، خیالات کی بلندی اور مضامین کی جدت کے لیے اظہار کی جو نئی شاہراہیں ایجاد کی ہیں، مرثیہ نگاری کے میدان میں ان کی حیثیت اضافوں کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مرثیوں کو شروع میں مذہبی احساسات و جذبات کی تسکین کے لیے مخصوص صنفِ کلام تصور کیا جاتا تھا اور ایسے ہی مواقع پر ان کی ضرورت محسوس ہوا کرتی تھی جن باکمال شاعروں نے مرثیہ کو ایک مستقل اور منفرد صنفِ سخن کے طور پر دنیائے شاعری سے روشناس کرایا، ان میں مرزا دبیرؔ نہایت اہم اور ممتاز مقام رکھتے ہیں، مرثیہ نگاری کی ارتقا کی تاریخ کے مطالعہ کے دوران میں آج بھی انھیں کے سلسلے میں بے اختیار ہماری نگاہیں مرزا دبیرؔ پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ دبیرؔ نے مرثیہ نگاری کے مختلف لوازم و عناصر کے برتنے میں تخلیقی سطح پر جو شاعرانہ اہتمام کیے انھیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خیال کی ندرتوں اور اسلوب کی خوب صورت توانائی سے مل کر ان کی انفرادیت سنورتی ہے۔ یہی ان کے شاعرانہ کمال کا امتیاز ہے۔

حضرت علی اکبرؑ کے گھوڑے کی تعریف

وہ رخش تھا یا ابلق ایام کا اقبال — نکھ سکھ سے درست اور جوان بخت و جواں سال
جادو کی تری آنکھ فقط معجزہ کی چال — خورشید کے سُم برق کی دُم سنبلہ کی بال
قوت کی طبیعت تھی دلیری کا جگر تھا — سرعت کا بدن فہم کا دل عقل کا سر تھا

(دبیرؔ)

مرزا دبیر

(جناب میر احمد علی صاحب ادیب حیدرآبادی)

مرثیے کے لغوی معنی ہیں مُردے کے اوصاف اِس طرح بیان کرنا جس سے سننے والے کا دل بھر آئے۔ ہماری زبان میں لفظ مرثیہ اصطلاحاً اُس نظم کے لیے استعمال ہوتا ہے جو حضرت امام حسینؑ یا آپ کے ہم سفر ساتھیوں کی شہادت پر اظہار ملال کے لیے کہی گئی ہو۔ علم ادب کی تاریخ میں عام اصناف سخن کی طرح مرثیہ بھی ہمیں چند ادوار پر منقسم نظر آتا ہے پہلے دور میں اس کی کوئی خاص ہیئت متعین نہ تھی اور گیارھویں صدی ہجری کے نصف آخر تک مرثیہ نگاری بالکل محدود رہی البتہ دوسرے دور میں اس کی ادبی حیثیت قائم ہوئی جس کا سہرا مرزا محمد رفیع سوداؔ کے سر رہا۔ سوداؔ سے پہلے عموماً مثلث، مربع اور مخمس بند والے مرثیے لکھے جاتے تھے سوداؔ نے مسدس بند کے مرثیے لکھے جن میں عربوں کا کردار ہندوستانی معاشرت کے پس منظر میں پیش کیا گیا۔ تیسرے دور کے چار مرثیہ گو شاعر قابل ذکر ہیں ایک تو میر حسن کے فرزند میر مستحسن خلیق دوسرے میر مظفر حسین ضمیر تیسرے دلگیر اور چوتھے فصیح۔ ان میں خلیق و ضمیر نے کافی شہرت پائی۔ چوتھے دور میں خلیق و ضمیر کے بعد میر انیس و مرزا دبیر فلک مرثیہ گوئی کے آفتاب و ماہتاب ثابت ہوئے۔ ان دونوں بزرگ شاعروں نے اپنے فن کو کچھ اس طرح بام عروج پر پہنچایا کہ اردو ادب کی تاریخ میں تلاش بسیار کے باوجود ان کا کوئی ہم پلہ شاعر نظر نہیں آتا۔ میر انیس تو خاندانی مرثیہ گو تھے مگر مرزا دبیر کا معاملہ جداگانہ تھا۔ شاہ دہلی کے میر منشی ملا رفیع کے پردے نے مرزا غلام حسین کے نور نظر مرزا سلامت علی ۱۱ رجمادی الاول ۱۲۱۸ھ م ۲۹ اگست ۱۸۰۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ جب یہ سات سال کی عمر کو پہنچے تو دلی اجڑنا شروع ہوئی تھی اور شرفائے شہر کو اپنی آبرو کی حفاظت کی خاطر ترکِ وطن پر مجبور ہو جانا پڑا۔ اسی افراتفری میں مرزا غلام حسین بھی مع اپنے کمسن بچوں کے راہی لکھنؤ ہوئے۔ ان کا ہفت سالہ لڑکا لکھنؤ میں جب گیارہ سال کا ہو چکا تو باپ نے اُسے میر ضمیر کا شاگرد کرا دیا استاد نے اپنے تخلص پر اس ہونہار شاگرد کا تخلص دبیر تجویز کیا۔ مرزا سلامت علی دبیر نے فارسی عربی میں نہ صرف اچھی خاصی استعداد پیدا کر لی بلکہ عقلی و نقلی علوم متداولہ پر حاوی ہو کے اپنے زمانے کے ایک جید عالم اور ذاتی کردار کی حد تک فرشتہ خصلت انسان سمجھے جانے لگے ان کی روز افزوں شہرت و نیک نامی اس قدر عام ہوئی کہ شاہ نصیر الدین حیدر کے عہد میں شاہزادے اور شاہزادیاں بھی ان کے شاگردوں کے زمرے میں داخل ہو گئیں ملکہ زمانیہ ان کی بڑی قدرداں تھیں سارے لکھنؤ میں ان کی مسلم الثبوت استادی کا لوہا مانا جاتا تھا۔ جب امجد علی شاہ کا دور آیا تو میر انیس فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوئے اس طرح مرثیہ گوئی کے میدان میں انیس و دبیر ایک دوسرے کے مقابل نبرد آزما ہوئے اور نتیجتاً مرزا صاحب نے اپنے طاقتور حریف کا سامنا کرنے کے لیے محنت شاقہ سے مرثیے کہنا شروع کیے جس کی بدولت ان کے شاعرانہ جوہر کھلتے گئے اور فضل و کمال کی شہرت بڑھتی گئی چنانچہ ان کے تلامذہ میں تاجدار اودھ واجد علی شاہ نے اپنا یہ تاثر نظم کیا [illegible]

بچپن سے ان کے دامِ سخن کا اسیر ہوں
ہیں کمسنی سے عاشقِ نظمِ دبیر ہوں

کثرتِ مطالعہ سے مرزا صاحب کی بینائی میں فرق آگیا تھا جس کا حکیم احمد علی شاد نے کلکتہ میں کامیاب طریقے پر علاج کرایا سنہ ۱۲۹۰ھ میں مرزا دبیر کے تیرہ سالہ بیٹے مرزا ہادی حسین عطارد کا انتقال ہو گیا۔ صفر سنہ ۱۲۹۱ھ میں ان کے بڑے بھائی مرزا نظیر چل بسے اور اسی سال ماہ شوال میں میر انیس بھی دنیا سے منہ موڑ گئے۔ مرزا صاحب یہ صدمات برداشت نہ کر سکے تاب نہ لا سکے آخر کار بیمار ہوئے مرض بڑھتا گیا اور ۳۰ محرم سنہ ۱۲۹۲ھ م ۶ مارچ ۱۸۷۵ء کو لکھنؤ میں ... نے وفات پائی اور اپنے ہی مکان میں دفن ہوئے۔

مرزا صاحب کی شاعری

جس زمانے میں شیخ امام بخش ناسخ نے اصلاحِ زبان کی مہم چلائی، انھی دنوں مرزا دبیر اپنی مرثیہ گوئی کو اس طرح وسعت دے رہے تھے کہ رزم و بزم کے علاوہ تفسیر قرآن، حدیث نبوی، تاریخ، روایات، علم فقہ، علم کلام اور اخلاقیات جیسے موضوعات نظم کر کے صنف مرثیہ میں تنوع پیدا کیا۔ اہل الرائے حضرات مرزا صاحب کے فضل و کمال کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ یادگار انیس کے مولف میر انیس کے بارے میں لکھتے ہیں "انھوں نے طرزِ مرثیہ گوئی میں کوئی خاص جدت نہیں کی بلکہ ضمیر، دبیر کے ہی اسلوبِ کلام کو ایک مرتبہ بنایا اور اس پر میر خلیق کی محاورہ بندی اور میر حسن کی داستان نگاری کا رنگ... روغن چڑھا کے خاصات کا عالم دکھایا"

اسی طرح علامہ شبلی نے مرزا دبیر کے تعلق سے لکھا ہے کہ "جہاں ان کا کلام فصاحت و بلاغت کے معیار پر پورا اترجاتا ہے نہایت بلند مرتبہ ہو جاتا ہے۔"

مولوی محمد حسین آزاد نے مرزا صاحب کی پُرگوئی کے سلسلے میں ان کے تقریباً تین ہزار مراثی کی جو تعداد بتائی ہے وہ مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے صحیح اندازہ یہ ہے کہ وہ ایک ہزار مرثیوں کا ذخیرہ چھوڑ گئے۔ اسی ذخیرے میں ایک طویل مرثیہ ایسا بھی ملتا ہے جس میں شروع سے آخر تک کوئی نقطہ دار حرف استعمال نہیں ہوا۔ مرزا صاحب کے اکثر مرثیے جہاں دقت پسندی سوئے خیالی جدتِ استعارہ، اختراعِ تشبیہ اور منطقی استدلال سے بھرے پڑے ہیں وہاں بعض مرثیوں میں انھوں نے سادہ بیانی کا بھی اعجاز دکھایا ہے وہ اپنا ایک مرثیہ اس طرح شروع کرتے ہیں

ہم ہیں وطن میں اور طبیعت سفر میں ہے
سیاحِ نظم و مضمون نظر میں ہے
دریا میں ذہن ہے تو کبھی دشت و در میں ہے
درِ سخن کی چاہ مگر خشک و تر میں ہے
تا عمر دو ان سے سخن بہرہ مند ہے
ہر دم زباں کو ذکرِ الٰہی پسند ہے

غرض مرزا صاحب کی زبان پرشکوہ اور انداز بیان باوقار ہے۔ خیالات پر زور ہیں سوز و گداز کے اظہار کا خاص پیرایہ ہے مضمون آفرینی اور جدت طرازی کے سبب سے ان کے بیان کئے ہوئے استعارات و تشبیہات کو سمجھنے کے لیے دماغ لڑانا پڑتا ہے۔ تقریباً سارا کلام ابتذال سے پاک ہے اخلاقی مضامین کی بہتات ہے صنعت و رعایت لفظی سے کسی حد تک بچے ہیں المختصر مرزا صاحب اپنے خلف اکبر و جانشین مرزا اوج اور اپنے ڈیڑھ سو شاگردوں کو راہ پر لگا گئے۔ اب مذکورہ بالا مرثیے کے چند مسلسل بند بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کئے جاتے ہیں۔

فرماتے ہیں حسینؑ توقف کی جا نہیں
اس کوچ میں مقام کوئی عذر کا نہیں
بے دردِ غم کے حبِ خدا کا مزا نہیں
اس راہ میں بقا ہی بقا ہے فنا نہیں
اہلِ ادب سنبھل کے یہاں پاؤں دھرتے ہیں
یہ راہ وہ ہے سر سے جسے قطع کرتے ہیں
ہر راہ انبیائے اولوالعزم کم چلے
لیکن خدا کے عاشق ثابت قدم چلے

گو حضرت امیرؑ چلے ایک ہم چلے
سجدے سے سر نہ سر کے جو تیغِ ستم چلے
گزرے سو گزرے ہوئے جو ہونا ہو ڈر نہیں
سودا خدائے عشق کا ہے فکر سر نہیں

واللہ اعلم آئینگے اب یا نہ آئینگے
کس کو خبر ہے حد سے ہم آگے نہ جائینگے
موقع ہوا تو بی بی کو اپنی بلائینگے
بے کربلا کے رتبۂ عالی نہ پائینگے
مشتاق امتحان کا ربِّ غفور ہے
عاشور کو وہاں مرا ہونا ضرور ہے

سبطِ رسولؐ نے جو لیا نام کربلا
چھائی بھرے محل پہ اداسی ہر ایک جا
فریاد امِّ سلمیٰ نے کی وا محمدا
منہ دیکھ کر حسینؑ کا حسرت سے یہ کہا
کیوں واری کربلا یہ وہی ارضِ پاک ہے
شیشے میں جس زمینِ مقدس کی خاک ہے

شہؑ نے بھری اک آہ کہ ہاں نانا جان ہاں
نانا سے اس زمیں کا سنا ہوئے گا بیاں
اماں یہ بے نشانوں کی قبروں کا ہے نشاں
صغرا پکاری ہائے نکل جاؤں میں کہاں
باتیں سفر کی رمز کنایہ میں ہوتی ہیں
بابا تو ضبط کرتے ہیں اور نانی روتی ہیں

جبر آگیا تھا آپ کی فرقت کو اختیار
پر اب کلامِ یاس سے لونڈی ہے بے قرار
کیا جانیں پھر ملیں نہ ملیں شاہِ نامدار
اب میں ہوں اور بہنوں کے ناقوں کی ہو بہار
چلنا گوارا کیجئے اس تلخ کام کا
صدقہ سکینہؑ بی بی کے کوچ اور مقام کا

بہنوں کو والدہ کو مبارک عماریاں
معراج سمجھوں گی میں بٹھا دو گے تم جہاں
تکیہ عصا بچھونا میں چھوڑوں گی سب یہاں
پھر اور کیا ہے کچھ نہیں مٹھی بھر استخواں
مشکل سفر کی کیجئے پر آسان ہوئے گی
بیمار تو دوستوں پہ قربان ہوئے گی

اس التجا نے شاہ کی حالت تباہ کی
آنکھوں کو ڈبڈبا کے حرم پر نگاہ کی
سب نے بیاں مریض سے تکلیفِ راہ کی
آخر کہا خوشی تمہیں لازم ہے شاہ کی
بہرِ خدا نہ جسم کو [illegible] ریز کیجئے
بی بی کہ تپ ہے کوچ سے پرہیز کیجئے

صغرا پکاری ہائے مقدر دہائی ہے
دنیا میں کیا کبھی کسی کو تپ آئی ہے
تپ ہے تو خیر تپ کی دوا ہے ٹھنڈائی ہو
یہ ہے مرے بخار کا درماں جدائی ہو
بیمار کی خبر تمہیں ماں باپ لیتے ہیں
تپ آتی ہے تو بچوں کو چھوڑ دیتے ہیں

[illegible] تم بتاؤ
بیمار خود پڑی ہوں [illegible]
للہ اس قصور کی تعزیر سے بچاؤ
حضرت کو دو قسم کہ نہ صغراؑ کو چھوڑ جاؤ
یہ جان لو جو گھر میں رہی میں تو مر گئی
اور اونٹ پر جو چڑھ گئی تو وہیں تپ اتر گئی

لے لوگ بے حواس نہ ہو تپ کے آنے سے
تپ اس گھڑی تو آئی ہے بابا کے جانے سے
آنکھیں بھی دونوں لال ہیں آنسو بہانے سے
منہ زرد ہو گیا ہے غلط ہول کھانے سے
رومال سے جو ماتھے کو باندھا تو کیا ہوا
سر پیٹنے سے دردِ سر اس دم سوا ہوا

تپ کی حرارت اور قلق کا بخار اور
وہ تھرتھرانا اور ہے یہ اضطرار اور

مرزا دبیر مرحوم کا ایک نایاب مرثیہ

(جناب سید حسن صاحب زیدی) اسسٹنٹ ڈپٹی منتظم حال راج بھون گراؤنڈ لکھنؤ)

یہ اتفاق کی بات ہے کہ انیسویں صدی [illegible] جب دہلی [illegible] سلطنتیں مائل بہ زوال تھیں اس وقت اردو زبان [illegible] وہ نامور ادیب اور شاعر پیدا کئے جن کے ادبی کارناموں پر اردو دنیا ہمیشہ فخر و مباہات کرتی رہے گی۔ میر انیس اور مرزا دبیر اس زمانے میں اپنی پوری آب و تاب سے چمکے اور اپنی کاوشوں سے فن مرثیہ کو اتنی ترقی دی جو ہمیشہ دنیا [illegible] ادبی ذہنوں کو متاثر کرتی رہے گی۔

ایک طرف اردو ادب کو بہت سے شعرا اپنے قصائد غزلیات مثنویوں اور مسدسوں سے مالا مال کر رہے تھے تو دوسری طرف میر انیس اور مرزا دبیر نے فن مرثیہ کی طرف اپنی بھرپور توجہ مرکوز کی۔ یہ صحیح ہے کہ میر خلیق اور میر تقی میر نے اس میدان میں طبع آزمائی کی تھی مگر یہ فن ابھی تک عوام تک نہ پہنچا تھا۔

اس مضمون میں مجھے مرزا دبیر کے ایک مرثیہ کا ذکر کرنا ہے جو نایاب ہے اور جس کی تلاش مجھے عرصہ سے تھی یہ میری خوش قسمتی ہے کہ یہ مرثیہ مجھے ایک عزیز کے گھر ضلع اعظم گڑھ کے موضع [illegible] میں ملا۔ یہ پورا مرثیہ بہت خوش خط لکھا ہوا میرے پاس موجود ہے [illegible] نے ذکر کیا تھا کہ مرزا دبیر کا مرثیہ جو حضرت عباس علیہ السلام [illegible] کے حال میں کیا گیا تھا۔ ان میں مرزا صاحب نے اودھ [illegible] کیا ہے اور بڑی خوبی سے ان مراحل کو دکھایا ہے جو شادی [illegible] کے موقع پر اپنائے جاتے ہیں۔ اس مرثیہ کا مطلع یہ ہے۔

۱. جب اختر یعقوب پہ کی مہر خدا نے
یوسف کو دیا اوج شرف رب علا نے
دی مسند اقبال اسے بخت رسا نے
ہر گام دئے فرق ہمایوں پہ ہما نے
سجدے کے لیے خواب میں شمس و قمر آئے
محراب عبادت میں ستارے نظر آئے

۲. یعقوب کو یوسف نے دم صبح پکارے
تو ہم نے کئے برج ترقی کے نظارے
دیکھا ہے کہ شمس و قمر اور گیارہ ستارے
پیشانی گردش سے ہیں سجدے میں ہمارے
شاہی و نبوت مرے محبوب مبارک
یعقوب نے فرمایا بہت خوب مبارک

حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف سے اس خواب کی تعبیر اس طرح بیان کی۔

وہ چاند جو دیکھا ہے میں ہوں اے مرے اختر
گیارہ جو ستارے ہیں وہ ہیں تیرے برادر
خورشید سے تعبیر جدا ہے تری مادر
ہم سب ترے محکوم تو ہے حاکم کشور
ہر چاند کی نسبت سے ہے دل چاند پدر کا
یعنی کہ قمر کے لیے ہے داغ جگر کا

اب یہاں سے مرزا صاحب نے جس خوبی سے گریز اختیار کیا ہے وہ ملاحظہ ہو۔

یوسف کا یہ خواب اور وہ یعقوب کی تعبیر
موجود ہے قرآن میں نہیں حاجت تفسیر
اب خواب کروں رتبۂ عباس کا تحریر
وہ یوسف یعقوب نجف بازوئے شبیر
وہ خضر رہ شیعہ وہ سقائے سکینہ
معشوق علی عاشق بابائے سکینہ

مرزا صاحب نے حضرت یوسف اور حضرت عباس کا تقابل کس طرح فرمایا ہے۔ زبان بھی ملاحظہ ہو۔

کنعانیوں کا بدر تھا گر یوسف کنعاں
تو ماہ بنی ہاشم سب کہتے تھے انہیں یاں
واں چاہ میں یوسف کربلا چاہ فراواں
یاں بحر شہادت میں یہ گوہر ہوا غلطاں
یوسف جو گرے چاہ میں پھر چاہ سے نکلے
تا حشر نہ شبیر کی یہ چاہ سے نکلے

جس طرح حضرت یوسف نے خواب دیکھا تھا اسی طرح حضرت عباس کی والدہ حضرت ام البنین نے ایک دن خواب دیکھا:۔

کیا دیکھتی ہیں خواب میں عباس کی مادر
اک باغ میں پھرتا ہے وہ حیدر کا صنوبر
اک دوش پہ طوبیٰ ہے اور اک دوش پہ کوثر
گویا کہ تر و خشک ہے قبضے میں برابر
حیرت زدہ نیرنگی دنیا سے ہیں عباس
چشمہ تو ہے کاندھے پہ مگر پیاسے ہیں عباس

پھر اس خواب پریشان کو حضرت ام البنین حضرت علی مرتضیٰ سے اس طرح بیان فرماتی ہیں۔

حیدر سے کہا صبح کو یہ خواب پریشان
سنتے ہی پریشان ہوا وہ جامع قرآن
لب تو متبسم ہوئے آنکھیں گہر افشاں
چلائی وہ مخدومہ کہ آقا ترے قربان
دو مجھ کو تسلی کہ گرفتار تعب ہوں
اے وارث یعقوب میں تعبیر طلب ہوں

حضرت علی مرتضیٰ نے جواب دیا کہ حسین کربلا و دمشق میں اس خواب کی تعبیر دیں گے۔ حضرت امام حسین تشریف لائے اور یوں خواب کی تعبیر بیان کی۔ یہاں بھی زبان کی چاشنی ملاحظہ ہو۔

خواب آپ کا صادق ہے مبارک کرے سبحاں
فرماؤ تو کہہ دوں جو نظر آیا ہے ساماں
جس باغ میں عباس کو دیکھا ہے ترا ماں
جنت کا وہ تختہ ہے شہیدوں کا گلستاں
ہر حلق سے واں خون کا فوارہ چھٹے گا
یہ باغ ہے جس میں کہ مرا باغ کٹے گا

کاندھے پہ جو طوبیٰ نظر آیا ہے وہ کیا ہے
وہ منصب جعفر علم فوج خدا ہے
عباس علمدار سپاہ شہدا ہے
مدت سے علمداری کا گم نام پڑا ہے
کل دو پہر ان کے لیے یہ جاہ و حشم ہے
پھر سر ہے نہ گردن ہے نہ شانہ نہ علم ہے

اک دوش پہ چشمے کا جو پایا ہے قرینہ
وہ مشک ہے اک پیاسی کا نام اسکا سکینہ
چھوڑے گی مرے ساتھ وہ بچپن میں مدینہ
پیٹے گی مرے واسطے اپنا سر و سینہ
پانی نہ اسے تین شب و روز ملے گا
چلائے گی جب وا عطشا عرش ہلے گا

اس تعبیر کو سن کر حضرت ام البنین ایسی بہادر عورت پر کیا اثر ہوا اس کا نقشہ بھی مرزا دبیر کی زبان میں ملاحظہ ہو۔

یہ سن کے کئے شکر کے سجدے کئی پیہم
اور دوڑ کے عباس کے قدموں پہ ہوئی خم
ماتھے کے عوض تلوؤں کے بوسے لیے اس دم
پھر جوڑ کے ہاتھوں کو کہا صدقے ترے ہم

مادر کا نہ یہ پیار بھلا دیکھو بیاہئے
جو کہتے ہیں یہ اس سے سوا کیجو بیاہئے

یہاں سے دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ حضرت عباس جوان ہوتے ہیں حضرت ام البنین حضرت علی علیہ السلام سے عرض کرتی ہیں کہ اب میرے شہزادے کی شادی ہونا چاہیئے تاکہ میں ان کا سہرا اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔ اس وقت لکھنؤ میں جو طور و طریقے تھے اور اس وقت کے معاشرے میں جو رواج قائم تھا اس کا اندازہ اس بند سے ہوتا ہے:

فرمایا علیؑ نے کہ یہ دل سے ہے یہ منظور
زینب سے کہا آل نبی آ کے ہوں مسرور
شادی کی ہوا دُھوم کرو اس سے نہ مذکور
رقعہ لکھو بی بی جو زمانے کا ہے دستور
شامیں جو یہ خوش خبری پائیں گی اماں
سو بار تیری ابھی شام سے آئیں گی اماں

آج کل اور اس زمانے میں لکھنؤ میں جو رقعہ نویسی کا طریقہ تھا اس کا ذکر بھی کس انداز سے مرزا دبیر نے کیا ہے۔

عباس کو کاغذ دیا مادر نے منگا کے
ہنس کر کہا شرماتے ہو کیوں آنکھیں چرا کے
قسمت سے یہ دن آیا ہے صدقے میں خدا کے
اک دن تھا کہ مکتب میں پڑھا کرتے تھے جا کے
اب رسم نویسی کے سزاوار ہوئے تم
قابل ہوئے لائق ہوئے ہشیار ہوئے تم

کس انکساری کے ساتھ حضرت ام البنین رقعہ لکھوا رہی ہیں

یوں لکھو کہ اشراف مدینہ کو ہے معلوم
میں بندہ ہوں عباس غلام شہ مظلوم
بابا شہ مردان اسد خالق قیوم
اور والدہ ہے خادمۂ زینب و کلثوم
لکھے کی مدینہ کی سکونت لکھوا دی
اور کرب و بلا جائے شہادت لکھوا دی

مندرجہ بالا رقعہ کے لکھے جانے کے بعد ایک دن حضرت زکیہ کے والد بزرگوار حضرت علی مرتضیٰ کے پاس مسجد میں تشریف لائے اور شادی کی درخواست کی۔

اک روز تھے محراب عبادت میں یداللہ
آ کر یہ زکیہ کے پدر نے کہا ناگاہ
عباس کو نوشاہ بنانا ہے جو یا شاہ
اس گوہر یکتا سے مجھے رشتے کی ہے چاہ
یہ بات فقط قدر بڑھانے کے لیے ہے
لونڈی مرے گھر پاؤں دھلانے کیلئے ہے

حضرت علی علیہ السلام کس شان سے اپنے دلبند کی شادی رچانے جاتے ہیں ملاحظہ ہو۔

بیٹے کی چلے بیاہنے حلّال مہمات
بارہ رفقا ہفت پسر شاہ کے تھے ساتھ
ہاتھوں میں بھی تسبیح زبانوں پہ مناجات
اور نقل کی شیرینی طبق میں لیے سوغات
باچھیں کھلی جاتی تھیں پیمبر کے وصی کی
شادی تھی علمدار حسین ابن علیؑ کی

عورتوں کو دولہا اور باراتیوں کو دیکھنے کا اشتیاق جو ہماری سوسائٹی میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے اس کا اظہار مرزا صاحب نے کس طرح کیا ہے۔

سب بیبیاں کرنے لگیں چھپ چھپ کے نظارا
بولی کوئی یہ دولہا ہے یا عرش کا تارا!
اک نے کہا کیا نام خدا چہرہ ہے پیارا
سالی نے پکاری کہ خوش آئنت ہمارا
کیوں بیبیو ایسے ہی خوش اسلوب تھے یوسف
داماد مرا خوب ہے یا خوب تھے یوسف!

بارات رخصت ہو رہی ہے اور جہیز کا سامان نکل رہا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔ جہیز میں حضرت عباس کو کیا سامان ملے تھے!

دو موزے دو نعلین اور اک بردیمانی
خود و زرہ مصری اور تیغ صفہانی
اسپ دو رکا بہ مع ساز ہمدانی
مشکیزہ پر نور بھی اک بھرنے کو پانی
مدت میں یہ سامان یہاں جمع ہوا تھا
پر حیف کہ عاشور کو اک دم میں لٹا تھا

اب دولہن دولہا کے گھر تشریف لاتی ہیں۔ اس واقعہ کو مرزا دبیر نے جس جذباتی انداز سے بیان کیا ہے وہ بھی ان کی زباں دانی اور باریک بینی کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

القصہ دولہن نے کیا گھر دولہا کا روشن
اور ساس کے پاس آئی جھکائے ہوئے گردن
مجرا جو کیا اس نے کہا بوڑھ سہاگن
زہرا کا ترے سر پہ سدا سایۂ دامن
شبیر کی آئی ہوئی سب بلا پہ آئے
آئی ہو جو تجھ پہ وہ تیری ساس پہ آئے

اس کے بعد حضرت ام البنین اپنی بہو کو حضرت زینبؑ کے پاس کس شان سے لاتی ہیں۔

پھر تھام کے بازو وہ نظر کردۂ باری
لائی اسے زینب کے حضور اور یہ پکاری
آداب بجا لاؤ یہ زہرا کی ہے پیاری
میں ساس ہوں یہ مالک و مختار تمہاری
بانو کو دکھا کر کہا یہ فخر عجم ہے
گرداں کے جبر و بانوئے سلطان امم ہے

اب یہاں سے مرزا دبیر واقعہ کربلا کی طرف رخ کرتے ہیں اور اپنے کلام میں کس خوبی کے ساتھ موڑ پیدا کرتے ہیں۔

اس باغ کے جب پھولنے پھلنے کے دن آئے
اک دفعہ مدینہ سے نکلنے کے دن آئے
اور گرمیوں میں دھوپ سے جلنے کے دن آئے
تیروں کی طرف پاؤں سے چلنے کے دن آئے
کہنے کو عزیمت ہوئی شاہ دو جہاں کی
تقدیر وہاں لے چلی تھی خاک جہاں کی

کربلا میں پیاس کی شدت کی وجہ سے حضرت سکینہ جس طرح متاثر تھیں اس کا اظہار اس بند سے ہوتا ہے۔

پیاسی نے صدا دی کہ چچا میں ترے قربان
لے مشک ابھی نہر پہ جائیں ترے قربان
للہ مجھے پانی پلا دیں ترے قربان
منہ چوم کے غازی نے کہا میں ترے قربان
پانی کے لیے تو نہ ہو عباس کے صدقے
عباس ترے صدقے تری پیاس کے صدقے

حضرت عباس پانی لینے کے لیے فوج اعدا کی طرف تشریف لے جاتے ہیں اس کو مرزا صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

عکس ان کا پڑا مہر درخشاں کی جبیں پر
یا برق گری خرمن خورشید مبیں پر
چھائی یہ گھٹا نور کی افلاک بریں پر
بوندوں کے عوض تاروں کا مینہ برسا زمیں پر
یہ حرف لب شوکت و اجلال سے نکلا
خورشید دو دم مشرق اقبال سے نکلا
یا تازی غازی سے ظفر بولی سنبھل جا
اور اژدر نیزہ سے کہا سب کو نگل جا
دی ماہی شمشیر کو آواز اچھل جا
فتنے سے کہا تو کہیں اب وقت نکل جا
جبریل پکارے ترے قربان شہزادے
ہاں بدر علیؑ معرکۂ بدر دکھا دے

حضرت عباس علیہ السلام غیظ میں آکر جنگ کر رہے ہیں اور کفار شام کا قتل تیغ سے فرما رہے ہیں۔

جس سر پہ پڑی تیغ وہ سر تن پہ نہ ٹھہرا
تن زین پہ اور زین سے توسن پہ نہ ٹھہرا
توسن کا قدم دشت کے دامن پہ نہ ٹھہرا
اور شرع میں خون تیغ کی گردن پہ نہ ٹھہرا
قانون عدالت عمل تیغ نکو تھا
جو منکر یکتائی حق تھا وہی دو تھا

پھر فتح یابی نصیب ہوتی ہے اور حضرت عباس بڑے تپاک و جلال کے ساتھ نہر میں مشکیزہ سکینہ کو بھرنے اترتے ہیں پھر

مشکیزہ بھرا نہر سے سقائے حرم نے
کاندھے پہ دھرا بازوئے سلطان امم نے
خیمہ کا کیا قصد جو اس ابر کرم نے
گھیرا ان پہ پرے باندھ لیے فوج ستم نے
غل تھا مزہ اس مشک کے بھرنے کا دکھا دو
دریا ہی میں سر کاٹ کے لاشے کو بہا دو

حضرت عباس نے مشکیزہ بچانے کی دھن اور خیمہ تک پہونچنے کی جد وجہد اس منظر کو مرزا صاحب نے بڑے پر درد لہجہ میں بیان کیا ہے.

[illegible] دریا سے غبار کا آنا
گھوڑے کو کبھی روکنا اور گاہ بڑھانا
جب تیر ستم کھایا تو رو کر یہ سنانا
یا ساقی کوثر مرا مشکیزہ بچانا
اک ایک قدم صدمہ تھا یہ جان حزیں پر
اب مشک چھدی اور گرا پانی زمیں پر
مضمون غضب کا ہے یہ سب وارد اخبار
افسوس ہے نہ روئیں غلامان علمدار
جن آنکھوں سے مشکیزہ کو تکتا تھا علمدار
دو تیر لگے ہائے انھیں آنکھوں پہ اک بار
زخمی ہوئیں آنکھیں [illegible] علی کی
جاتی رہی بینائی دو بال سبط نبی کی

آخرکار وہی ہوا جو ہونا تھا علمدار حسینی نے بڑی بے جگری اور بہادری کے ساتھ اپنی بیش بہا جان قربان کردی اور اس طرف حضرت ام البنین کے خواب کی تعبیر مکمل ہوگئی جو انھوں نے حضرت علیؑ کے زمانے میں دیکھا تھا کس طرح حضرت امام حسینؑ اور حضرت زینب نے حضرت عباس کی آخری آواز کو سنا اسکو بھی مرزا صاحب بڑی کرب و بے چینی کے ساتھ بیان فرماتے ہیں.

ناگاہ صدا آئی کہ آؤ مرے بھائی
آخر ہوا عباس اٹھاؤ مرے بھائی
سر کاٹتی ہے فوج بچاؤ مرے بھائی
لاشہ مرا قبلہ کو اٹھاؤ مرے بھائی
جان آنکھوں میں ہے آنکھوں میں پیکان ہے بھائی
اور آپ کے دیدار کا ارمان ہے بھائی
زینب نے کہا بھائی علمدار میں واری
مکہ میں نہ مدینہ میں یہ آواز تمہاری
منھ پیٹ کے حضرت یہ پکارے کئی باری
ہم شکل نبی دوڑو کمر ٹوٹی ہماری
بابا کے گریبان کو پھاڑو علی اکبر
سب بچوں کے دامان کو پھاڑو علی اکبر

اس مرثیہ کا آخری بند اس طرح ہے مرزا صاحب مومنین کو مخاطب کرتے ہیں.

کیا بیٹھے ہو اے خاص غلامان علمدار
دیکھو کہ لرزتی ہے ضریح شہ ابرار
سر ننگے کھڑے پیٹتے ہیں حیدر کرار
ماتم کے لیے اٹھو قیامت کے ہیں آثار
سر پیٹو ضریح شہ ابرار کے آگے
اب روؤ علمدار کو سردار کے آگے

حضرات اس مرثیہ کے مخصوص بندوں کو میں نے قلم بند کیا ہے یہ مرثیہ بہت طولانی ہے اور اب تک غالباً طبع بھی نہیں

ہوا ہے۔ میرے خیال سے صرف مخصوص لوگوں کے پاس ہوگا۔ اس مرثیہ کی زبان باریک بینی، بلند خیالی، فصاحت و بلاغت اپنی جگہ پر بے مثال ہے۔ پھر ہر جگہ پر مرزا دبیر نے عرب، عراق اور اودھ کے اس کلچر کو بھی حسن و خوبی سے پیش کیا ہے جو اس زمانے میں ہمہ گیر طور پر مانا جاتا تھا۔ میر انیس کا میں دلدادہ ہوں اور ان کے مراثی برابر مجالس میں پڑھتا ہوں مگر اس کے ساتھ ساتھ مرزا دبیر کا درجہ بھی کسی طرح میری نظروں میں کم نہیں ہے۔ دونوں دنیائے مرثیہ کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ دونوں شاعروں نے اردو ادب کے خزانہ کو اپنے بے شمار مرثیوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ اس بات سے خوشی ہے کہ میر انیس کی یادگار قائم ہو چکی ہے اور اس سلسلہ میں یادگار انیس کمیٹی نے پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم کی رہنمائی میں بہت کچھ کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ اتر پردیش سرکار نے بھی ان کاموں میں کافی مدد کی ہے۔ مگر افسوس ہے مرزا دبیر کی یاد میں کوئی با عمل کام نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ نہ ہو سکی ان کے خاندان کے افراد ... بھی موجود ہیں۔ ان کی کوئی مدد ہم اب تک نہ کر سکے۔ مرزا دبیر کے نام پر انجمن قائم کرنا اور اس کو ایک پروگرام کے ماتحت شروع کرنا وقت کی پکار ہے۔ اس وقت جبکہ ہماری سرکار اردو اکیڈمی کے ذریعہ ان کاموں میں بڑی سہولت پیدا کر رہی ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ کچھ ارباب علم و دانش اس نیک کام پر کمر باندھ لیں اور مرزا دبیر کی مستقل یادگار قائم کرنے کا عزم کر لیں تو انشاء اللہ آگے چل کر ہم اپنے نیک مقصد میں کامیاب و کامران ہوں گے۔

مرزا دبیر (مرحوم)

ہونے کو نہ اس جہان میں کیا کیا ہوگا
خالی نہ بد و نیک سے اصلا ہوگا
ظالم بھی ہوئے ہیں اور ہوں گے لیکن
شبیر سا مظلوم نہ پیدا ہوگا

اصغر کو جو مقتل میں لاتے تھے حسین
مرنے کو کلیجے سے لگاتے تھے حسین
از بس کہ زمین کربلا جلتی تھی
گہ رکھتے تھے لاش گہ اٹھاتے تھے حسین

مرزا دبیر کمالاتِ فن کے آئینے میں

مولانا سید محمد جابر صاحب باقری جوراسی
(مدرستہ الواعظین ۱۶، کیننگ اسٹریٹ، لکھنؤ ۳)

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے
رستم کا بدن زیرِ کفن کانپ رہا ہے
خود عرش خدا تا بہ زمیں کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

خدائے سخن مرزا دبیر مرحوم کے اس بند میں جو شوکت الفاظ، رعب و دبدبہ، مضامین کی فراوانی اور زور بیان موجود ہے اس کے بیان کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ دبیر اس قبیل کی خصوصیات سے مالا مال ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ دبیر کا یہی مخصوص انداز ہے بلکہ انھوں نے اس عظیم مرثیہ گوئی کے جس میدان میں قدم رکھا جس صنعت میں طبع آزمائی فرمائی اس میں بازی لے گئے ان کے رنگا رنگ کلام کے مختلف نمونے مکمل طور سے تو نہیں پیش کیے جا سکتے لیکن پھر بھی چیدہ چیدہ کلام کا کچھ حصہ بطور نمونہ پیش ہے

درج ذیل بند میں امام کی تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف چیزوں کو بڑے اچھے اسلوب سے جمع کرتے ہیں اور قابو اتنا کہ ہر مصرع میں کچھ چیزیں کم و بیش نہیں۔

نقاش و نقش، کاتب و خط، بانی و بنا
بود و نبود، ذات و صفت، ہستی و فنا
آدم، ملک، زمین، فلک، گرد و کیمیا
دنیا و دیں، حدوث و قدم، بندہ و خدا
سب شاہدِ کمالِ شہِ مشرقین ہیں
جب تک خدا کا ملک ہے مالک حسین ہیں

اب ذرا مناسبات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بند ملاحظہ فرمائیے۔

باران و قطرہ، باغ و گل، و معدن و گہر
صحرا و ذرہ، برج و نجوم، آتش و شرر
طور و کلیم، و آبِ بقا، خضرِ نامور
ظلمات و نور، دشت و بیابان، خشک و تر
شاہد ہیں سب کہ صاحبِ اعجاز ہیں حسینؑ
جاں آفریں کے عاشقِ جانباز ہیں حسینؑ

مختلف روشن و منور چیزوں کا رخ امام علیہ السلام سے کس خوبی کے ساتھ موازنہ فرماتے ہیں۔

شمع و چراغ و آئینہ و صبح و آفتاب
باغ و بہار و یاسمن و لالہ و گلاب
ناہید و بدر و مشتری و قطب و ماہتاب
آبِ حیات، لالِ بدخشاں، دُرِ خوشاب
یوسف اور ان کے سارے خریدار اک طرف
سب اک طرف یہ روئے ضیا بار اک طرف

امیر المومنین کی سخاوت کا موازنہ ابر نیساں سے کرتے ہوئے

رہ جاتا ہے انگشت بدنداں ہو کر
حیدر کو کہا ابر سخنداں ہو کر
مانا کہ گہر بخش ہے نیساں بھی مگر
وہ دیتا ہے رو رو کے یہ خنداں ہو کر

مرزا دبیر مرحوم کے کلام پر بھرپور تبصرہ کرکے مضمون کو طول نہیں دینا چاہتا اور پھر ایک بے بضاعت انسان مکمل طور سے

تبصرہ کر بھی نہیں سکتا صرف کلام کے نمونے پیش کر رہا ہوں۔ ناظرین کلام کی خوبیوں سے خود متعارف ہو سکتے ہیں۔ درج ذیل بند میں حضرت عباس کے چہرۂ مبارک کا آئینہ سے جس لطیف پیرائے میں مرزا مرحوم نے موازنہ فرمایا ہے اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔

آئینہ کہا رخ کو تو پھر بھی نہ ثنا کی
صنعت وہ سکندر کی یہ صنعت ہے خدا کی
واں خاک نے صیقل یہاں قدرت نے جلا کی
طالع نے کس آئینہ کو خوبی یہ عطا کی
ہر آئینہ میں چہرۂ انساں نظر آیا
اس رخ میں جمال شہ مرداں نظر آیا

بند کا زبانی امام حسین علیہ السلام اور یزید کا تقابل کچھ اس طرح فرمایا ہے کہ ہر شعر لاجواب بن گیا ہے۔

وہ تخت نشیں دوزخ اسفل کا مکیں ہے
یہ گوشہ نشیں ہر نبوت کا نگیں ہے
وہ غول ہے یہ خضر ہے وہ شک یہ یقیں ہے
وہ ننگ زمیں، یہ گہر عرش بریں ہے
زنار ہے وہ گردن ارباب خطا کا
اور نام خدا سبحہ ہے یہ خاک شفا کا

وہ نار ہے یہ نور ہے، وہ ننگ ہے یہ نام
شیطاں کا وہ وسواس، یہ رحمن کا الہام
وہ درد یہ تسکین وہ ایذا ہے یہ آرام
وہ دیر ہے یہ کعبہ وہ کفر ہے یہ اسلام
وہ جہل میں بوجہل یہ دانش میں نبی ہے
وہ بخل میں قارون، یہ بخشش میں علی ہے

تابندہ معبود ہے، وہ بندۂ زر ہے
یہ نور کا شعلہ، وہ جہنم کا شرر ہے
وہ نحس ہے یہ نیک، وہ عقرب یہ قمر ہے
وہ ناخن پا کفر کا، یہ دین کا سر ہے
یہ خیر وہ شر اعدیہ کوئی وہ بدی کا ہے
وہ بت ہے بلا شک، یہ خلیل احد کا ہے

وہ نار یہ فردوس، وہ زقوم یہ طوبیٰ
وہ زخم یہ مرہم، وہ مرض اور یہ مسیحا
وہ سحر یہ اعجاز، وہ فرعون یہ موسیٰ
وہ قہر یہ رحمت، وہ نجاستر یہ تقویٰ
ہر مصحف معبود کی صحت یہ فقط ہے:
وہ حرف غلط لفظ غلط نسخہ غلط ہے
وہ زہر ہلاہل، یہ سمجھے آب بقا ہے
وہ ہے مرض الموت، یہ تصویر شفا ہے
وہ رہزن اسلام ہے، یہ راہ نما ہے
وہ سایۂ آسیب ہے، یہ ظل خدا ہے
نخوت ہے اگر ملک ہو اس اہل جفا کو
مل جاتے ہیں یاں دونوں جہاں ایک گدا کو

ایک پختہ عقیدہ رکھنے والے عزادار کی حیثیت سے مراسم عزاداری کی افادیت کو ان کے مناسبات کا التزام رکھتے ہوئے پیش فرماتے ہیں۔

تابوت اٹھانے کا صلہ قبر کی راحت
[illegible] بنانے کی جزا [illegible] جنت
سقائی کے انعام میں کوثر کی کرامت
[illegible] تعزیہ داری کی بدولت
[illegible] ہیں سو کیا ہے
وہ موتی نہیں دائرۂ حفظ خدا ہے

صنعت سیاق الاعداد میں پنجتن علیہ السلام کی مدح کرتے ہوئے

ہر فرد کو خدا نے دیا خمسۂ حواس
تا حق پنجتن کے شناسا ہوں حق شناس
ناموس پہ ان کے پانچ نمازوں کا ہے اساس
جس کو کہ ان کا پاس ہے وہ ہے خدا کے پاس
پانچ انگلیوں سے ہم نے چنا ایک بات کو
بس پنجتن کے سامنے پھیلا دو ہات کو

مرزا دبیر مرحوم نے صنعت مقلوب مستوی میں جو طبع آزمائی

فرمائی ہے اس کی مثال ذیل کے بیت میں ملتی ہے۔ بیت کے دوسرے مصرع کو الٹیے تو وہی مصرع بن جاتا ہے۔

پرزے نہ کرو مصحف اسلام ہمارا
آرام ہمارا ہے یہ آرام ہمارا

صنعت مقلوب ہی میں آپ کا یہ بند بھی ہے جس میں ہر مصرع کے آخری لفظ کو الٹ کر دوسرے مصرع کی زینت اس معکوس لفظ کو فرمائی ہے۔

رات ایسی سیہ بختیٔ لشکر سے ہوئی تار
رات ایک طرف ظلمت دوزخ تھی نگوں سار
راس آئی نہ یہ جنگ ہوئی جینے سے بیزار
راز اس میں یہ تھا تیغ گلے کاٹتی ہوئی پار
ہے صنعت مقلوب کل اول تو بجا ہے
آخر ولد انقلاب ہر اک اہل جفا ہے

دیگر صنعتوں کی طرح مرزا مرحوم نے صنعت منقوط اور غیر منقوط دونوں میں طبع آزمائی فرمائی ہے منقوط اس رباعی میں موجود ہے۔

جب بخت بن قین نے زینت بخشی
زینب نے تشفی تب بہ شفقت بخشی
تیغیں جز تن جبیں شوق رجی بے جبیں
جنت بخشی نبی نے جنت بخشی

صنعت غیر منقوط یعنی صنعت مہملہ میں آپ کا کلام دیکھیے سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت حر کے حملے کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

حر حملہ ور ہوا کہ اسد حملہ ور ہوا
وہ حملہ ور ادھر ادھر اسلام ور ہوا
سرگرم معرکہ سر اعدا اگر ہوا
وہ گل کھلا کہ [illegible] سر سر ہوا
اہل حسد کو درد ادھر آہ آہ کا
حور و ملک کو ورد ادھر واہ واہ کا

ثابت لکھنوی لکھتے ہیں کہ اس صنعت میں پورا ایک مرثیہ مرزا مرحوم کا ہے جو غیر منقوط ہے جس کا مطلع یہ ہے ع

مہر علم سرور اکرم ہوا طالع (حیات دبیر ص۱۹۰)

پروفیسر محمد حسین آزاد نے جس نقطہ مرثیے کا حوالہ دیا ہے اس کا مطلع یہ لکھا ہے

ع ہم طالع ہما مراد ہم رسا ہوا (آب حیات ص۵۳۷)

اگر ایک جانب مرزا دبیر مرحوم کو صنعت شاعری کی مختلف صنعتوں پر عبور حاصل تھا تو دوسری جانب اک ماہر نفسیات کی حیثیت سے منظر کشی فرماتے ہیں۔ امام حسین علیہ السلام سوال آب کے لیے حضرت علی اصغر کو لے کر فوج اعدا کے سامنے آتے ہیں۔ بڑا سخت موقع ہے۔ سوال آب کرنا ہے لیکن غیرت حمیت مانع ہے اس نازک موقع پر مرزا مرحوم نے بڑے اچھے انداز سے نبھایا ہے

پہنچے قریب فوج تو تھرا کے رہ گئے
چاہا کریں سوال تو شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے
چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

حصول آب کی ناکامی اور بیٹے کی مظلومیت و بے چارگی کا جو اثر باپ پر مرتب ہوتا ہے اسے بند کے آخری مصرع میں نفسیاتی انداز سے واضح فرمایا ہے۔

پھر ہونٹ بے زبان کے چوسے جھکا کے سر
رو کر کہا جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر
سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر
پھیری زباں لبوں پہ جو اس نور عین نے
تھرا کے آسمان کو دیکھا حسین نے

بند اور امام زین العابدین کے سوال و جواب میں بیمار کربلا کی بے چارگی و بے بسی کی جو تصویر کشی کی گئی ہے وہ بھی اک

ماہرِ نفسیات کا کلام ہے۔

ہند نے پوچھا مرض کیا ہے کہا بے پدری
رو کے وہ بولی دوا کیا ہے کہا نوحہ گری
گھر جو دریافت کیا کہنے لگے در بدری
بولی لیتا ہے خبر کون کہا بے خبری
آہ کرنے کا سبب پوچھا تو شرمانے لگے
تازیانوں کے نشاں پشت پہ دکھلانے لگے

اس مختصر مضمون میں نہ تو مرزا دبیر مرحوم کے کلام پر سیر حاصل بحث کی جا سکتی ہے اور نہ کلام کے خصوصیات کو مکمل طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس میدان میں مرثیہ گوئی میں دبیر کا کیا درجہ تھا اس کے لیے یہی کافی ہے کہ مرزا غالب ایسا باکمال شاعر بھی مرزا دبیر کے مقابلے میں خود کو بے سرو سامان پاتا ہے۔ ایک مرتبہ غالب نے مرثیہ کہنا شروع کیا صرف تین بند کہے اور قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔ یہ بند پڑھ کر مرزا غالب نے لوگوں سے کہا۔ واقعی یہ حق مرزا دبیر کا ہے دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اٹھا سکتا (جلوۂ خضر صفحہ ۲۲۵)

مفتی محمد عباس مرحوم جو ایک زبردست عالم اور بے مثل ادیب تھے ایک موقع پر میر انیس اور مرزا دبیر کے متعلق فرماتے ہیں میر صاحب کا کلام فصیح و شیریں ہے، مرزا صاحب کا کلام دقیق و نمکین ہے یہ ہر ایک کا ذائقہ مختلف ہے تو ایک کو دوسرے پر ترجیح کیسے دی جا سکتی ہے۔ (عشرۂ کاملہ کتاب سائل)

صاحب عبقات علامہ حامد حسین صاحب طاب ثراہ مرزا صاحب کی اس بیت کو جو آپ امام حسین کی شان میں ہے پڑھ کر کہتے تھے کہ یہ مضمون تو فارسی میں بھی نہیں دیکھا گیا ؎

خم ہر قدم پہ ایک جھکنے کی راہ ہے
رویت ہلال نعل کی اس پر گواہ ہے (دردالنواز دہ)

مشہور عالم اہلسنت مولوی عبدالحی صاحب فرنگی محلی نے ایک موقع پر کلام انیس و دبیر سنانے کے بعد فرمایا تھا کہ ایسے کامل شاعر ہندوستان میں تو کیا عرب و عجم میں بھی نہیں ملیں گے (حیاتِ دبیر صفحہ ۳۰)

امیر مینائی اکثر فرمایا کرتے تھے: میں تمام شعرائے عجم پر دو ایرانی شاعروں کو ترجیح دیتا ہوں فردوسی و جامی اور دبیر و انیس کو فردوسی و جامی پر بھی ترجیح دیتا ہوں (حیاتِ دبیر صفحہ ۲۲۶)

مولانا شبلی نعمانی نے بھی مرزا دبیر کے کمال کا اعتراف کیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں۔ بعض موقعوں پر مرزا دبیر صاحب نے جس بلاغت سے مضمون کو ادا کیا ہے میر انیس سے نہیں ہو سکا (موازنۂ انیس و دبیر صفحہ ۲۷۷)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں " اس میں کچھ شک نہیں کہ مرزا صاحب کی قوت متخیلہ نہایت زبردست ہے وہ اتنے دور کے استعارات و تشبیہات ڈھونڈھ کر پیدا کرتے ہیں کہ وہاں تک ان کے حریفوں کا طائر وہم پرواز نہیں کر سکتا۔ (موازنہ صفحہ ۲۵۱)

پروفیسر محمد حسین آزاد نے مرزا دبیر پر بہت سنجیدہ تبصرہ فرمایا ہے لکھتے ہیں " خاندانی شاعر نہ تھے لڑکپن میں مرثیہ پڑھتے تھے اس شوق نے منبر کی سیڑھی سے مرثیہ گوئی کے عرش الکمال پر پہنچا دیا۔ میر مظفر حسین ضمیر کے شاگرد ہوئے اور جو کچھ استاد سے پایا اسے بہت بلند اور روشن کر کے دکھا دیا تمام عمر میں کسی اتفاقی سبب سے کوئی غزل یا شعر کہا ہو ورنہ مرثیہ گوئی کے فن کو لیا اور اس درجہ تک پہنچا دیا کہ جس سے آگے ترقی کا راستہ بند ہو گیا ابتدا سے اس شغل کو آخرت کا سامان سمجھا اور نیک نیتی سے اس کا ثمرہ لیا (آب حیات صفحہ ۵۳۷)

مرزا مرحوم ایک مقام پر خود فرماتے ہیں

سرکار سلاطین سے سروکار نہیں
جز مجلس مولا کوئی دربار نہیں
مداح ہوں میں امام بے سر کا دبیر
سامان کیا کہ سر بھی درکار نہیں

بادشاہ اودھ واجد علی شاہ کو لوگ خداوند کہا کرتے تھے۔ مرزا مرحوم نے ایک مرتبہ بادشاہ کے سامنے مجلس پڑھا

یہ رباعی پڑھی۔

نادان کہوں دل کو کہ خردمند کہوں
یا سلسلۂ خبط کا پابند کہوں
اک روز خدا کو منہ دکھانا ہے دبیر
بندوں کو یہاں کس منہ سے خداوند کہوں

آج اردو ادب میں مرثیہ کا جو مقام ہے وہ محتاج تعارف نہیں اور یہ کارنامہ ہے انیس و دبیر کا کہ زبان اردو کے ارباب حل و عقد باوجود نظریاتی اختلاف کے مرثیہ کو ایک اہم مقام دینے پر مجبور ہوگئے ورنہ مرثیوں کی وہی حیثیت ہوتی جو آج کل مدح معصومین میں کہے جانے والے قصائد کا حال ہے حالانکہ اکثر معتدد شعرا کا مدحیہ کلام اردو کا سرمایہ ہے لیکن یہ کلام اردو ادب میں اس لیے جگہ حاصل نہیں کرسکا کہ اس میں مدح اہلبیت ہے

مرزا دبیر کے مرثیوں نے زبان و ادب کو اسطرح نکھارا کہ بقول مولوی امیر احمد صاحب۔ مرزا دبیر نے شوکت الفاظ اور مضمون آفرینی کے طلسمات سے اس زمین کو آسمان بنا دیا (یادگار انیس ص۱۱۳)

لیکن اس کے ساتھ مرثیے کی علت غائی کو پیش نظر رکھا اور اسے فراموش نہ کیا۔ آج ہم اگر ادب کے ساتھ مرزا دبیر کے فن پر کچھ روشنی ڈال رہے ہیں تو صرف اس لیے کہ وہ حقیقی مداح اہل بیت تھے۔ پروفیسر آزاد نے صحیح فرمایا ہے۔

"یہ بات درست ہے کہ مرزا دبیر کے پڑھنے میں وہ خوش ادائی نہ تھی لیکن حسن قبول اور فیض تاثیر خدا نے دیا تھا ان کا مرثیہ کوئی اور بھی پڑھتا تھا تو اکثر رونے رلانے میں کامیاب ہوتا تھا کہ یہی اس کام کی علت غائی ہے۔

(آب حیات ص۵۲۹)

غرض مرزا سلامت علی دبیر ایسا کامل الفن پیدا ہونا اب محال ہے ان کی جو جگہ ماضی میں خالی ہوئی تھی وہ اب بھی خالی اور مستقبل میں بھی اس جگہ کا پر ہونا تقریباً محال ہے۔

آسمان بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامین
طور بے موسیٰ۔ آدب بے شیخ منبر بے دبیر

۱۲۹۲ھ سال وفات

آقا سے کہیں کرتے ہیں دوری بندے
شیعہ ہیں حسینؑ کے حضوری بندے
کیا خوب کھلے سیاہ پوشی کے رمز
اللہ کے سائے میں ہیں نوری بندے

ہے ماتم اہل بیت میں بیت اللہ
پوشش ہے سیاہ رنگ اسود ہے گواہ
زمزم نہ کہو کعبہ ہے گریاں دائم
سمجھو نہ ستون ہے کشش نالہ و آہ

مرزا دبیر مغفور کے مطبوعہ سلام

جناب دلشاد حسین صاحب زیدپوری

یوں تو کلام دبیر مرحوم کو بہت سے مطابع نے شایع کیا مگر جس درجہ شہرت دفتر ماتم کی بیس جلدوں کو ہے جن میں جلد ۱ مناقب جلد ۲ تا ۱۵ میں مراثی، جلد ۱۵ مثنوی احسن القصص جلد ۱۶، ۱۷ و ۱۸ میں سلام جلد ۱۹ مخمّسات اور جلد ۲۰ رباعیوں پر مشتمل ہیں، جسے خود مرزا محمد جعفر اوج مرحوم نے اپنے کتب خانہ سے عبد الحسین مرحوم تاجر کتب کو طباعت کے لئے دیا تھا۔ مگر ان جلدوں کے سلسلے میں مرزا محمد طاہر رفیع مرحوم نے جو مرزا دبیر مرحوم کے پوتے اور مرزا اوج مرحوم کے بیٹے تھے "سبع مثانی مرتبہ سرفراز حسین خبیر مرحوم" میں ان مطبوعہ جلدوں میں بعض کلام کو اپنے دادا مرحوم کے اصل مخطوطوں کے مطابق نہیں پایا ہے۔

اب جبکہ یہ جلدیں بھی نایاب ہو رہی ہیں تو وہ اصل مخطوطے اور خود صاحب تصنیف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کلام کہاں سے دستیاب ہوں جنھیں اعتماد کے ساتھ بالیقین مرزا دبیر مرحوم کا اصل کلام کہا جا سکے۔

سر دست ان مطبوعہ بیس جلدوں میں جن میں جلد ۱۶، ۱۷ اور ۱۸ محض سلاموں پر مشتمل ہیں۔ ان تینوں جلدوں میں دبیر مرحوم کے سلام کے ساتھ ساتھ موصوف کے شاگردوں کے بھی سلام شامل ہیں اور اسی لئے تینوں جلدوں میں فرہنگ بھی دی گئی ہے جس میں مرحوم کے شاگردوں کے نام اور تخلص بتائے گئے ہیں۔ لہٰذا میں ان تینوں جلدوں میں سے ہر جلد میں جو سلام کی تعداد لکھی گئی ہے وہ علیحدہ علیحدہ مع فہرست پیش کر رہا ہوں۔ البتہ ایسے بھی دو چار سلام ان جلدوں میں ملے جو بغیر تخلص نہ ہونے کے ان کے لیے اہل تحقیق کی مزید تصدیق ضروری ہے۔

مرزا صاحب کے سلاموں کی فہرست پیش کرنے کے قبل مجھ جیسے کم مایہ کے لئے اپنے اس مختصر مضمون میں اصناف سخن میں سے سلام پر کچھ روشنی ڈالنا یا سلام ہائے دبیر پر کچھ تحریر کرنا سخت دشوار ہے البتہ اس سلسلے میں اپنی مختصر معلومات ارباب نظر کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

جہاں تک میرا حقیر مطالعہ ہے اس کا ٹھیک سراغ نہیں ملتا کہ سلام کہنے کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور وہ پہلا ہندستانی شاعر کون ہے جسے سلام گوئی کا موجد کہا جا سکے۔

البتہ اس مختصر تمہید کے بعد میرا خیال ہے کہ مرثیہ نگاروں نے مرثیہ کی طرز خوانندگی کا جز جس طرح مرثیہ کے ساتھ ساتھ رباعی کو قرار دیا۔ اسی طرح مرثیہ کے ساتھ سلام کی تصنیف مرثیہ نگاروں کو پسند آئی ہوا اور اس طرح سلام کو عام رواج مرثیہ نگاروں کے سبب حاصل ہوا ہو اور یا پھر یوں عرض کروں کہ سلام کہنے کی ابتدا ہندستان میں مرثیہ نگار شعراء نے بھی کی ہو اور اسے فروغ انیس و دبیر نے دیا ہو یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ جس کثرت کے ساتھ انیس کے مقابلے میں دبیر کے مراثی، رباعی کے پائے جاتے ہیں اسی طرح سلاموں کی بھی دبیر کے یہاں کوئی انتہا نہیں ہے۔

کیا خوب یہ دو مصرعے مقطعے میں دبیر مرحوم نے نظم فرمائے ہیں۔

یہ سلام شہ ابرار کیا خوب دبیر
دیکھ انعام میں مولا تجھے کیا دیتے ہیں

اس شعر سے دبیر مرحوم کی عقیدت اپنے ممدوح سے صاف صاف ظاہر ہو رہی ہے اور مداح اہلبیتؑ کو بارگاہ ممدوح سے جو جو عطا یا حاصل ہوئے، اس میں سے ایک ادنیٰ عطا شاید یہ بھی رہی ہو کہ ہر قافیہ اور ردیف جو تصنیف کے سلسلے میں سلام کے سلسلے دشوار ہو سکتی تھی وہ دبیر مرحوم کے لئے بے حد آسان بن گئی۔ آپ کے سلام دو طرح کے ملتے ہیں۔ ایک کی ابتدا لفظ سلام اور سلامی، مجرئی اور مجرائی کے ساتھ اور دوسرے غزل کی طرح جیسے آپ فہرست ذیل ملاحظہ فرمائیں گے:-

دفتر ماتم جلد شانزدہم حصہ اول مجموعہ سلام

صفحات ۲۰۴ تعداد سلام ۱۱۰

ردیف الف:-

۱۔ اے سلامی عشق مولا ہو گیا
۲۔ مجرائی شمع ساں سر ہوا جدا ہوا
۳۔ مجرئی حر نے جو شبیرؑ کو آقا سمجھا
۴۔ نظم جو وصف قد شمشاد زہراؑ ہو گیا
۵۔ مجرئی گو شہ کو وقت ذبح غش آ گیا
۶۔ ملنے سے پنجتن کے سلامی خدا ملا
۷۔ عطا یا شہ ہل اتا کیجئے گا
۸۔ شہ کا وہ تشنہ دہن یاد جو آ جاتا ہے
۹۔ غم شہ سے ہے داغ سینہ ہمارا
۱۰۔ مجرائی گرم نالہ جو وقت بکا ہوا
۱۱۔ مجرائی حق نے شہ کو عجب حوصلہ دیا
۱۲۔ کربلا کو مجرئی جس روز جانا ہو گیا
۱۳۔ مجرئی پھر نہ یاد نہیں جایا جاتا
۱۴۔ مجرائی جس نے ماتم سرور بپا کیا
۱۵۔ مجرئی شاہ جدا کر آج تمام ہو چکا
۱۶۔ مجرائی سے مدام جو راہ رضا میں تھا
۱۷۔ اے مجرئی شہید جو شبیر خدا ہوا
۱۸۔ مہرباں برج امامت کا ستارا ہو گیا
۱۹۔ شیعوں کو ذوالجلال نے مجرائی کیا دیا
۲۰۔ مجرئی موسم عزا آیا
۲۱۔ سطور آگ کمال ہو سرور امام کا
۲۲۔ نہ دفن بعد فنا ابن بوتراب ہوا
۲۳۔ اے سلامی دل شبیرؑ میں ہو گھر میرا
۲۴۔ نانا نے جن کے مجرئی شق القمر کیا
۲۵۔ اے مجرئی تو شہ کے مقدر کو دیکھنا
۲۶۔ سلامی خاک ہوا خاک سے غبار ہوا
۲۷۔ جو رُکے جو مجرئی سلطان بحر و بر پیدا
۲۸۔ دل پہ میرے زخم ہے مجرائی اس تلوار کا
۲۹۔ در علیؑ کا میسر جسے غبار ہوا
۳۰۔ مجرئی کیا جو صلہ تھا اصغر بے شیر کا
۳۱۔ جو کہ قربان مزار علی اکبرؑ ہو گا
۳۲۔ دفن جو در شاہ نجف پر اگر اپنا
۳۳۔ شہ سے مجرائی ہوا جبکہ علمدار جدا
۳۴۔ میری ہر ایک سے ہو مجرئی تقریر جدا
۳۵۔ موزوں سلام شاہ کا مطلع اگر کیا
۳۶۔ صدف چشم سے مجرائی وہ گوہر نکلا
۳۷۔ پایا جو شاہ دیں کا تن و سر جدا جدا
۳۸۔ مجرائی مقام اب سر منبر ہے ہمارا
۳۹۔ لکھتے ہیں وصف احمدؐ و حیدرؑ جدا جدا
۴۰۔ رونے سلامی زیست کا ہو اعتبار کیا
۴۱۔ مجرئی زائر ہوا جو حضرت شبیرؑ کا
۴۲۔ لکھو ماتم حسینؑ میں دفتر جدا جدا
۴۳۔ مجرئی شاہ سے کہتی تھی یہ رو کر صغرا
۴۴۔ اشعر سے قلب شہید روشن ضمیر کا
۴۵۔ مجرائی جب کہ خاتمۂ پنجتن ہوا
۴۶۔ مجرائی اوج پہ ہے دیدۂ گریاں اپنا

۴۷۔ جو دل میں ولائے شہِ مرداں نہیں رکھتا

۴۸۔ صغرا نے بھی اے مجرئی غم کھائے ہیں کیا کیا

۴۹۔ جو سلامی شہِ والا کا ثنا خواں ہوگا

۵۰۔ مجرئی جب ہوا پامال چمن زہرا کا

۵۱۔ پامال کربلا میں جو شہ کا چمن ہوا

۵۲۔ مجرائی قمر چھپ گیا خاتونِ جناں کا

۵۳۔ مجرئی خیمے میں شہ کے حشر کا ساماں ہوا

۵۴۔ غم کا سر حسینؑ پہ کوہ گراں گرا

۵۵۔ بزمِ ماتم میں سلامی نام روشن ہوگیا

۵۶۔ سلامی ماتم سرور کہاں نہیں ہوتا

۵۷۔ مجرائی ثنا خواں ہے جو سلطانِ زمن کا

۵۸۔ پیشوا راہنما ہے شہِ مرداں اپنا

۵۹۔ اکبرؑ کا جب نہ رن میں سلامی نشاں ملا

۶۰۔ در دولت امیر المومنین کا

۶۱۔ مجرئی حضرت کا مہماں ہوگیا

۶۲۔ رو تو اے مجرئی اب موسم ماتم آیا

۶۳۔ مدح شبیرؑ میں مصرع جو رقم ہوئے گا

۶۴۔ وقفِ عباسؑ کو مجرائی قضا نے نہ دیا

۶۵۔ اک نہ اک نیرنگ ہوتا ہی رہا

۶۶۔ سلامی حشر جو سوئے لشکر ثواب آیا

ردیف با:۔

۶۷۔ شبِ عاشور بھائی کو بلا میں دیکھ کر زینبؑ

۶۸۔ پائے نہ مجرئی خلعت بو تراب آب

ردیف تا:۔

۶۹۔ مجرئی یوں کوئی باندھے نہ گنہگار کے ہات

۷۰۔ یوں آبرو سے مجرئی اشکِ عزا کے سات

۷۱۔ مجرائی اس سکینہؑ کے باندھے رسن میں ہات

ردیف جیم:۔

۷۲۔ ہر تعزیہ خانے میں قیامت ہے بپا آج

ردیف دال:۔

۷۳۔ مجرئی کوئی نہ کرتا [illegible] داد سجاد

۷۴۔ مجرئی بعد قضا بھی نہ اٹھے واں سے شہید

۷۵۔ دو شبیرؑ نہ [illegible] ہوش نہ گم ہو

۷۶۔ زینبؑ [illegible] ہوش نہ گم ہو

ردیف را:۔

۷۷۔ مجرائی کہا شہ نے کہ یارا نہیں اصغر

۷۸۔ کیوں نہ مجرا آہ سے گزریں فلک پر یہ تیر

۷۹۔ سلام اُس پہ جو پہنے ہے ناتواں زنجیر

۸۰۔ مجرئی جب کہ چڑھا شاہ کا سر نیزے پر

۸۱۔ ہو خاک سلامی در سرور کے برابر

۸۲۔ مجرئی نور دو صفاہے میری گویائی میں

۸۳۔ چل سلامی آستانِ شاہ پر

۸۴۔ مجرائی سبک دوش ہے منبر سے اُتر کر

۸۵۔ دربانِ درِ شاہ ہے رضواں کے برابر

۸۶۔ خزاں چمن ہوا زہرا کا درمیانِ بہار

۸۷۔ غم حسینؑ میں بھولے ہیں داستان بہار

۸۸۔ نام شبیرؑ کا لے مجرئی گریاں ہو کر

۸۹۔ بجز روضہ شبیرؑ نہیں امن کہیں اور

ردیف سین

۹۰۔ نگہہ مہر کا جلوہ جو دکھائے عباسؑ

ردیف فا:۔

۹۱۔ مجرئی انصار کم سے تھے شاہ والا کی [illegible]

ردیف کاف:۔

۹۲۔ مجرئی دامن میں لی جب کربلا کے بَن کی خاک

۹۳۔ سوزِ غم شبیرؑ میں ہے یہ اثر [illegible]

ردیف لام:۔

۹۴۔ یاد آتے ہیں نہ بس احمد مختار کے [illegible]

۹۵۔ سیپارہ ہیں بصورتِ قرآں تن کے پھول

۹۶۔ اے مجرئی بلا میں ہیں شبیرؑ آج کل

۹۷۔ ہیں آج مجرئی اُسی تشنہ دہن کے پھول

ردیف میم:۔

۹۸۔ اے مجرئی اس بحر میں وہ شعر سنا گرم

۹۹۔ بجز سلام لکھے گر نہ دبیر کا قلم

۱۰۰۔ مجرائی خلد ہے سرکار امام مظلوم

ردیف نون:۔

۱۰۱۔ نام پر شاہ کے پانی جو پلا دیتے ہیں
۱۰۲۔ مجرائی پاؤں جہاں شاہ ہدا رکھتے ہیں
۱۰۳۔ غمِ شبیرؑ میں جو اشک بہانے کا نہیں
۱۰۴۔ کہے نہ مجرائی کیوں داستانِ حسینؑ
۱۰۵۔ مجرائی شہ کے غم میں کہیں انتہا نہیں
۱۰۶۔ مجرائی شیعوں پہ واجب ہو گا ماتم میں
۱۰۷۔ مجرائی دور روضۂ شاہ ہوا نہیں
۱۰۸۔ طالب نہ سلطنت کے نہ ظلِ ہما کے ہیں
۱۰۹۔ غمِ آلِ عبا ہے اور میں ہوں
۱۱۰۔ مجرائی حاضر بزمِ شہِ والا میں ہوں
۱۱۱۔ سلامی کسی کا سہارا نہیں

دفترِ ماتم جلد ہفتم حصۂ دوم مجموعۂ سلام
صفحات ۲۵۴، تعدادِ سلام ۱۳۴

ردیف نون:۔

۱۔ سلام اُن پہ جو غم میں مبتلا ہیں
۲۔ جلوہ ہے جو غبارِ درِ بوترابؑ میں
۳۔ مجرائی روتا ہوں غمِ بوترابؑ میں
۴۔ جز اشک نخلِ غم میں سلامی ثمر نہیں
۵۔ مجرائی اکبرؑ کے ماتم میں پیمبرؐ روتے ہیں
۶۔ سلامی لاشۂ اصغرؑ نہ تھا آغوشِ سرورؑ میں
۷۔ مجرائی وصفِ روضۂ شبیرؑ کیا کریں
۸۔ مثلِ فلک بلند ہیں منبر کہاں کہاں
۹۔ سونا ہے جبین سے جو سلامی مزار میں
۱۰۔ اب سلامی میں کہاں منبرِ شبیرؑ کہاں
۱۱۔ ہے کاسر گیسوئے رخِ اکبرؑ کہاں کہاں
۱۲۔ مجرائی مصحفِ ماتم کی ہیں تفسیرِ حسینؑ
۱۳۔ مجرائی تو یومِ محشر پہ ہے محشر ان دنوں
۱۴۔ شمیمِ روضۂ شہ سے دماغ جو دیتے ہیں
۱۵۔ مجرائی نہ کیوں کر رہے ماتم رمضاں میں
۱۶۔ کیوں نہ پھر قدر ہو لے مجرائی ہم چشموں میں
۱۷۔ گر طوفِ قبرِ سید عالی ہمم کر دیں
۱۸۔ گو کہ اسے مجرائی وہ تشنہ دہن کہتے ہیں
۱۹۔ عصیاں سے مجرائی نہیں رنج و محن ہمیں
۲۰۔ مجرائی شہ نے کہا مرگ کا خواہاں ہوں میں
۲۱۔ رہے جو مجرائی شہ کے فغاں میں
۲۲۔ سلامی نجف کو عناں کھینچتے ہیں
۲۳۔ جو شہ تیغ شعلہ فشاں کھینچتے ہیں
۲۴۔ جو مجرائی سیفِ زباں کھینچتے ہیں
۲۵۔ مہتاب وہ نہیں ہیں سلیماں زمن کے ہیں
۲۶۔ حضرت کے اہلبیتؑ کا جو مدح خواں نہیں
۲۷۔ مجرائی اشک جو بہاتے ہیں
۲۸۔ السّلام اے قبرِ زیبائے حسینؑ
۲۹۔ سلامی اوج فلک پر نہیں یہ تلے ہیں
۳۰۔ سلامی آج مدینے میں ہو عزائے حسینؑ
۳۱۔ غمِ شہ میں گر اشک باری ہے
۳۲۔ مجرائی دل فگار جو گلشن میں پھول ہیں

ردیف واؤ:۔

۳۳۔ کیوں نہ غم سے خشک ہو سبطِ پیمبرؐ کا لہو
۳۴۔ نیساں کی چشم گر غمِ سرورؑ میں تر نہ ہو
۳۵۔ مجرائی شہ نے کہا اے مری خواہر دیکھو
۳۶۔ سلامی کہتے تھے ظالم رلاؤ زینبؑ کو
۳۷۔ غیظ میں جب آ کے کھینچا شاہ نے تلوار کو
۳۸۔ مجرائی یہ تشنگی تھی سیدِ ابرار کو
۳۹۔ بیت جنت میں ملے نظمِ سلام ایسا ہو
۴۰۔ سلامی سجدۂ حق میں کیا مجروح حیدرؑ کو
۴۱۔ مجرائی کفن جو نہ ملا شاہِ زمن کو
۴۲۔ لائی ہے بوستانِ رسولِ خدا کی بو

۴۳۔ رضواں کے آگے حشر میں پڑھ کر سلام کو
۴۴۔ بابِ خیبر کھول دے دستِ خدا ایسا تو ہو
۴۵۔ محو ہیں قدسی حبیبِ ذوالجلال ایسا تو ہو

ردیف ھا،

۴۶۔ سلامی کہتے تھے اکبرؑ خطاب آہستہ آہستہ
۴۷۔ گئے سوئے میداں جو اکبرؑ دوبارہ
۴۸۔ کیا حضرت عباسؑ سے تھے شیدائے سکینہؑ

ردیف یا،

۴۹۔ مجرئی شہ کو نہ کیوں خلقِ خدا یاد کرے
۵۰۔ اے مجرئی شبیرؑ کو کیا یادِ خدا تھی
۵۱۔ جن کے مدفن کی دو شہ پہ بنا ہوتی ہو
۵۲۔ مجرائی عرش ہے در آقا کے سامنے
۵۳۔ مجرئی آیا محرم خوں بہانا چاہیئے
۵۴۔ مجرائی قحطِ آب بھی تھا اور غذا نہ تھی
۵۵۔ گنہ کے مرض کی دوا چاہیئے
۵۶۔ پنجتن گر داورِ بزمِ عزا ہو جائیں گے
۵۷۔ جو کہ مصروفِ سلامِ شہدا رہتا ہے
۵۸۔ مجرئی نسخۂ شفا کیا ہے
۵۹۔ مجرئی کہتی تھی صغرا یہ دوا لائی ہے
۶۰۔ مجرائی شہ کی لاش کو یادِ خدا رہی
۶۱۔ سلامی ہر طرف شورِ بکا ہے
۶۲۔ کربلا میں جو سلامی شہ والا آئے
۶۳۔ مجرائی زر و سیم کی پروا نہیں رکھتے
۶۴۔ چشمِ تر پہ اشک برساتی رہی
۶۵۔ ہر اک چشم صرفِ بکا ہو گئی
۶۶۔ مری تسلیم ہے اس کو جو شیرِ حق کا پیارا ہو
۶۷۔ دل سے جو معتقد خاکِ شفا ہو جائے
۶۸۔ جس نے عزائے شاہِ شہیداں بپا نہ کی
۶۹۔ مجرئی جا کر زیارت کو نہ آنا چاہیئے

۷۰۔ ہر اک ذرہ کب اے مجرئی حساب میں ہے
۷۱۔ اے مجرئی وہ بارگہِ بوترابؑ ہے
۷۲۔ سلامی ذرہ نہ دوں آفتاب کے بدلے
۷۳۔ بزمِ ماتم میں جو باچشمِ پرآب آتا ہے
۷۴۔ کیونکر نہ مجرئی کو تنفر ہو آب سے
۷۵۔ نبیؐ کو مجرئی غم بے حساب ہوتا ہے
۷۶۔ مجرا اسے جو کہتی ہے عاشور کی شب ہے
۷۷۔ نکلے جو شبیرؑ ہمرہ خانۂ تراب کے
۷۸۔ جس گھڑی گرمی بازارِ قیامت ہوگی
۷۹۔ مجرئی شاہ کی شہادت ہے
۸۰۔ مجرئی یادِ حق ہے یادِ علیؑ
۸۱۔ حشر کو جوہری اشکِ عزادار لئے
۸۲۔ مجرئی کہتے تھے شہ فراقِ اکبرؑ کے لئے
۸۳۔ اے مجرئی فغانِ حرم عرش پر گئی
۸۴۔ کینہ دل مجرائی سرور میں نہیں ہے
۸۵۔ سلامی شاہ کے غم میں جو اشک بار ہوئے
۸۶۔ سلامی ابرِ فلک کیوں نہ اشکبار رہے
۸۷۔ سلامی پیشوائے اوصیا اس طرح جیتے ہیں
۸۸۔ مجرائی ابر کیوں نہ بہے دیدۂ تر سے
۸۹۔ مجرائی جہاں شہ کی تصویر نظر آئے
۹۰۔ ہو مجرئی نہ خواہش اکسیر و زر سے مجھے
۹۱۔ غضب ہے مجرئی مختار سے جو کوثر کے
۹۲۔ اے مجرئی بتولؑ عزائے پسر میں ہے
۹۳۔ ہے شاہ کے صدقے سے یہ توقیر ہماری
۹۴۔ سلامی جب کہ مجھ کو قتلِ سرور یاد آتا ہے
۹۵۔ اس کو مجرا کہ جو بیکس بھی ہے دلگیر بھی ہے
۹۶۔ اے مجرئی جو اشک مری چشمِ تر میں ہے
۹۷۔ برگشتہ سلامی کا مقدر تو نہیں ہے
۹۸۔ جگر جو رخ سے جوں تیر گزر کرتا ہے

۹۹۔ گر رتم جلوۂ نورِ رُخ سرور ہوئے
۱۰۰۔ رن میں اے مجرئی زینبؑ کے جو دلدار آئے
۱۰۱۔ پاؤں سجادؑ کا اے مجرئی زنجیر میں ہے
۱۰۲۔ سلامی سبز عجب دشت کا نذر میں ہے
۱۰۳۔ مجرائی نہ کر ذکر کہ گنہ رسے آ سکے
۱۰۴۔ مجرئی جب جوئے اکبر سے سینے کے ٹکڑے
۱۰۵۔ مجرئی ہو ہوں نہ کیوں شہ کے جگر کے ٹکڑے
۱۰۶۔ مجرئی دیکھ کے مجلس میں گہربار مجھے
۱۰۷۔ کربلا میں مجھے لیجائے جو تقدیر مری
۱۰۸۔ مجرئی شہ نے کہا یوں حیدرؑ کرار سے
۱۰۹۔ مجرئی کہتے تھے سرور زینبؑ دلگیر سے
۱۱۰۔ مجرائی علم شاہ نے جب تیغ دو سر کی
۱۱۱۔ خواہش نہیں مجرائی ہمیں دولت و زر کی
۱۱۲۔ جس وقت سلامی نے مژہ اشکوں سے تر کی
۱۱۳۔ مجرئی شہ کو جو ہر شام و سحر یاد کرے
۱۱۴۔ ضیا سے رُخ شہ جو مسطور ہے
۱۱۵۔ مجرائی گر رسا مری تقدیر ہو گئی
۱۱۶۔ داغ غم حسینؑ سے دل لالہ زار ہو
۱۱۷۔ تازہ ہیں داغ غم مژہ اشکبار سے
۱۱۸۔ پڑھتے ہیں سب زیارت سرورؑ کھڑے کھڑے
۱۱۹۔ جس کو الفت ہے سلامی حیدرؑ کرار کی
۱۲۰۔ مجرئی ہر چشم گوہر بار ہے
۱۲۱۔ جبکہ خیمے سے برآمد شہ ابرار ہوئے
۱۲۲۔ ہر دل ہے داغ ماتم شبیرؑ کے لئے
۱۲۳۔ مجرئی کیا ذات پاک حضرت شبیرؑ تھی
۱۲۴۔ تحت زاداز نہ تاج قیصر دے
۱۲۵۔ مجرئی رن میں جو عباسؑ دلاور آئے
۱۲۶۔ گو روضۂ حسین سلامی سے دور ہے
۱۲۷۔ مجرئی اشک بہا سبط پیمبرؐ کے لئے

۱۲۸۔ گردی تھی مجرائی پیش حسنِ اکبرؑ چاندنی
۱۲۹۔ مجرئی ہے سوگوار ماہِ حیدرؑ چاندنی
۱۳۰۔ وصف حضرت کے مہ عارض کا جو سکوت ہے
۱۳۱۔ سلامی رن میں جو سلطان بحر و بر آئے
۱۳۲۔ قتل شہ کو اسے سلامی شام کے لشکر گئے
۱۳۳۔ مجرئی طالع خفتہ جو ہوں بیدار ابھی
۱۳۴۔ اے مجرئی نمود محرم صفر میں ہے

دفتر ماتم جلد ہژدہم حصۂ سوم مجموعہ سلام

صفحات ۱۸۲' تعداد سلام ۹۸

۱۔ خیمہ در شاہ پہ سر ہے
۲۔ مجرئی رو دیں نہ کیوں کہ ہم گریباں چیر کے
۳۔ مجرئی خیمے سے جب حضرت شبیرؑ چلے
۴۔ اے مجرئی گردن سے جدائی ہوئی سر کی
۵۔ مجرئی رن میں جو صبح شب عاشور ہوئی
۶۔ کشتۂ غم ہے کہ حق میں ترے اکسیر ہو
۷۔ مجرئی اشک بہا سبط پیمبرؐ کے لئے
۸۔ شفاعت جہاں اہل تقصیر کی ہے
۹۔ سلامی ذاکروں کو رتبۂ معراج حاصل ہے
۱۰۔ سلامی ماتم شبیرؑ میں جو آج بیکل ہے
۱۱۔ مجرائی بیچے ساقی کوثر کے لال کے
۱۲۔ رمضان کیوں نہ سلامی کو محرم ہو جائے
۱۳۔ تعریف کی ہے نظم رواق امام کی
۱۴۔ پیرو شہ بے سر کا ازل سے جو قلم ہے
۱۵۔ مجرائی غلامی میں شہنشاہ امم کی
۱۶۔ مدح علیؑ میں ہے یہ بلندی کلام کی
۱۷۔ سلامی یہ اُمت کا کیسا ستم ہے
۱۸۔ سردار و علمدار کا مجرائی کو غم ہے
۱۹۔ ہے مدح کربلا میں یہ رفعت کلام کی

۲۰۔ غمِ شاہ میں مجرئی ہم رہے
۲۱۔ صدمہ مجرائی عجب شاہِ امم دیکھیں گے
۲۲۔ سلامی یہ رہ میں ستم ہو گئے
۲۳۔ دارد جو رزم گہہ میں شاہِ امم ہوا ہو
۲۴۔ اک بیت جو سلام کی شہ کی رقم کرے
۲۵۔ گر مرقع میں شبیہ شہ ذیشان نکلے
۲۶۔ دل میں ہمارے داغِ امامِ زمن رہے
۲۷۔ مجرئی شہ کی مصیبت جو بیاں ہوتی ہے
۲۸۔ پڑھوں سلام محبانِ پنجتن کے لئے
۲۹۔ السّلام اے قبلۂ ایماں مرے
۳۰۔ سلامی ہر اک ذرہ مہر مبیں ہے
۳۱۔ وصفِ گلِ زہرا میں ہیں رنگیں سخن ایسے
۳۲۔ ٹکڑے اے مجرئی زہراؑ کا چمن ہوتا ہے
۳۳۔ فصلِ خزاں جو گلشنِ شاہِ زمن میں ہے
۳۴۔ اس کو مجرا نہ جسے خوف تھا شمشیروں سے
۳۵۔ قتلِ شبیرؑ کے تھے مجرئی ساماں کتنے
۳۶۔ جب اے سلامی غمِ پنجتن ہے
۳۷۔ سلامی یہ پُر درد اپنا سخن ہے
۳۸۔ بہشتِ بریں میں جو نہرِ لبن ہے
۳۹۔ اے مجرئی کیوں کر نہ جھڑیں پھول دہن سے
۴۰۔ رواقِ امامِ زمن دیکھئے
۴۱۔ موزوں وہ ثنائے گلِ زہراؑ میں سخن ہو
۴۲۔ کون قائل تھا سلامی کہ جناں اور بھی ہو
۴۳۔ مجرئی فخرِ ملک کیوں نہ وہ انساں ہوئے
۴۴۔ مجرئی گلچیں قضا شبیرؑ کے گلشن میں ہے
۴۵۔ صفدر کو طلب لے شہ مرداں نہیں کرتے
۴۶۔ مجرائی جب تلک مرے قالب میں جان رہے
۴۷۔ مضمونِ عزا کے دل میں ہیں پنہاں نئے نئے
۴۸۔ کیا کیا جوان سپاہِ امامِ زمن میں تھے

۴۹۔ اے مجرئی قیامت صغرا عیاں ہوئی
۵۰۔ سخت دل ہیں مجرئی نذرِ حسن کے واسطے
۵۱۔ یہ شبِ ضربت ہے پیٹو اے محبانِ علیؑ
۵۲۔ مضموں ہے گل سطر یہ طوبیٰ کا گماں ہے
۵۳۔ درِ حیدرؑ پہ خم تیری جبیں ہے
۵۴۔ مجرئی سبطِ نبیؐ جبکہ چمن سے نکلے
۵۵۔ مجرئی ماتمِ کوثر کو جو پانی نہ ملے
۵۶۔ سلامی دو پہر تک شہ کے لشکر کی صفائی ہو
۵۷۔ قتلِ شبیرؑ کی اے مجرئی تیاری ہے
۵۸۔ سلامی شاہ پہ شدت تھی یہ تشنہ دہانی کی
۵۹۔ درِ پنجتن پہ رسائی ہوئی
۶۰۔ سلامی کو کیا بادشاہی ہوئی
۶۱۔ سلامی [illegible] اشکباری رہے
۶۲۔ خیمۂ شہ کے جلنے لے مجرئی نالے ہوئے
۶۳۔ مجرئی [illegible] ڈیرا [illegible] بڑی ہوئے گی
۶۴۔ [illegible] مجرائی درِ حیدرؑ پہ جانے سے

(ج) [illegible]

۶۵۔ سشر کے مجرے کی بار پائی ہے
(ف) [illegible] عرش پہ فکر کی رسائی ہے
۶۶۔ امتیازِ نیک و بد کیا ہو قضا کے سامنے
۶۷۔ زباں دہن میں ہے شبیرؑ کی ثنا کے لئے
۶۸۔ عروج ہے جو درِ شاہ کے گدا کے لئے
۶۹۔ دکھا دے روضۂ شبیرؑ ابکی سال مجھے
۷۰۔ حق نے دل مجھ کا بھرا مہر و وفا سے پہلے
۷۱۔ مجرئی [illegible] شہ کے سوا اور بھی ہے
۷۲۔ صاف کر مجرئی [illegible] ریا سے پہلے
۷۳۔ نامِ شبیرؑ کا لو سقی شفا سے پہلے
۷۴۔ تن کو لاغر دل کو صرف نوحہ خوانی کر دیا
۷۵۔ لائے پنجتن ہے مجرئی اپنے مقدر میں

۷۶۔ یوں مجرئی ثواب ہے اشکِ عزا کے ساتھ
۷۷۔ خاکساری ہے سلامی کیمیا میرے لئے
۷۸۔ باغِ عالم میں بہارِ زندگانی دیکھ لی
۷۹۔ دم نہ لے مجرئی رونے میں اگر دم ٹوٹے
۸۰۔ مجرائی شور و شین محبوں کے گھر میں ہے
۸۱۔ کیا بزم میں عروج پہ ہے آفتابِ اشک

[illegible] :۔

۸۲۔ ضیافت میں پیمبر نے جو شرکت آپ کی چاہی
متفرقہ نظم :۔ ،، چرخِ چہارم پہ گئے جب شبِ معراج نبی
(ج) ،، رواقِ حسینی نے رفعت عطا کی
(ت) ،، سلامی عجب ذات ہے مرتضیٰ کی
۸۳۔ کیا ہم کو حق نے سخن آفریں
۸۴۔ جس کا مسکن ہے سلامی روضۂ شبیر ہے
۸۵۔ گیسوئے اکبر نے سنبل کو پریشاں ہی دیا
۸۶۔ دور کر دیتا ہے اک ذرہ سب آزاروں کو

۸۷۔ سوزاں ہو غمِ شہ میں جو داغِ پرِ طاؤس
۸۸۔ کشتۂ غم ہو کہ حق میں ترے اکسیر ہے
۸۹۔ جہاں میں کس کا مددگار بجز تراب نہ تھا
۹۰۔ زینت اس بزمِ عزا کی ہے عزاداری سے
۹۱۔ چشم تر اعجاز دکھلاتی رہی
۹۲۔ مجرائی رو رہا ہوں غمِ بوتراب میں
۹۳۔ بلوے میں اہلبیت کے سر پر ردا نہیں
۹۴۔ غازۂ روحِ سخن وصفِ شہ غازی ہے
۹۵۔ (غائب ۹۴ کے بعد ۹۶ کا ہندسہ ہے)
۹۶۔ صورت ابر نہ ہم سوئے گلستاں جاتے
۹۷۔ نظم کی جو ہر جگہ پہ دھوپ سونے کا ورق
۹۸۔ زہے اشکِ عزا کہ صاف گوہر ایسے ہوتے ہیں

(ت) (۹۷) مرزا دو علمدار کا مجرائی کو غم ہے (۱۸) سلام (ج)
(ت) (۹۶) اکیسویں شب آئی ہے ماہِ صیام کی (۱۹) سلام مطلع دیگر
سے یہ دو سیانی مطلع ہے۔

مرزا دبیر مرحوم

شبیر کا عز و جاہ سبحان اللہ — غربت میں ہیں سب گواہ سبحان اللہ
حلقوم پہ شمشیر زباں پر تکبیر — سبحان اللہ واہ سبحان اللہ

نیزے پہ سرِ شہ سے تھی حشمت پیدا — تھا جلوۂ خورشید قیامت پیدا
نیزے پہ وہ سر تھا سب سروں کے آگے — تھی بعد فنا شانِ امامت پیدا

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

مرزا دبیر کا منفرد ادراک

میں نے اپنی کتاب "مرثیہ نگاری اور میر انیس" کے آخری باب میں مولانا شبلی کے موازنۂ انیس و دبیر کا ذکر کرتے ہوئے اس بات پر خاص زور دیا ہے کہ میر انیس اور مرزا دبیر دونوں اول درجہ کے شاعر ہونے کی وجہ سے اس قدر منفرد اور مختلف ادراک رکھتے ہیں کہ دونوں کا موازنہ اس غرض سے کرنا کہ ایک کو بڑھایا جائے اور دوسرے کو گرایا جائے بہت بڑی غلط فہمی اور تنقیدی شعور کی بہت بڑی کمی ہے۔ میر انیس کے ادراک کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ اُن کا ادراک اس قسم کا ہے جس کو رومانی یا قدرتی احساس (Romantic Natural Sensibility) کہا جا سکتا ہے جب کہ مرزا دبیر کا ادراک وہ ہے جسے مابعد الطبیعیاتی ادراک (Metaphysical Sensibility) کہنا چاہیئے۔ یہ دونوں ادراک اس قدر متضاد ہیں کہ ایک کو سچی شاعری اور دوسرے کو جھوٹی یا بناوٹی شاعری کہہ دینا آسان ہے اور یہ اُس وقت اور بھی زیادہ آسان ہو جاتا ہے جب کہ شبلی کی طرح کا نقاد رائے دینے بیٹھے جو حالی کے نظریہ نیچرل شاعری سے گہرے طور پر متاثر ہو۔ اس معاملہ میں اصل غلطی یہ ہے کہ ہمارے نقاد دو منفرد ہستیوں اور اُن کے مختلف ادراک میں فرق کرنے سے قاصر ہیں اور پھر وہ تنقید کو ایک قسم کی گھوڑ دوڑ سمجھتے ہیں جس میں نقاد کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ اپنے مرغوب شاعر کو مخالف سے بہتر اور برتر ثابت کرے۔ جدید غیر جانبدار تنقید اگر دو شاعروں کا موازنہ کرتی ہے تو یہ جاننے کے لئے کہ وہ کس حد تک ایک دوسرے سے اس قدر منفرد ہیں کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا اور دونوں کی مخصوص نفسیاتی ہستی کا جو ان کے مختلف فنون کی بنیاد ہوتی ہے نقشہ تضاد سے صاف صاف سامنے آجاتا ہے۔

میرا مقصد میر انیس کا مطالعہ تھا مگر چونکہ مرثیہ نگاری کے میدان میں مرزا دبیر اُن کے ہم پلہ رہے اس لئے مرزا دبیر کی شاعرانہ فطرت پر نظر ڈالنے سے میرے سامنے دونوں کی فطرت اور دونوں کا الگ الگ ادراک سامنے آگیا۔ میں نے مرزا دبیر کے یہاں مابعد الطبیعیاتی ادراک کا اہم عمل پایا اور جب بھی میرے سامنے کوئی دونوں کا موازنہ کرنے بیٹھ اور شبلی کی راہ جانے لگا یا کسی مبہم طریقہ پر شبلی کی پیروی کرنے لگا تو میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ دونوں شاعروں کی بڑائی اسی میں ہے کہ دونوں کے ادراک مختلف بلکہ متضاد ہیں۔

اب چونکہ میں مرزا دبیر کی طرف خاص طور سے متوجہ ہوں اس لئے اس امر کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مابعد الطبیعیاتی ادراک کیا ہے اور مرزا دبیر کس طرح اس کے

اہم مالک ہیں۔ شاعر کا ایک ادراک تو وہ ہوتا ہے جس کے بابت کہا گیا ہے کہ شاعری دل سے نکلتی ہے اور فوراً دل میں گھس جاتی ہے۔ اس کی تعریف میر انیس نے یوں کی ہے:۔

سامعیں جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی

دوسرا ادراک یہ ہوتا ہے کہ شاعر کے دل کی نکلی ہوئی بات دماغ سے بھی نکلتی ہے اور پہلے سامع کے دماغ پر اثر کرتی ہے اور پھر دل میں اُترتی ہے۔ عموماً اُن شاعروں کا جو فطری شاعر ہونے کے علاوہ عالم بھی ہوتے ہیں ایسا ہی ادراک ہوتا ہے۔ مرزا دبیر مسلّم عالم تھے اور اُن کے ادراک کی مثال یہ شعر ہے:۔

فرعونِ شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیم اور یدِ بیضا تھا آفتاب

اس کے خلاف میر انیس کا یہ شعر رکھیے:۔

تھا چرخِ اخضری پہ وہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

تو معلوم ہوتا ہے کہ مرزا دبیر کی تخیل بجائے اشیاء کے قدرتی عالم یعنی اُن کے رنگ کی طرف جانے کے تاریخی واقعات کی طرف جاتی ہے اور استعارے قدرت سے نہیں بلکہ کتابوں سے لاتی ہے۔ شب ان کے لئے محض سیاہ نہیں ہے بلکہ کالے ضمیر کے فرعون کی طرح ہے۔ سورج محض چمکدار اور رنگ کی چیز نہیں ہے بلکہ روشنی یدِ بیضا ہے اور دن محض روشنی کا وقت نہیں ہے بلکہ حضرت موسیٰ کی طرح تاریکی سے نبرد آزما ہے۔ سامع مرزا دبیر کے شعر سے اک دم سے متاثر نہیں ہو جاتا بلکہ پہلے فرعون، موسیٰ اور یدِ بیضا کے واقعہ کی طرف اس کا دماغ جاتا ہے اور پھر اس واقعہ کی اہمیت سمجھ کر وہ دن کے نکلنے کا احساس کرتا ہے۔ یہاں محض حسیات اور تاثرات کا کھیل نہیں ہے بلکہ عقل بھی اس میں حصہ دار ہے۔ اسی طرزِ تخیل کو ڈاکٹر جانسن نے ابعد الطبیعاتی کہا تھا اور اسی کو آج کل [illegible] ابعد الطبیعاتی ادراک کہتا ہے۔ مرزا دبیر کے دور کے لوگ اس ادراک سے پوری طرح متاثر تھے۔ انھوں نے اسے "بلاغت" کا نام دیا تھا اور یہ رائے اب بھی اُس زمانے کا مذاق رکھنے والوں میں عام ہے کہ میر انیس کا کلام فصاحت ہے اور مرزا دبیر کا بلاغت ہے۔

مولانا شبلی کی اہم کوششوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ مرزا دبیر کے بابت اُن کے عصر کی اس اہم رائے کو رد کر دیں۔ وہ فرماتے ہیں: "انیس اور دبیر کے مقابلہ میں یہ فقرہ ضرب المثل ہو گیا ہے کہ میر صاحب کے کلام میں فصاحت زیادہ ہے اور مرزا صاحب کے کلام میں بلاغت، لیکن یہ فقرہ جس قدر زیادہ مشہور ہے اُسی قدر بلکہ اُس سے زیادہ غلط اور بے معنی ہے بلاغت کی جو تعریف تمام کتابوں میں مذکور ہے اور جس سے کسی کو کسی قسم کا اختلاف نہیں اس کی رو سے بلاغت کی پہلی شرط یہ ہے کہ کلام فصیح ہو۔ اس لئے فصاحت و بلاغت کو باہم حریف قرار دینا اجتماع النقیضین ہے۔"

مولانا شبلی عربی کے عالم ہیں اور فصاحت و بلاغت کو مجھ سے کہیں زیادہ سمجھتے ہیں۔ اُن کی یہ ثابت کرنے کی کوشش کہ مرزا دبیر کے یہاں فصاحت نہیں ہے تو بلاغت بھی نہیں ہے۔ قدیم تنقیدی یعنی اصطلاحوں کو مثالوں پر عائد کرنے کی مناسب مثال ہے مگر میں نے اس قدیم چکر میں پڑنے کے بجائے نفسیات کو تنقید کی بنیاد بنانا سیکھا ہے۔ یعنی میں دیکھتا ہوں کہ کسی شاعر کی تخیل کیسے کام کرتی ہے اور اس سے کیسی یعنی کس قسم کی گلکاریاں وجود میں آتی ہیں۔ مولانا شبلی جن مثالوں کو مرزا دبیر کے میر انیس سے مقابلے میں نقص واضح کرنے کے سلسلے میں پیش کرتے ہیں وہی میرے لئے مرزا دبیر کے مخصوص ادراک کی مثالیں ہیں۔ مثلاً میر انیس و دبیر کی بہت مشہور مثال یہ ہے کہ حضرت عمر کے نامہ لانے والے سے امام علیہ السلام نے جو کچھ فرمایا اُس کے بابت میر انیس کہتے ہیں:۔

یہ تو نہیں کہا کہ شہِ مشرقین ہوں
مولانا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

مولانا شبلی اسے موقع کی حالت سے مناسب بتاتے ہوئے کہتے ہیں "اس موقع پر یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اس واقعہ کو مرزا دبیر صاحب نے اس طرح باندھا ہے:

"فرمایا" میں حسین علیہ السلام ہوں"

میرانیس اور مرزا دبیر کے موازنے پر جو بحث ہے اُس کے فیصلے کے لئے دونوں کے صرف یہ دونوں مصرعے کافی ہیں۔ مجھے مولانا کی یہ مثال ناکافی ہی نہیں بلکہ کم فہمی اور طرفداری پر مبنی نظر آتی ہے۔ تاریخی حیثیت سے یہ نہیں معلوم کہ امام علیہ السلام نے کیا فرمایا تھا۔ دونوں شاعر اپنا قیاس لگا رہے ہیں میر انیس کے قصیدہ میں امام انکسارت کام لے رہے ہیں۔ مرزا دبیر کا تصور امام کی شان کی طرف ہے دونوں اپنے حساب حالت اور موقع کے مناسب بات رقم کر رہے ہیں۔ فرق یہ نہیں ہے کہ ایک کی بات نفسیات کے مطابق ہے اور دوسرے کی اُس کے خلاف ہے۔ فرق دونوں کے تخیل عمل کا ہے ورنہ دونوں بالکل مناسب بات ہی کہہ رہے ہیں۔ ہم کو یہ ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ مولانا سے اتفاق کریں۔ ہمارا دھیان مرزا دبیر کے معصروں کی طرف جاتا ہے جو بلاغت کی مولانا کی طرح بال کی کھال نکالنے سے معذور تھے مگر میرانیس اور مرزا دبیر کے کلام کے فرق کا حس ضرور مولانا سے زیادہ رکھتے تھے اور کیونکہ انھیں دونوں شاعروں سے ہمدردی تھی اس لئے ایک کو بڑھا کر دوسرے کو گھٹانے کا جواز نہیں ڈھونڈتے تھے۔ مرزا صاحب کے کلام کو بلاغت کہنا اور میر صاحب کے کلام کو فصاحت کہنا صحیح ہو یا غلط ہمیں اس سے سروکار نہیں ہے۔ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ دونوں کے کلام صاف مختلف ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ مخصوص اثر رکھتے ہیں جو بہر معنی میں شاعرانہ اور تخیلی ہے اس لئے ہم دونوں کو مختلف ادراک رکھنے والا مانتے ہیں اور دونوں کو آمنے سامنے کرنا سعی لاحاصل سمجھتے ہیں۔

شاعرانہ ادراک مواد کی تشکیل سے زیادہ طرزِ ادا کا کھیل ہے اور مرزا دبیر کا ادراک وہ مخصوص تصورات رکھتے ہیں سامنے لاتا ہے جو انہی صفت یا [illegible] میں بالکل اُن کی چیز ہیں یعنی اُن کی انفرادیت کا صاف صاف پتہ دیتے ہیں۔ مرثیوں میں تخیل کے لئے سب سے مناسب میدان گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں آتا ہے مولانا شبلی اس سلسلے میں فرماتے ہیں "مرثیہ گویوں کا سب سے بڑا موضوع شاعری یہی ہے اور مرزا دبیر تو اس عالم میں لامکان تک پہنچ جاتے ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ سب کچھ کہتے ہیں اور غور سے دیکھئے تو تلوار کے متعلق کچھ نہیں کہتے چنانچہ فرماتے ہیں:

ہر نگہ چشم نیام اوج پر آیا
اور صاف ہر اک فرد بشر کو نظر آیا
خط کھینچنے کو کلکِ ذاتِ ظفر آیا
یا دوڑ کے ظلمت کے گلی سے خضر آیا

ظلمات میں یہ فتح پہ قبضہ کئے پھری
یونس کو جیسے بطن میں ماہی لئے پھری

ذات ایک طرف مٹا دیا میں نے صفات کو
کیسی زبان، زبان میں یہ کاٹ آئی بات کو

اس قسم کی مثالوں کے بعد مولانا فرماتے ہیں: "انصاف کرو یہ تلوار کی تعریف ہے یا ہوائی طلسمات۔" ہوائی طلسمات؟ جی ہاں ہم مانتے ہیں کہ ہوائی طلسمات ہے مگر پوچھتے ہیں کہ اس میں کیا قباحت ہے؟ کیا شاعری کو حقیقت ہی ہونا چاہئے ہوائی طلسمات نہیں؟ شاعرانہ نفرت کا نفسیاتی مطالعہ یہ امر واضح کرتا ہے کہ قوت تخیل حقیقت اور مجاز کو ملا کر نئی ...

عورتیں ڈھالتی رہتی ہے اور یہ کہ عورتیں زور دار انفرادیت والے شاعروں کے بیان سے ایسی منفرد ہو جاتی ہیں۔ ان سے شاعر کو صاف صاف پہچانا جا سکتا ہے۔ یہی بات بڑے شاعر کو معمولی شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔ بڑے شاعر کے تصورات امیجز کا ایک الگ اور اچھوتا عالم ہوتا ہے جس کو کسی عام نظریہ سے پرکھنا غلط ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ Type of imagery کی بنا پر منفرد ادراک کے شاعروں کو قسموں میں بانٹ دیا جائے۔ دنیا کی شاعری میں زیادہ تر دو قسم کے ادراک نظر آتے ہیں۔ انگریزی شاعری کی مثال لے کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک قسم کے شاعر اسپنسر کی طرح ہوتے ہیں جن کے ادراک میں ایک خاص ڈھنگ، حقیقت سے خاص آہنگ اور فنی روایت سے خاص سمجھوتا ہوتا ہے۔ اُن کی شاعری مولانا حالی کے نظریہ نیچرل شاعری پر پوری اترتی ہے۔ دوسری قسم کے شاعر ڈن کی طرح کے ہوتے ہیں جن کے ادراک میں بے ڈھنگا پن، حقیقت سے دوری اور فنی روایت سے خاص بغاوت یہاں تک کہ بیان بدیع اور عروض کے مانے ہوئے اصولوں کو توڑنے کا رجحان ملتا ہے۔ اُردو کے شاعر بھی ان دو قسموں میں رکھے جا سکتے ہیں۔ میر، میر حسن اور میر انیس پہلی قسم میں ہیں جب کہ سودا اور مرزا دبیر دوسری قسم میں آتے ہیں۔ سودا نے اس ادراک کی داغ بیل ہی ڈالی ہے جو مرزا دبیر کے یہاں پورے طور پر بار آور ہوتا ہے ہوائی طلسمات بنانا یعنی Fantasy پر ٹیک لینا دور دراز کی تشبیہات اور استعارات لانا۔ باریک بینی اور مشکل پسندی میں گم ہو جانا۔ تلمیحات کو اپنی مرضی کے مطابق توڑنا اور مروڑنا ثقیل اور غریب الفاظ سے پرہیز نہ کرنا بلکہ اُن کو اپنے خاص مقصد کے ماتحت اپنے کلام میں جگہ دینا۔ الفاظ کو ان کے عام مضمون سے الگ لے جا کر استعمال کرنا، مصرعوں اور بندوں میں اس حد تک تصرف کرنا کہ کلام موزوں بھی نہ معلوم ہو، یہ سب باتیں جو پہلے قسم کے شاعروں کے نزدیک اغلاط ہیں دوسرے قسم کے شاعروں کے ادراک کا طرۂ امتیاز ہیں۔ مولانا شبلی نے ان سب باتوں کا ذکر کیا ہے اور مثالوں پر مثالیں دی ہیں مگر ستم یہ ہے کہ وہ روایت کے محض ایک رجحان پر پلے ہونے کی وجہ سے اور اس قسم کی روایت کے انگشت سے در آمد کو سب کچھ سمجھ کر ان باتوں کو اغلاط ہی گننے پر مصر ہیں اور ان پر خوب خوب منہ بناتے ہیں۔ مولانا شبلی کی تنقید بصیرت افروز نہیں ہے بلکہ ایک محدود نظریہ سے چمٹ کر اس سے چھڑائے نہ چھوٹنے کی مثال ہے۔

بیسویں صدی میں تنقید کو بڑی وسعت حاصل ہو گئی ہے اور منفرد شاعروں کے نفسیاتی مطالعہ نے اسے بڑی گہرائی اور گیرائی دے دی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جو شاعری انیسویں صدی میں شاعری کہی جاتی تھی وہ بھی ایک قسم کی شاعری ہے، جس کو وہ لوگ شاعری نہیں کہتے تھے وہ دوسرے قسم کی شاعری ہے۔ مرزا دبیر کی شاعری اپنی الگ اہمیت رکھتی ہے۔ یہ ایک مخصوص ادراک کا جسے ہم مابعد الطبیعاتی ادراک کہتے ہیں کمال ہے۔ اُن کے کلام میں اس کے شاہکار موجود ہیں وہ مرثیہ جس کا پہلا بند یہ ہے اس ادراک کے استقلال اور پختگی کی مثال ہے ؎

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
رستم کا جگر زیر کفن کانپ رہا ہے
خود عرش خداوند زمن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

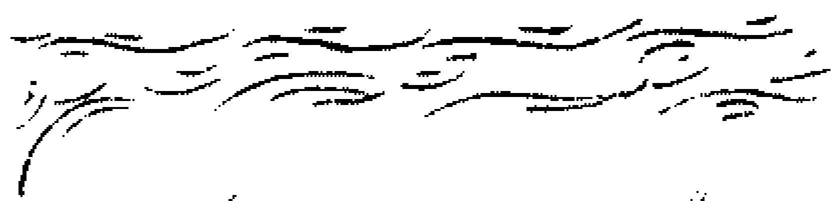
مولانا شبلی کے تتبع میں ہمارے ناقدین اب اس مرثیہ میں بھی قدم قدم پر نقائص نکالتے ہیں مگر یہ نہ صرف اُن کی نکتہ چینی سے بالاتر ہے بلکہ ہر محدود تنقیدی نظریہ

کو توڑتا ہوا اپنے مخصوص ادراک کا سکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جما دیتا ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی رائے ہے کہ اس صدی میں زندگی بڑی پیچیدہ، پہلو دار اور مبہم ہو گئی ہے اور اسے شاعری میں ادا کرنے کے لئے ایسے ادراک کی ضرورت ہے جو بیک وقت مختلف سطحیں رکھتا ہوا دران سب سطحوں کو ملا کر ایک متحد اثر قائم کرنے کا اہل ہو۔ جس مرثیہ کا میں نے اوپر ایک جدا اقتباس کیا ہے۔ وہ ہر طرح پر اس ادراک کا مظاہر کرتا ہے اس لئے اگر میں یہ کہوں کہ جدید دور کے شاعروں کے لئے جو شاعری کو اپنے دور کی سچی ترجمانی بنانا چاہتے ہیں مرزا دبیر کی شاعری اور اقسام کی شاعری سے زیادہ مشعل راہ ہو سکتی ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ آج کا شاعر اپنی روایت کے دوسرے شاعروں کو پس پشت ڈال کر مرزا دبیر ہی کا ہو رہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آج جو دشواریاں پیش آ رہی ہیں وہ مرزا دبیر کے مطالعہ سے حل ہو سکتی ہیں۔ جیسویں صدی مرزا دبیر کو ہم استاد منوانے کی طرف رجوع ہے مرزا دبیر اپنی شاعری کے بابت فرماتے ہیں:

خامہ سے فروتن مرا افراط ادب سے
جھک کر شرفا اور نجبا ملتے ہیں سب سے
نخوت کے معنی میں الگ لفظوں کے لب سے
جس طرح سے بد اصل جدا نیک نسب سے
دشمن سے بھی ہم قطع نہیں کرتے حیا کو
مانند غبار اٹھتے ہیں تعظیم ہوا کو

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ادراک میں ہر قسم کا تجربہ جذب کرنے کی گنجائش ہے۔ وہ انجانی کے ساتھ پستی سنجیدگی کے ساتھ طنز، علم کی صحت کے ساتھ توہم کا طلسم ترنم کے ساتھ بے رنگی ملا کر ایک فنکارانہ مرکب بنانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے اور اسی لئے جدید دور کا نمائندہ ادراک کہلانے کے قابل ہے۔ وہ ہر قسم کی لغزشوں کو بھی اوصاف میں تبدیل کر لیتا ہے۔ اور اسی طرح ایک نئے فن کا پیغامبر ہو جاتا ہے۔ آج مرزا دبیر کی صد سالہ برسی کے موقع پر ہمارا ان کو سب سے بڑا خراج عقیدت یہ ہوگا کہ ہم ان کے ادراک کی اہمیت کا اعتراف کر لیں۔ یہ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کریں کہ اول درجے کے شاعر کی طرح ان کا بھی ایک منفرد اور مخصوص ادراک ہے۔ دور دور ان کہ اس کی اشد ضرورت ہے اور تنقید کی شعوری کوشش یہ ہونا چاہئے کہ اپنا اہم ترین وقت مرزا دبیر کے مطالعہ کو دیں اور اس سے ہدایت حاصل کر کے اردو شاعری جو پستی میں گر گئی ہے اسے ایک نئی زندگی بخشیں۔

(انتخاب ... ماہ نو کراچی دبیر نمبر)



خار و گل و بوستان و صحرا دیکھے
نیرنگ شب و روز کے کیا کیا دیکھے
اب قبر حسین چل کے تو دیکھ دبیر
دنیا دیکھی اور اہل دنیا دیکھے

جو روضۂ شان کربلا تک پہنچا
معراج ہوئی عرش علیٰ تک پہنچا
کیا قرب ہے اللہ کا اللہ اللہ
پہنچا جو حسین تک خدا تک پہنچا

(مرزا دبیر)

مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی

نوادرِ مرزا دبیر

۱۹۵۲ء کی بات ہوگی۔ محرم کا مہینہ تھا۔ جھنگ کی ایک مجلس میں کسی صاحب نے میر صاحب کے مرثیہ کے چند بند پڑھے اور بار بار کہا۔ "مرزا صاحب فرماتے ہیں۔" بند تھا۔

"ح" سے ہے اشارہ کہ یہ ہے حامیٔ اُمّت
سمجھیں گے اسی "سین" کو سب سینِ سیادت
"ی" اُس کی بزرگی میں ہے "یٰسین" کی آیت
ہے "ن" سے ظاہر کہ یہ ہے نورِ نبوت
ناجی ہے وہ اس نام کو لے گا جو دہن سے
یہ حُسن میں دس حصے زیادہ ہے حسن سے

(منتخب مراثی انیس صفحہ ۳۸۔ مجلس ترقی ادب لاہور)

مرثیہ ہے: "یارب چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر"

میں نے اُن سے کہا کہ یہ بند میر انیس صاحب کے ہیں۔ مرزا دبیر کے نہیں۔ وہ بزرگ غالباً انیس و دبیر کے کلام میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔ بہرحال یہ بات واضح تھی کہ جھنگ میں مرزا دبیر کا کلام بھی مقبول رہا ہوگا اور مجالس میں پڑھا جاتا رہا ہوگا۔ بعد میں میں نے کئی آدمیوں سے پوچھا کہ صاحب یہ جھنگ میں مرزا صاحب کی شہرت و مقبولیت کا سبب کیا ہے؟ مگر کوئی جواب نہ ملا۔

ملتان گیا، وہاں بھی مرزا صاحب کا نام اور کلام زبان زدِ خاص و عام تھا۔ بلکہ ایک ملتانی مرثیہ گو کا لقب "دبیرِ پنجاب" سُن کر حیرت ہوئی مگر اس شہرت کا راز نہ کھل سکا۔ اتفاقاً ایک محترم دوست چودھری منظور حسین صاحب نے اپنے والدِ بزرگوار سے ملاقات کی دعوت دی۔ موصوف بزرگ و معمر مرثیہ گو شاعر ہیں۔ بات میں بات نکلتی آئی۔ میں نے پوچھا: "چودھری صاحب دبیر کا کلام تو لکھنؤ میں لوگ سمجھنے سے قاصر تھے، پنجاب میں اتنی سخت اُردو کیسے مقبول ہوئی اور دبیر کی شہرت کیسے پہنچی؟" فرمایا: "ریاست کپورتھلہ میں ایک قصبہ کا حال مجھے معلوم ہے، ہمارے تلونڈی چودھریاں میں نواب تاور بخش مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں کپورتھلے کے سفیر لاہور تھے جہاں وہ ارسطو جاہ سے ملے تھے۔ پھر ۱۸۵۷ء میں ریاست کی طرف سے لکھنؤ کے اطراف میں ایک فوج بھیجی گئی جس کے افسر سلطان علی خاں تھے۔ یہ صاحب انگریزوں کی فتح کے بعد جاگیر دار ہوگئے تھے۔ سلطان علی خاں لکھنؤ میں رہے اور مرزا صاحب کے خاص دوستوں میں شمار ہوئے۔ کہتے ہیں کہ مرزا صاحب نے ایک مرثیے میں اُن کی تعریف میں کچھ بند بھی لکھے تھے۔ سلطان علی خاں نے تلونڈی چودھریاں میں لکھنؤ کے طرز پر عزاخانہ بنوایا۔ اس امامباڑے کی مجلسوں میں مرزا دبیر کا کلام پڑھا جاتا تھا۔"

کچھ اسی طرح کی حکایات سید کسریٰ کے حضرات سے سُننے میں آئیں۔

بات یہ ہے کہ مرزا دبیر لکھنؤ کے مرثیہ گویوں میں آخری مرثیہ گو تھے جو دربار اودھ اور شہزادگان لکھنؤ میں محترم سمجھے جاتے تھے۔ میر ضمیر اور میر خلیق کے بعد اُن کا کوئی برابر کا حریف نہ تھا۔ لیکن تو لوگوں نے بہت کوشش کی کہ میاں دلگیر کا حریف بنائیں حتیٰ کہ بعض لوگوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ "دلگیر کے شاگرد ہیں" مگر مرزا صاحب نے بڑی بُردباری سے اس طوفان کو ٹال دیا۔ مرزا صاحب کی شاعری عربی، فارسی تراکیب اور معانی و بیان کے محاسن لفظی و معنوی سے آراستہ پیراستہ ہوتی تھی، یہ بات علماء کے ذوق کی تھی لہٰذا شہر کا دوسرا معزز طبقہ بھی ان کی استادی کا قائل اور قابلیت کا معترف تھا۔ اخلاق اور دین داری، سخاوت اور بردباری نے عوام کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ ادبی حلقوں میں ان کی نثر نگاری (دیکھیے میرا مضمون "ابواب المصائب مرزا دبیر کی نثری تخلیق" [illegible]) پر تکلف لب و لہجہ کا حامل تھا۔ وہ [illegible] کے حریف مانے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے جب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب میں ان کا نام داخل فہرست کیا۔ دہلی میں مرزا غالب اُن کا لوہا مانتے اور مرثیہ گوئی میں منفرد جانتے تھے۔

نواب محمد عباس علی خاں محمد نے قطعہ تاریخ "دفتر ماتم" میں دبیر کو ان لفظوں سے یاد کیا ہے، درحقیقت اس میں مبالغہ نہیں ہے۔

مرثیہ گو سے شہیدانِ جفا، زینت بزم
مدح خوان نبی و ذاکر آل امجاد
صاحب ورع و سخا، متقی و شب بیدار
مجمع خلق و کرم عابد و فیاض و جواد
رشک خاقانی و فردوسی و سعدی و کلیم
ہمسر بوذر و سلمان و اویس و مقداد

مرزا دبیر ایک دبستان کے بانی تھے، جس کا مقصد اردو زبان کو عربی فارسی لغات سے مالا مال کرنا تھا۔ وہ شعر و ادب میں ہندی زبان و تہذیب کی چھاپ کا سایہ پسند نہیں کرتے تھے۔ اسلامی ثقافت، ثقہ زبان اور علمی اسلوب کی اشاعت اُن کا نصب العین تھا۔ ہمارے عہد میں اس کی مثال ابوالکلام آزاد کی نثر ہے۔ ہم نے آزاد کی نثر کے شیفتہ و فریفتہ حضرات کو دیکھا ہے۔ اُن کے مقابلے میں وہ لوگ بھی دیکھے جو ابوالکلام آزاد کو انتہا پسند، مشکل نویس سمجھتے ہیں۔ علوم اسلامیہ کا ذوق رکھنے والے حضرات عربی فارسی سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے۔ ثقیل زبان کو علمی زبان سمجھتے۔ انگریزوں کی پسندیدہ فورٹ ولیم کالج والی نثر کو دوسرے درجے کی زبان۔ دبیر خاقانی و بدر چاچ، منشی مہدی اور ظہوری و نعمت خان عالی کے طرز کا احیا چاہتے تھے۔ اودھ کی حکومت کے سائے میں اس قسم [illegible] کے عوامل [illegible] ثقافتی عوامل نے [illegible] صاحب کو [illegible] اعزاز بخشا۔ اُن کی شہرت لکھنؤ سے دکن اور کشمیر، بنگال اور سندھ تک پہنچی اور اس وزن و آہنگ میں مدتوں وہ منفرد رہے۔ آخری پچیس تیس برس میں اُن کے حریف میر انیس نے سخت مقابلے کئے اور آہستہ آہستہ وہ بھی برابر کے اعزاز حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

مرزا صاحب کے سوانح اور فن پر میں لکھ چکا ہوں، اس مضمون میں صرف ان امور کا تذکرہ کرنا ہے، جن سے مرزا صاحب کی شخصیت اور فن کے بارے میں کچھ نئی روشنیاں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں "اودھ اخبار لکھنؤ" کی اشاعت ۱۰ مارچ ۱۸۷۵ء کی خبر ہے:

جناب دبیر کی وفات
ہیہات ہیہات ہیہات
"افسوس، افسوس، افسوس کہ قیامت آ گئی"

حیف خیف، صد ہزار حیف کہ اقلیم سخن لٹ گئی، آفتاب کمال غروب ہوگیا، مرثیہ گوئی کا خاتمہ بالخیر ہوا یعنی جناب افصح الفصحاء، ابلغ البلغاء، سحبان زماں، طوطی ہندوستان شاعر بےنظیر جناب مرزا دبیر نے وقت افزائی انیس ہر گز شمع سان اپنے جسم ناتواں کو گھلا دیا اور آخر چند روز سے آب دواشرہ کر امراض ورم کبد وغیرہ میں اس عندلیب معانی نے گلزار قدس کا رستہ لیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

اس واقعۂ حسرت ناک سے تمام لکھنؤ میں کہرام مچا ہے، ہر کہ دمہ کی جان پر وہ سخت صدمہ ہے کہ جس کا بیان اندوہ قلم سے رقم نہیں ہوسکتا۔ واضح ہو کہ سہ شنگی کی آخر شب یعنی ۲۹ محرم ۱۲۹۲ھ کو یہ حادثہ واقع ہوا۔"

پھر اس اخبار کی اشاعت ۱۸ مارچ ۱۸۷۵ء صفحہ ۳۵۱ پر ہے

لکھنؤ۔ مختصر سوانح عمری حضرت دبیر مغفور

"جناب مرزا سلامت علی صاحب متخلص بہ دبیر فن مرثیہ گوئی میں بے مثل اور لاجواب تھے۔ ہندوستان میں آفتاب تھے، سوا اس کے عابد شب زندہ دار تھے اور صائم روزگار تھے، پندرہ سولہ برس کا سن تھا کہ شوق مافوق سلام اور مرثیہ گوئی کا ہوا اور اصلاح سلام وغیرہ پر میاں دلگیر شاعر بے نظیر سے لی۔ بعد ازاں مرثیہ گوئی وغیرہ میں نام عالی پیدا کیا اور سب چھوٹے وہ سماتے تھے۔ سوا ان کے کسی کو دل لگا کر نہ سناتے تھے۔ رفتہ رفتہ ایسا نام پیدا کیا کہ سرکار میں پہنچے۔ نواب اصغر علی خاں جنت آشیاں، علیین مکاں، والد واجد نواب ممتاز الدولہ بہادر کے ملازم ہوئے اور یہی وجہ اور تمامت ہے کہ نواب ممتاز الدولہ بہادر آج تک مانتے اور اپنا ملازم قدیم جانتے تھے۔ بوجہ قدامت و مداحی جناب سید الشہداء علیہ الآف التحیات تعظیم فرماتے تھے اور اپنے برابر بٹھاتے تھے اور بھی سرکاروں میں اُن کی عظمت و رفعت ہونے لگی اور مہاراجا میوہ رام اور کنیہ بادشاہ شکوہ اُن کو بہت جانتے تھے اور بدل و جان مانتے تھے۔ بادشاہان رفیع المکان منیع الشان اودھ نے ان کی نہایت قدر دانی کی نصیر الدین حیدر بادشاہ سے تا حضرت واجد علی شاہ بادشاہ سب نے مہربانی کی۔ چنانچہ جب بارہ سو اکیانوے ہجری میں مرزا صاحب کلکتہ تشریف لے گئے، واجد علی شاہ بادشاہ کی خدمت میں عرضداشت بھیجی اور یہ شعر بادشاہ نے دستخط فرمایا:

گر بدہ سر دیہیم من بیانی
بہ تکلف نہم کہ کیمیا نی

جناب مرزا صاحب پہنچے جس مکان میں تھے اُس کے دوسرے درجے تک حضرت واجد علی شاہ آکے اور پیشوائی کر کے لے گئے اور اس قدر تعظیم و تکریم فرمائی جیسے کوئی برابر والے کی عزت اور توقیر کرتا ہے اور اپنے مرثیہ

میں شاہ اودھ نے بہت سے بند اُن کی تعریف اور توصیف میں پڑھے۔ چنانچہ یہ مصرعہ ارشادات حضرت سے ہے۔

ع: میں بچپنے سے عاشق نظم دبیر ہوں

اُس وقت مرزا صاحب مغفور نے کھڑے ہو کر یہ مصرعہ پڑھا کہ

تعظیم کلام کو دبیر اٹھا ہے

شاہ اودھ نے فرمایا آپ بیٹھ جاویں اور بعد خاطرداری بے شمار و عزت افزائی بسیار پانچ سو روپے بطور دعوت عطا فرمائے اور مثل سال گزشتہ امسال بھی عظیم آباد سے مرزا صاحب نے عرضی بھیج دی تھی۔ چنانچہ پانچ سو روپے جناب مرزا صاحب مغفور و مبرور کو عطا فرمائے۔

بہتر سال کا سن تھا، طاقت جواب دے چکی تھی، امسال عظیم آباد میں تشریف لے گئے اور وہیں تاریخ خاقانی وسامعین بہت جمع تھے۔ مرثیہ طولانی بہت زور شور سے پڑھا۔ اس وقت سے اختلاج قلب شروع ہوا۔ ریل پر اپنے گھر آئے، دس دن تک نہایت علیل رہے ۲۹ محرم کو کہ عاشق حسینؑ تھے اس دار فانی سے کوچ فرما کر رونق افزائے دار البقا ہوئے۔

گروہ مومنین و مسلمین خواص و عوام جنازہ کے ہمراہ تھا، گریہ و بکا سے سب کا حال تباہ تھا۔ جمعرات کو بتاریخ دوم صفر سوم ہوا۔ نواب ممتاز الدولہ بہادر نے شریک سوم ہو کر عزت افزائی فرمائی جناب مرزا اوج صاحب پسر مرزا صاحب نے قریب دس بارہ رباعیوں کے حسب حال اپنے اور وفات پدر بزرگوار پڑھیں جس کا سماعت کرنا اہل مجلس کو دشوار تھا اور ہر ایک بشر گریہ وزاری سے بے قرار تھا۔ کہرام پڑ گیا۔ عجائب مضامین عالی تھے گویا مرزا دبیر مرحوم پڑھ رہے تھے۔ تمام شہر کو اُن کی مرثیہ گوئی میں جو کہ شبہہ تھا دفع اور رفع ہو گیا۔ ہر شخص اُن کے پڑھنے کی تعریف کرنے والا اور مداح تھا اور ہر صغیر و کبیر کی زبان صدق بیان پر یہ کلمۂ حق جاری تھا کہ الولد سر لابیہ مرزا صاحب گویا ذکر کے ہر شخص رونے لگا۔ کہرام پڑ گیا۔ رنج کا حشر بپا ہوا۔ نواب ممتاز الدولہ بہادر نے مرزا محمد جعفر صاحب متخلص بہ اوج کو گلے لگا لیا اور کل طلب فرمایا ہے۔ یقین صادق ہے کہ خلعت عطا فرمائیں گے مگر مضامین رباعیات سے پایا جاتا ہے کہ یہ مرزا صاحب مغفور کا نام روشن کریں گے کہ اچھوں کے اچھے ہوتے ہیں اور جناب مرزا صاحب ر۔ کچھ فقط لکھنؤ میں نامور نہ تھے۔ حیدرآباد، عظیم آباد، سندھ بلکہ تمامی ہندوستان میں حتیٰ کہ کربلائے معلی تک مشہور تھے۔ اُن کے نام نامی کو گویا عالمگیر کہنا چاہیے۔ خاک اس گردش دوں پر کہ اس کی گردش سے ایسا کامل پردۂ خاک میں مل جائے مگر سوائے صبر کے کیا چارہ ہے۔ اب خدا سے یہی دعا ہے کہ خدا مرزا اوج کو سلامت رکھے کہ تسکین بخش دلہائے رنجور ہیں، یادگار جناب مرحوم و مغفور ہیں۔ آئندہ جو سنا جائے گا۔ لکھا

جائے گا۔" (تقریباً دو کالم)

۱۷/ مارچ کے شمارے میں یہ عبارت شائع کی گئی ہے :-

"مطبوعہ ۵ (کذا) مارچ میں مختصر سوانح عمری حضرت دبیر صاحب مغفور کے لکھے گئے تھے۔ اس میں ایک غلطی ہو گئی ہے کہ بجائے ضمیر کے مرزا صاحب کو شاگرد میاں دلگیر کا لکھا ہے اور کچھ حال اور باقی رہ گیا تھا وہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کو ایک بڑا توسل سرکار ملکہ زمانیہ اور نواب سلطان عالیہ دختر نواب ملکہ زمانیہ سے بھی تھا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے کا سلوک انھیں دونوں سرکاروں نے کیا تھا اور آج تک نواب ممتاز الدولہ بہادر سلوک فرماتے ہیں۔

جب مرزا صاحب کے انتقال کا وقت آیا، پانچ بجے صبح کو نماز صبح پڑھی اور حال ابتر ہونے لگا اس وقت میاں اوج نے کہ فرزند مرزا صاحب کے ہیں پوچھا کہ "مجھ کو کس کے سپرد کیا؟" فرمایا "تمھیں خدا کو سونپا" اور انتقال کیا انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ازبسکہ بروز سوم حال طبیعت داری میاں اوج صاحب کا بخوبی سب کو دریافت ہو گیا کہ اکثر رباعیات تصنیف فرما کر پڑھیں۔ اب وہ رباعیاں بھی واسطے ملاحظہ ناظرین سخن فہم کے درج اخبار کرتے ہیں :-

اس کے بعد مرزا اوج کی رباعیاں اور کچھ قطعات تاریخ ہیں۔ میں نے بہاولپور کی اسٹیٹ لائبریری سے مندرجہ بالا مضمون تو پورا نقل کر لیا تھا۔ رباعیات و قطعات کے نوٹ یہ ہیں۔

رباعی اوج

افسوس بلیغ نکتہ پرور نہ رہا
وہ قدر شناس اہل جوہر نہ رہا
روشن ہے کلام کی بقا سے اے اوج
آئینہ رہا مگر سکندر نہ رہا

اور سید ہدایت الشرفا کے قطعۂ تاریخ کا آخری شعر ہے :-

سال تاریخش چو جستم از فلک آمد ندا
سدرہ بے روح القدس بیفکند منبر بے دبیر

منشی محمد مرزا تپاں محمود کے قطعہ کا مصرعہ تاریخ ہے

"غم انیس میں ہے ہے زیادہ دبیر کا غم"
۱۲۹۲ھ ۱۲۹۱ھ

یوں اطلاع ملک کے تمام اخبارات نے اپنے طور پر خلاصہ کر کے لکھی اور ان خبروں کے حوالے سے "گارساں دتاسی" نے اپنے لکچر ۱۸۷۵ء میں کچھ تفصیل لکھی ہے جس سے یورپ کے علم دوست افراد کو اطلاع ہوئی۔ گارساں تاسی کہتے ہیں "دبیر کی شہرت ہندوستان سے نکل کر ایران و عراق تک پہنچ گئی تھی" اور یہ بات صحیح ہے مرزا صاحب کے مداح بیرون برصغیر میں پھیلے ہوئے تھے

دوسری خبر اودھ اخبار ۲۵/ اگست ۱۸۷۵ء کے حوالے سے مقالات میں یہ بھی ہے۔

"اس سانحے کے بعد اوج جب حیدرآباد دکن گئے تو سالار جنگ نے انھیں مالا مال کر دیا اور ایک منصب بھی پیش کیا لیکن اوج کو لکھنؤ چھوڑنا منظور نہ تھا۔"

(مقالات گارساں دتاسی طبع انجمن ترقی اردو ۱۹۴۳ء حصہ دوم ص ۲۰۱)

خط نمبر (۲) دبیر

اودھ اخبار ۹ر فروری ۱۸۷۵ء صفحہ ۱۸۹ مرزا صاحب کے ایک خط سے آراستہ ہے۔ یہ خط اُن کے مشہور مصرعہ تاریخ کی بحث سے متعلق ہے۔ خط فارسی میں ہے اور اُن کے آخری مکتوبات میں ہے۔

"رقعہ"

سال تاریخش بزبر و بینہ مرقوم شد

طور سینا بے کلیم اللہ ز منبر بے انیس

در مصرع تاریخ ارباب اشتغال کثیرہ فرصت ملاحظہ قواعد تاریخ و معمائی ندارند شاید بتکمیل اعداد کرفی الحقیقت کامل است گمان تنقیص می نمایند لہٰذا جہت رفع توہم اعداد حروف مرقوم می شود در زبر و بینات۔

طور سینا بے منبر کلیم اللہ زبے انیس

۸۶ ۹۰ ۵ ۳

آحاد عشرات مأت آحاد عشرات از بر

۴۰۴ ۴۰ ۴ ۵ ۳

در کتب فن تاریخ مستند مصنف را مختار ساختہ کہ اختیار است خواہ بلفظی زبر و بینہ بگیرد خواہ بلفظی فقط بینہ بگیرد۔ جواز است جواز است و قطعہ ثانیہ انشاءاللہ تیاری شود۔ قدم رنجہ فرمائید تا التماس ضروری بمعاینہ نمودہ شود۔

والسلام

داعی بقا مشتاق لقا دبیر عفی عنہ

اس خط کے بعد کالم آٹھ میں زبر و بینات کا حساب اور بحث ہے لیکن مضمون نگار کا نام نہیں ہے ممکن ہے مرزا اوج صاحب نے والد مرحوم کی ہدایت سے مضمون لکھا ہو۔ افسوس ہے میں جلدی کی وجہ سے وہ طویل عبارت نقل نہ کر سکا۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر نے اپنے رسالہ در ثبوت صحت تاریخ میں ایک جملہ لکھا جس سے شبہہ ہوتا ہے کہ شاید وہ مضمون ابتدائی طور پر سید بادشاہ علی بقا نے لکھا ہو۔ بقا صاحب مرزا دبیر کے خویش تھے اور اس بحث میں پیش پیش تھے۔ مہر لکھتے ہیں "دبیر نے جو تاریخ صاحب بیانِ سلیس و طبع نفیس جناب میر ببر علی صاحب انیس کے انتقال کی باقاعدہ زبر و بینہ کمال جدت کے ساتھ فرمائی اس کی سمجھ میں نابلدان کوچۂ تحقیق کو انتہائی پریشانی ہوئی کہ آخر جھگڑنے کی نوبت آئی تو سید بادشاہ علی صاحب متخلص بہ بقا ابن میر وزیر علی صاحب صبا اسکنہ اللہ فی الجنۃ اللہ ایادی فریق مرزائے مغفور خاص کو کیفیت واقعی نا واقفوں کے ذہنوں پر حالی کرنے کا طریقہ سوال و جواب کا ایجاد کیا اور افہام و تفہیم نکات و غوامض سے طبیعت مستر دین کو شاد کیا۔"

(رسالہ مذکورہ صـ۳)

دوسرا خط

مرزا دبیر کا ایک خط جناب نجم المرتضیٰ صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ یہ صوبت کے نواسہ جناب مولانا عنایت علی صاحب ساتانوی (المتوفی ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۷ء) بہت عالم و فقیہ تھے۔ پٹیالے سے لکھنؤ تک اُن کی شہرت تھی اور اکابر ملک سے روابط۔

اصل خط کی عبارت

ضیاء المشرقین، کہف الثقلین، فرزندہ چہرۂ دین مبین فرزندہ شمع شرع متین دام مجدکم۔

بعد سلام علیکم از اندامش چمن اسلام زا بتسام دراز ارتباش گلشن کلام نضارت انضمام است گزارش آنکہ نواز یدہ انامل تقدس شمائل را اگر حرز بازوی مفاخرت دانم بجا زیچون صحیفہ اورا سعادت خوانم بجا۔ طائران دل سرکن در دام عقیدت خدام زنجاے ارادت متزاوج زرق مدام، زلال اشتیاق درکام و بادہ تمنا در جام است۔ مگر در نیولا بسبب تردد عزم سفر و بتقدیم لوازم عیادت متعذر

و از خدمت سراپا برکت دور ماندم تا صبح سواری نجوم و اگر حیات مستعار باقی است بعد معاودت استفادہ صحبت سراسر افادت می کنم۔ شافی حقیقی صحت کامل و شفائے عاجل کرامت و طول حیات عنایت فرماید (آمین) والسلام

لفافے پر تحریر ہے۔

بعونہ وحدہٗ

بمنظر رفعت اثر عرش معراج پیغمبر فصاحت و طغرا ابد نور کلیم بلاغت و مجلس اصابح تقدس منابع ضیاء المشرقین کہف الثقلین و زائندہ جتر زین مبین فرزند شمع شرع متین جناب کرامت انتساب حضرت مرزی سید عنایت علی صاحب حسینی دام مجدہ فائز باد۔

داعی بقا مشتاق لقا

دبیر عفا عنہ

(۳)

پہلے سوانحی مضمون و فارسی کے خطوں کے بعد اپنے کتب خانے کے ان ستائیس مخطوط مرثیوں کا تذکرہ مناسب سمجھتا ہوں جو معاصر یا قریب العصر دبیر لکھے گئے ہیں۔ جن مرثیوں پر کاتب کے نام یا سنہ کتابت تحریر ہے۔ اُن کی تفصیل یہ ہے: -

۱۔ جب قرب ہوگا آمد روز نشور کا۔

ایک سو گیارہ بندوں کا یہ مرثیہ "۲۰ ربیع الثانی ۱۲۴۸ ہجری" کا مخطوط ہے اور بے حد قیمتی اور معلوماتی ہے۔

(الف) مرزا صاحب ۱۱ جمادی الاول ۱۲۱۸ھ میں پیدا ہوئے۔ اس مخطوطے کے وقت اُن کی عمر تیس سال تھی۔

(ب) مرثیے کے بند نمبر ۷۳ تا ۸۲ دس بند مرزا صاحب کے زیر قلم سے لکھے ہوئے ہیں (عکس تحریر پہلی مرتبہ شایع ہو رہا ہے)۔

(ج) اس مرثیے میں دو دو سراپے ہیں پہلا سراپا حضرت امام مہدی آخر الزمان کا ہے (بند ۱۶)

اُس دم کی کیا شکیہ و تجمل کروں بیاں
سرخ و سفید، رنگ رُخِ سیدِ زماں
مثلِ ستارہ خال رخِ راست پر عیاں
سن میں مثالِ خضر، مگر حسن میں جواں
پیدا یہ صاف ہوئے گا حسنِ جمال سے
کم سن و سال ہے ابھی چالیس سال سے

مابینِ ہر دو چشم رگِ ہاشمی بلند
مردم کریں گے دیدۂ مردم کو واں پسند
وقت نظارہ چشم تجلی سے بہرہ مند
وہ چشم وہ جمالِ خدا کو یہ تھا پسند
ہر لحظہ حق کو ذوق تھا اس رخ کی سیر کا
پنہاں اسی لئے تو رکھا چشمِ غیر سے

اور قد کی راستی الف راست سے سوا
نسبت پہ اس سے ہے الف راستی کو کیا
اس قدِ پاک سے جو مشابہ الف بنا
حق نے کیا حروفِ تہجی کا پیشوا
اس اک الف سے ارض بھی ہے اور سما بھی
دنیا کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی ہے

سر سراپا، نور تپلیوں پر لوگوں کی پتلیاں سپند، مابین ہر دو چشم رگِ ہاشمی بلند (بینی) دہانِ تنگ، موجود ہر نگاہ خلائق سے وہ نہاں، خط و پشت لب پاک جیسے تنگ متن پر حاشیہ گیسو دلیل شرح و لام۔

یعنی لائق دردِ شبیہ امام ہے
جس طرح سے نماز میں واجب سلام ہے

سینہ گہر راز خدا کا خزینہ، یہ ہاتھ وہ ہیں قبضے میں جن کے ہے کائنات۔

قرآن و دحی و شرعِ نبی، دینِ کبریا
یہ چار چیزیں ہوئیں گی چار آئینہ!
اور پشت شاہِ دیں پہ سپر ہوگی یوں وری

جیسے نبی کی پشت پہ مہر پیمبری

آٹھ بند سراپا کے اندر تین بند اسلحہ اور آراستگی کے ہیں۔

بند ۵ ۳ سے دوسرا سراپا شروع ہوتا ہے۔

یارو سنو اب آمد دجال رو سیاہ
سگ اُس کی شکلِ نحس سے مشتق خدا گواہ

ریش دراز جس میں شیاطین کی پناہ
بینا جو ایک چشم تو اک چشم کور وا

بے شبہ لام ظلم وہ گیسوئے پیچدار
عصیاں کا نون ابروئے دجالِ نابکار

اس قدر طولِ بیان کا سبب یہ ہے کہ مرثیہ پر بحث کرنے والے صاحبانِ نظر کا اتفاق ہے کہ "چہرہ" سب سے پہلے ضمیر نے لکھا۔ خود میں بھی اب تک یہی لکھتا اور سمجھتا رہا۔ ضمیر نے اپنے مرثیہ :-

"کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے"

میں کہتے ہیں۔

جس سال کئے وصف یہ ہمشکلِ نبیؐ کے
سن بارہ سو انچاس تھے ہجرِ نبوی کے
آگے تو یہ انداز سخن تھے نہ کسی کے
اب سب یہ مقلد ہوئے اس طرز نوی کے

دس میں کہوں سو میں کہوں یہ ورد ہے میرا
جو جو کہے اس طرز میں شاگرد ہے میرا

یعنی ۱۲۴۹ھ میں ضمیر نے پہل کی، مگر میرا محفوظ مرثیہ اُس کی تردید کرتا ہے۔ یہ مرثیہ ۱۲۴۸ھ کا مکتوبہ ہے اس لئے قطعاً مرزا صاحب نے سال چھ مہینے پہلے لکھا ہوگا۔ یعنی محرم ۱۲۴۸ ہجری سے کچھ پہلے یا محرم میں بہرحال ضمیر کی تاریخ سے ایک سال پہلے ایک مرثیہ میں ایک کے بجائے دو چہرے لکھے ہوئے موجود ہیں۔ اس بناء پر شاید یہ کہنے کا جواز موجود ہے کہ مرثیہ میں چہرہ کی ابتداء مرزا دبیر نے کی۔ یہ اندر بات ہے کہ میر ضمیر نے حضرت علی اکبرؑ کا سراپا لکھنے میں اولیت کا دعویٰ ہے۔

(۲) زنداں کی طرف بند تجمل سے رواں ہے
صحیح شدہ ۵۰ بند صفر ۱۲۵۷ ہجری میں محبوب علی نے لکھا۔

(۳) ہر سنگ بنا لعل وہ گوہر مہر علیؑ سے
۱۲۲ بند مخطوطہ جمادی الثانیہ ۱۲۷۰ ہجری

(۴) قدرت کے حوصلے کا تجمل حسینؑ ہے
۸۴ بند از قلم اکبر علی ۲۵ محرم ۱۲۷۳ ہجری

(۵) جب موسم جوانی اکبرؑ گزر گیا
۴۳ بند از قلم اشرف النساء ۱۲۸۲ ہجری۔

(۶) عصیاں کے عارضے سے جو دل ناتواں ہے
۵۰ بند از قلم اشرف النساء ۱۲۸۲ ہجری

(۷) آمد ہے شاہ بادشاہ فلک بارگاہ کی
۷۵ بند از قلم سرفراز علی ۱۳ ذی الحجہ ۱۲۹۲ ہجری

مطبوعہ نوادر میں دو چیزیں قابلِ توجہ و مطالعہ ہیں۔

(الف) شمس الضحیٰ۔ میر صفدر حسین کی مصنفہ فارسی کی کتاب جس میں میر صاحب نے دبیر کے فضائل، اُن کے خاندانی اعزاز و وقار پر گفتگو کی ہے۔ اس کا نام ہے "مناقب دبیرہ فضائل العارفین ملقب بہ شمس الضحیٰ"۔ صفحہ ۱۰۔

کتاب کے پانچ باب ہیں "صفت مداحی اہلبیت طاہرینؑ" ص۱ تا ص۶

"دوم شیمہ کریمہ ذکر مصائب حضرت سید الشہداء" ص ۷۰ تا ۱۰۸

"سوم فضیلت بکا بر مصائب آل عبا" ص ۱۰۸ تا ۱۱۷

لہ یہ سب قلمی مرثیے "جواہر دبیر" کے نام سے ادارہ اہلِ سخن لاہور شائع کر رہا ہے۔ جن کی ترتیب و تحقیق و تنقید میں وہی اصول پیش نظر رکھے ہیں جو "منتخب مراثی انیس" مجلس ترقی ادب لاہور میں ملحوظ رکھے تھے۔
(مرتضیٰ حسین فاضل)

"چہارم فرط جود و سخا و کثرت فیض و عطا" ص ۱۱۷ تا ص ۱۲۹

"پنجم اتصاف بفضائل معنوی و صوری و کمالات باطنی و ظاہری"

ص ۱۲۹ تا ۱۳۹

ہر باب کو "مقصد" کا عنوان دیا ہے اور خسر کلام میں اولاد و اجداد کا تذکرہ ہے جو ۱۴۰ سے ۱۵۱ تک چلا گیا ہے ص ۱۵۱ پر مصنف کتاب نے مرزا دبیر کی مدح میں پچپن شعروں کا قصیدہ لکھا ہے۔ صفحہ ۱۵۴ سے غلام حسین اوج پسر دبیر و اوج کے نام (۱) عفران مآب (۲) مختار خاں دہلوی (۳) علی مراد خاں قمر (۴) امجد علی شاہ (۵) محمد نور اللہ خاں دہلوی (۶) مرزا محمد پار دہلوی (۷) میر ضمیر (۸) مولانا سید نقی صاحب کے خطوط و رقعات ہیں صفحہ ۱۶۵ کی آخری سطر سے سوانح دبیر کا ایک ضمیمہ شروع ہوتا ہے جس کا آغاز ان فقروں سے ہے۔

"واضح باد کہ ہر گاہ جناب مرزا دبیر صاحب مغفور بحضرت قدح جیشم" الخ پھر علی نقی کا خط بنام دبیر اور متفرقات ہیں۔

یہ کتاب تحقیق و مواد کے اعتبار سے بہت اعلیٰ درجہ کی تصنیف و تالیف ہے۔ مصنف نے سو سے زیادہ کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ تفسیر، حدیث، تاریخ و تذکرہ شعرا کا بہت بڑا ذخیرہ مصنف کی دسترس میں ہے۔ فارسی اور ترتیب کتاب سے موصوف کی علمی و ادبی قابلیت پر روشنی پڑتی ہے۔

شمس الضحیٰ ان کامیاب کتابوں میں ہے جو کسی شاعر کی زندگی میں اس شاعر پر لکھی گئی ہوں۔ مصنف نے لکھا ہے کہ مرزا صاحب کی عمر پچاس سے اوپر ہوگی (صفحہ ۹۸) اس لئے ۱۲۹۰ھ کے حدود میں تالیف کا وقت متعین کیا جا سکتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ پورے دو سو صفحات کی کتاب میں مرزا کی تاریخ ولادت و واقعات حیات نہیں ملتے صرف یہ معلوم ہوا۔

(الف) بچپنے عرفان و علم سے شغف تھا، ریاضت کا شوق و تحصیل کمال کا ذوق تھا۔

(ب) ابتدا سن میں شاعری کا شعور تھا۔ غزل و ہزل و لغویات بلکہ قصائد مدح ملوک و سلاطین و حکام و امرا سے پرہیز کیا۔ گیارہ سال کی عمر سے مناقب و مصائب پر طبع آزمائی شروع کی اور میر مظفر حسین ضمیر سے تلمذ کیا۔ بارہ سال کی عمر میں دستگاہ فن حاصل کرلی۔ چودہ سال کی عمر میں بڑے مشہور شعرا کے ہم پلہ ہوگئے

(ج) مرزا صاحب کے کلام کا احاطہ مشکل ہے۔ کچھ شاگردوں کے پاس ہے کچھ ضائع ہوگیا۔ نظم و نثر، اردو فارسی و عربی ہزاروں کی تعداد میں اوج صاحب کے پاس ہے۔

(حاشیہ مصحح)

(د) مرزا صاحب کی محنت اور خدا ترسی و تقدس کا بیان۔

(ہ) شہرت کی گونج "در دیگر امصار و بلدان ملک وسیع الفضائے ہندوستان و قصبات و قریات تا انتہائے کلکتہ و بمبئی و سورت و لاہور و ملتان و دکن و سندھ و کابل و کشمیر و لندن بلکہ در مکہ معظمہ و مدینہ منورہ و جنۃ البقیع و در نجف اشرف و در کربلائے معلی و در رواق و روضۂ خیر الناس حضرت عباس و خیمہ گاہ و در کاظمین شریفین و سامرہ ... در خراسان ... و معصومۂ قم ... کہ اہل ہند مجالس تعزیت منعقد می سازند مراثی نظم نمودہ آں جناب خواندہ می شوند (۱۰۷)

خاندان و اجداد و اولاد کی تفصیل اچھی ہے۔ باقی تاریخ سوانح دبیر کے متعلق جو کچھ ہے وہ نہ ہونے کے برابر میرا نسخہ ناقص الطرفین ہے۔ اس کی اشاعت ۱۲۹۸ھ میں لکھنؤ کے مطبع اثنا عشری سے ہوئی اور کسی پڑھے لکھے شخص نے مرزا اوج صاحب کی مدد اور گھر کے دستاویزات کی روشنی میں مفید حاشیے لکھے۔

(ب) دفتر ماتم کی تلاش لکھنؤ سے لاہور تک جاری ہے۔ اتفاق ہے کہ اب تک اس کی بیس جلدیں یکجا دیکھنے میں نہیں آئیں۔ مرزا دبیر کی اہمیت و مقبولیت کے لئے "دفتر ماتم" ایک دلیل ہے۔ بیس جلدوں کا یہ کلیات مرثیہ، مثنوی، سلام، مخمس، قطعہ و رباعی جیسے اصناف کلام کا مجموعہ ہے جس میں بشمار ثابت لکھنؤی مرزا صاحب کے ۲۶۶ مرثیے چھپے ہیں۔ میرے پاس پہلی جلد کا پہلا مرثیہ ہے۔ اتفاق سے جلد کا صفحہ آخری ۴۵۸ محفوظ ہے۔ سرورق پر مرزا اوج مرحوم کی ایک مختصر تحریر اور مہر کتب خانہ ہے۔

"بعض کلام معجز نظام جناب والد علام طاب ثراہ سے جو منقسم ہے بیس جلدوں میں ہم نے اپنے کتب خانے سے دیا ہے اور صاحبان مطبع سلطانیہ سے تصحیح کا اقرار لیا ہے۔ باقی النقل کالاصل اس بات کا صادق آنا کاتبوں کے ہاتھ ہے" ـــ مہر

بائیں کنارے پر مالک مطبع سلطانیہ حسن مرزا صاحب کے دستخط ہیں۔ کہ "میر اعظم خان لکھنؤ کے مطبع سلطانیہ سے چھپی ہوئی اس جلد کا سنہ ۱۳۰۰ ہجری ہے۔ اس جلد کا پہلا مسدس جو حمد و نعت و منقبت کے بعد امجد علی شاہ اور سلطان العلماء و سید العلماء کے فضائل پر ہے بطور تمہید کے چھاپا گیا ہے۔ اس مسدس کا سنہ تخلیق ۱۲۶۰ھ اور منقول عنہ نسخہ "دوزدہم ماہ جمادی الآخری ۱۲۶۹ھ روز چہارشنبہ ہے۔

(اس نادر کتاب کے دو عکس پیش کئے جارہے ہیں)

دفتر ماتم سے پہلے نول کشور نے مرزا صاحب کے مرثیوں کی دو جلدیں چھاپی تھیں۔ جلد اول دسمبر ۱۸۷۵ء یعنی ذی الحجہ ۱۲۹۲ ہجری میں مرزا صاحب کی وفات کے گیارہ ماہ بعد چھپ گئی۔ منشی صاحب نے خاتمۃ الطبع میں لکھا۔

"زمانہ کو ہمیشہ اس بات کی حسرت رہی کہ میر انیس اور مرزا دبیر کا تمام کلام یکجا دیکھیں۔ طبع ہونا تو درکنار یہ بھی کسی کو نہ ملتا تھا۔ پس یہ آرزو بجز اس کے حاصل ہو سکتی اس واسطے کہ ہزاروں روپیہ کے صرف کرنے پر بھی ایسی امید کا بر آنا محال تھا۔ یہ دونوں شاعر بحر مرثیہ گوئی میں بے نظیر تھے ان کا ایک ایک مرثیہ گنجینۂ گوہر شاہوار تھا۔ لطف یہ ہے کہ باوصف اس بات کے یہ ہر دو شاعر ہمیشہ اپنے کلام کو پوشیدہ کرتے رہے۔ تاہم تمام جہان [illegible] دولت [illegible] پائی [illegible] اس زمانے میں [illegible] اور مرزا ثانی کو بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ [illegible] مرحومین کے [illegible] اس زمانے میں گزرے جن کا مثل نہ پیدا ہوا نہ ہوگا۔

مرزا دبیر کی فصاحت و بلاغت اور سخن سنجی کا بیان کرنا ایسا ہے جیسا کوئی سحبان وائل کا ذکر کرے اور پھر یہ کہ وہ کس کا شاگرد تھا اور کیا فصیح اللسان گزرا گویا ایک فعل عبث ہے مگر ان یادگار زمانہ کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ حضرت مرزا دبیر علاوہ مرثیہ گوئی زبان اردو کے علم و فضل میں بھی پایۂ عالی رکھتے تھے اور بہت بڑے مرتاض اور عابد و پرہیزگار تھے۔ مخیر ایسے بڑے کہ مدت عمر میں لاکھوں روپیہ پیدا کیا مگر روپیہ کو نجاست ریزہ سے بدتر سمجھا۔ ایسے شخص کو اگر اپنے وقت کا حاتم کہئے تو سزاوار تھا۔ اکثر اوقات جب کچھ روپیہ پاس نہ ہوتا تھا تو نقد کلام یا گھر کے برتن تک سائل کی نذر کرتے تھے۔

یہ ایک مشہور بات ہے کہ ایک سائل کو حضرت دبیر نے اپنا مرثیہ عطا کیا۔ وہ حیدرآباد دکن لے گیا اور وہاں ایک ہزار روپیہ کو بیچ دیا۔

خلاصہ یہ کہ کبھی سوال سائل کا رد نہ کرتے تھے ہمیشہ توکل پر گزران تھی۔ اکثر شاگرد آپ کے ازراہ دلسوزی کبھی کبھی گستاخ ہو کر اگر عرض بھی کرتے کہ آپ اولاد کا حق بھی رکھا کیجئے تو فرماتے کہ کبھی خدا مالک ہے۔ غرضیکہ ایک ہی مخیر و متوکل تھے۔

اس بزرگزیدہ شاعر نے ۷۲ برس کے سن میں بعارضہ اختلاج قلب و امراض کبد وغیرہ محرم الحرام کی ۲۹ تاریخ منگل کے دن وفات پائی تھی چونکہ کلام فصاحت نظام اس بلبل ہندوستان کا ایک زمانہ مشتاق تھا اس واسطے جناب مالک مطبع اودھ اخبار نے چاہا کہ جس طرح ہو سکے اس کو طبع کیجئے۔ جناب مرزا محمد جعفر صاحب اوج فرزند حضرت دبیر مرحوم سے استدعا کی۔ مرزا صاحب موصوف نے جس قدر مسودے تمام مرثیوں کے بہم پہنچے سب عنایت کئے۔ پھر کیا دریقی فی الفور مجموعہ مرثیہ مرزا دبیر طبع ہونا شروع ہوا۔

چونکہ یہ مرثیے مرزا اوج صاحب کے عنایت کئے ہوئے ہیں اس واسطے یقین ہے کہ صحیح اور بلا تصرف ہوں گے۔ اس میں کلام نہیں کہ مرزا اوج صاحب نے اس خصوص میں نہایت فیاض چشمی سے کام لیا اور حفظ وصیت کیا۔ کیونکہ کوئی کلام بدون طبع ہونے کے کامل طور پر محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس کلام معجز نظام کی کیا تعریف ہو سکے انصاف یہ ہے کہ اگر شاعری پیغمبری ہوتی اور اس کا اردو زبان کی فصاحت پر انحصار و دارومدار ہوتا تو مرزا دبیر ہی کا حق تھا۔ ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

بفضلہ اب یہ مجموعہ مطبع نول کشور مقام لکھنؤ ماہ دسمبر ۱۸۷۵ء میں چھپ کر شائع ہوا۔

مرزا دبیر کی شہرت و محبوبیت کا اثر ہے کہ منشی جی نے مرزا صاحب کا کلام اسی سال شائع کر دیا جس سال مرزا صاحب نے رحلت کی تھی اور میر انیس کا کلام گیارہ ماہ بعد نومبر ۱۸۷۶ء میں چھپا۔



شیخ وحید

مرزا دبیر کی کوئی مدحت کرے تو کیا
بے مثل تھے جہاں میں حقا وہ با خدا
ہر وقت انھیں عبادت خالق کا شوق تھا
شب زندہ دار اور سحر خیز دائما
بیداری میں جو تھا وہی عالم تھا خواب میں
ہر حال میں رجوع خدا کی جناب میں

سجدے کا شوق تھا سر اقدس کو بیکراں
پابند جا نماز قدم بھی تھے ہر زماں
دل سینہ میں تھا کعبۂ خلاق دو جہاں
اللہ اکبر ایسے نمازی ہوئے کہاں
پیدا جبیں سے سجدۂ خیر الانام تھی
وقدان نمازی اور زبان پیش امام تھی

اُٹھے، پڑھی نماز ہوا وقت صبح جب
قرآں پڑھا وظیفۂ معمول پڑھ کے سب
دن کو نماز روزہ تو شب کو نماز شب
ایسے کہاں ہوتے ہیں عبادت گزار اب
رہتے تھے صبح و شام اسی بند و بست میں
تسبیح خاک پاک کف حق پرست میں

ورد زبان یگانہ و بیگانہ کی ثنا
خوش خلق عزیز و دوست رضا مند آشنا
نیکی یہ تھی برا نہ کسی کو کبھی کہا
ایسا جہاں میں اللہ ہوا کوئی با خدا
اوصاف میں ولی تو یہ قدسی سیر میں تھے
کچھ شک نہیں ملک یہ لباس بشر میں تھے

دبیر اور شبلی

(پروفیسر گیان چند جین صاحب صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی ۔ الہ آباد)

خوشی کی بات ہے کہ آپ سرفراز کا دبیر نمبر نکال رہے ہیں۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں باک نہیں کہ میں نے نصابی ضروریات کے سوا دبیر کو بہت کم پڑھا ہے۔ میرے ایم اے کے نصاب میں مراثی دبیر کی ایک جلد تھی وہ پڑھی۔ اس کے علاوہ وہ چند مراثی نظر سے گزرے جو عام طور پر نصابی مجموعوں میں ہوتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ جس طرح انیس کے اچھے مرثیوں کا ایک اوسط حجم کا انتخاب روح انیس قارئین سے داد لیتا رہا ہے دبیر کا ایسا کوئی مجموعہ اہل نظر کے سامنے نہیں آیا جس کی وجہ سے دبیر بہت گھاٹے میں رہے۔

عام قارئین اور شائقین ادب کی چشم تصور میں مرزا دبیر کی تصویر قائم ہے وہ شبلی کے موازنۂ انیس و دبیر کی عطا کردہ ہے۔ شبلی جذباتی آدمی تھے اور کشتۂ جذبات انسان اچھا نقاد نہیں ہو سکتا، کم سے کم موازنے کی گوں کا تو ہوتا ہی نہیں۔ شبلی دبیر کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں۔

"۔۔ اس کے ساتھ الفاظ میں فصاحت، سلاست، روانی بندش میں چستی اور چستی کے ساتھ بے تکلفی دل آویزی اور برجستگی، لطیف اور نازک تشبیہات اور استعارات، اصول بلاغت کے مراعات، ان تمام اوصاف میں سے کون سی چیز مرزا دبیر میں پائی جاتی ہے؟ فصاحت ان کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی، بندش میں تعقید اور اغلاق، تشبیہات اور استعارات اکثر دور از کار بلاغت نام کو نہیں۔ کسی چیز یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں۔ خیال آفرینی اور مضمون آفرینی البتہ ہے لیکن اکثر جگہ اس کو سنبھال نہیں سکتے۔"

(موازنۂ انیس و دبیر ص ۵۲ ء۔ مکتبہ جامعہ ۱۹۔۔۔)

جو شخص اس قسم کی رائے دے میں تنقید کی میزان اس کے سپرد نہیں کر سکتا۔ مولانا نے خدا معلوم کس کس کے ناقص شعراء سقیم مصرعے دبیر کے سر منڈھ دیے اور ان کی گردن مارنے کے درپے ہو گئے۔ ضرورت ہے کہ روح انیس کی طرح دبیر کا ایک عمدہ انتخاب مرتب کر کے پیش کیا جائے تاکہ دبیر صحیح روشنی میں سامنے آ سکیں۔ اس انتخاب میں ایک بڑی دقت ہو گی۔ دبیر کا مخصوص رنگ خیال آفرینی اور معنی بندی کا ہے۔ شاید وہ خود انیس کے مقابلے میں اسی رنگ و آہنگ کو اپنی متاع فوق جانتے ہوں گے لیکن آج کا مذاق اسے پسند نہیں کرتا۔ آج سلیس و فصیح بولی کی زیادہ سا کھ ہے۔ دبیر کے یہاں اس رنگ کا فقدان نہیں ایک غیر مطبوعہ تحقیقی مقالے سے حضرت علی اصغر کے مرثیے کے تین جستہ جستہ بند ملاحظہ ہوں۔

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبط مصطفےٰ
لے تو چلا ہوں فوج عمر سے کہوں گا کیا
نے مانگنا ہی آتا ہے مجھ کو نہ التجا
منت بھی گر کروں گا تو کیا دیں گے وہ بھلا
پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
پیاسے کی جان جائے گی اور آبرو مری

پہنچے قریب ذبح تو گھبرا کے رہ گئے
چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے
چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

پھر ہونٹ بے زباں کے چومے جھکا کے سر
رو کر کہا، جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر
باقی رہے نہ بات کوئی اے مرے پسر
سوکھی زباں تم ہی دکھا دو نکال کر
پھیری زباں لبوں پہ جو اس نور عین نے
تھرا کے آسماں کو دیکھا حسینؑ نے

آپ نے دیکھا، یہ انیس کا کلام نہیں دبیر کا ہے، اس دبیر کا جس کے کلام کو بقول شبلی فصاحت چھو بھی نہیں بلاغت نام کو نہیں۔ میں غیر مسلم ہونے کے باوجود ان بند کو نقل کرتا ہوں تو ایک خاموش رقت طاری ہو جاتی ہے آخر صاحب اولاد ہوں۔

ضرورت ہے کہ دبیر کے نمائندہ انتخاب میں ا دو مرثیہ معنی بندی کا رکھ لیا جائے بقیہ بیش تر حصہ سلیس پر اثر کلام پر مشتمل ہو۔ دبیر کی نامقبولیت کی اصل ان کا کلام نہیں ایک علامہ کا جانب دارانہ فیصلہ جسے سہل انگاری کے سبب قبول کر لیا گیا ہے۔ قارئ دبیر کو چاہیے کہ صحیح انتخاب کے ذریعے دبیر ان کا جائز مقام دلائیں۔

(جناب ہنر لکھنوی)

(۱)

فرمانروائے کشور نظم و بیاں دبیر
صاحب لوائے لشکر نظم و بیاں دبیر
معنی کشائے دفتر نظم و بیاں دبیر
زینت فزائے افسر نظم و بیاں دبیر
کل تک تھی اس جناب سے ہندوستاں کی زیب
ہے آج روح پاک سے باغ جناں کی زیب

(۲)

غازہ نمائے صورت زیبائے شاعری
شیرازہ بند مصحف اجزائے شاعری
خلعت نواز قامت بالائے شاعری
نور تجلی ید بیضائے شاعری
افسوس کیا ہوا وہ سلیمان شاعری
ایمان و روح نظم و بیاں جان شاعری

(۳)

تھے فرد ہر کمال میں وہ آسماں جناب
جود و سخا و خلق و مروت میں انتخاب
تقویٰ و زہد و ورع عبادت میں لاجواب
ہر دم توکل اور قناعت میں لاجواب
مدحت طراز دل سے خدا کے ولی کے تھے
یہ کم ہے کیا شرف کہ ثناخوان علی کے تھے

(۴)

ذاکر بغیر مجلس ماتم ہے دردمند
منبر ہے یا کہ آہ لب عرش سے بلند
گریہ کناں ہیں سوگ نشینان حق پسند
دیدار کا ہے شوق ہر اک چشم کو دوچند
مشکل ہے صبر ہجر میں برنا و پیر کو
مجلس میں آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں دبیر کو

ضیاء الحسن موسوی

خصوصیات و اوّلیاتِ مرزا دبیر

اردو شاعری کی صنفِ مرثیہ کی مکمل اور نکھری ہوئی شکل ایک مثلث بناتی ہے۔ دبیرؔ، انیسؔ اور عشقؔ اور ان تینوں کا رُخ ضمیرؔ کی طرف ہے جنھوں نے اس صنف کو وہ جہت عطا کی جدھر گامزن ہو کے اردو مرثیہ ایک ایسی صنفِ شاعری قرار پایا جس کی نظیر عالمی ادب میں کہیں نہیں ملتی۔

کسی موضوع پر قلم اُٹھانے کے لیے شرفِ استحقاق بھی ہونا چاہیے اس لیے انتہائی خاکساری کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ مجھ کو ان تینوں اساطینِ مرثیہ نگاری سے نسبت کا شرف حاصل ہے۔ "میر انیس سے میرا اُنس" روزنامہ جنگ میں شائع شدہ میرے ایک مقالے کے ایک حصّہ سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ میر انیسؔ سے میرے بزرگوں کے کیا تعلقات تھے۔ اگرچہ میر انیسؔ نے اپنے خاندان سے باہر کسی کو شاگردی کا شرف نہیں عطا کیا مگر میرے خاندان کے ایک بزرگ میر اولاد حسین آہ کنتوری نے شاگردوں سے زیادہ اُن سے استفادہ کیا اور اُن کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ میر انیسؔ ہمیشہ اُن کو مخاطب اور متوجہ فرمایا کرتے تھے۔ ایک اور بزرگ میر ہادی علی کنتوری نے اپنی زندگی کلامِ انیس کی تحقیق میں صرف کی اور اُن سے علامہ نظم طباطبائی بھی صحتِ کلامِ انیسؔ میں مشورہ کرتے تھے۔

سلسلۂ جناب میر عشقؔ سے میرا تعلق یہ ہے کہ میرے ماموں مولانا حکیم سید ساجد حسین ساجد مدظلہٗ پیارے صاحب رشیدؔ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور میں نے اُن سے سالہا سال استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے جناب مؤدب لکھنوی مرحوم اور برادرِ مکرم جناب مہذب لکھنوی مدظلہٗ سے بھی استفادہ کیا ہے۔

رہ گیا سلسلۂ مرزا دبیرؔ تو اس سے میری وابستگی کے کئی پہلو ہیں۔ مرزا اوجؔ کے شاگرد اور یونس زیدپوری مرحوم کے منجھلے بھائی جناب متوسط حسین اکمل مرحوم میرے اتالیق تھے۔ جناب فراست زیدپوری کے شاگرد مولوی سید غلام عباس ناصر زیدپوری مرحوم شاعری اور فنونِ شاعری میں میرے استاد تھے۔ میرے خاندان کے ایک عظیم عالم و شاعر جناب مولوی سید ظفر مہدی اثیم موسوی جرولی مرزا دبیرؔ کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ علمِ شرحِ حدیث میں ان کی کتاب روضۃ الصادقین بڑی بلند پایہ کتاب ہے اس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور باقی پانچ قلمی کتب خانہ ناصریہ لکھنؤ میں محفوظ ہیں۔ اثیمؔ مرحوم نے "اشکِ مسلسل" کے نام سے ایک طویل مرثیہ نظم کرنا شروع کیا تھا جو آغازِ ازل تا آخر تاریخ کربلا ہے اس کے تین ہزار سات سو چالیس بند لکھنے کے بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اُن کے

فرزند اور مرزا اوج کے شاگرد جناب سید حیدر مہدی شمیم موسوی نے اُس کو مکمل کیا۔ یہ شاہکار ابھی تک غیر مطبوعہ ہے

جناب ظفر مہدی اثیم کی خاطر سے مرزا دبیر ہر سال ایک مجلس پڑھنے میرزا نیہال قصبۂ جرول ضلع بہرائچ تشریف لیجاتے تھے۔ اُن کے بعد یہ مجلس مرزا اوج پڑھتے رہے۔ اثیم مرحوم کی تاریخ وفات مرزا محمد طاہر رفیع مرحوم نے کہی تھی سے

از فضیلت سال رحلت شد عیاں
۱۳۱۲ھ

مرزا اوج نے ان کی ستائش میں یہ رباعی کہی تھی۔

تھی آپ کے دم سے رونق بزم سخن
تھا آپ پر اعتماد با نجزم سخن
کیوں کر نہ ہوا تبر اُمت نظم و بیاں
تھے آپ پیمبر اولوالعزم سخن

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو دبستان دبیر ذاکر حسین فاروقی)

مسلک دبیر کے مشہور سالک جناب سرفراز حسین خبیر مرحوم سے عزیزوں جیسے تعلقات تھے اُنھوں نے میری شادی کی تاریخ یہ کہی تھی۔

سُنا خبیر نے جب نام یہ مژدہ نکاح
لکھا یہ سال (ضیا الحسن بنا نوشا) (۱۳۷۰ھ)

لکھنؤ میں میری زندگی کے ابتدائی بیس سال نصیر منزل نخاس میں گزرے جو کہ حویلی مرزا دبیر سے بہت قریب ہے اور مجھے یہ شرف بھی حاصل ہے کہ مرزا محمد طاہر رفیع مرحوم نے مجھے اپنی گود میں کھلایا ہے اور آج تک ان کی گفتگو اور اُن کی مرثیہ خوانی کانوں میں گونجتی ہے اور تصویروں کی طرح نظروں میں پھرتی ہے۔ خاندان مرزا دبیر سے یہ ربط آج بھی باقی ہے چنانچہ برادرم ضمیر اختر صاحب نے مراثی دبیر مرزا دبیر کا جو اشاریہ مکمل اور مرتب کیا ہے[1] اور جو شجرہ اور نادر تصاویر راہ نور کے لیے مرزا محمد طاہر صاحب کی صاحبزادی مقیم کراچی نے عطا کی ہیں۔ اس میں اُن روابط کو بھی دخل ہے۔

مراثی دبیر کے اشاریہ میں (۲۶۶) مراثی کا تذکرہ ہے لیکن دفتر ماتم مختلف مطابع سے شائع ہوئی ہے مثلاً مطبع علوی لکھنؤ، مطبع شمس العلوم لکھنؤ، مطبع جعفری نخاس جدید لکھنؤ وغیرہ۔ جلد نہم

[1] یہ اشاریہ کسی کتابت کے باعث اشاریہ شامل اشاعت نہیں ہے۔

طبع اول میں ۲۷ مراثی ہیں جو اشاریے میں شامل ہیں مگر مطبع نوم میں ۴۴ مراثی ہیں۔ اس طرح کل ۲۸۲ مطبوعہ مراثی دفتر ماتم میں شامل ہیں۔ ان میں سے اگر ہم ضمیر کے (۲) اور دشیر کا (۱) مرثیہ جو شامل ہو گیا ہے خارج کر دیں تو ۲۸۰ مراثی رہ جاتے ہیں۔

مرزا محمد طاہر صاحب رفیع کے فرزند مرزا محمد صادق صاحب (مقیم لکھنؤ) کے پاس جو ذخیرۂ مراثی ہے وہ چھ صندوق میں ہے اور اہل خاندان کی روایت کے مطابق مرزا دبیر کے مراثی کی تعداد دو ہزار ہے نہ کہ تین ہزار جیسا آب حیات میں تذکرہ ہے آب حیات میں اور بھی بعض ایسے حقائق بیان کیے گئے ہیں جن کی تصحیح کے لیے مرزا دبیر کے بچپن کے دوست اور شاگرد میر محمد رضا ظہیر نے ایک مستقل رسالہ "تنقید آب حیات" کے نام سے لکھا ہے جس میں اسناد و شواہد پیش کر کے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ مرزا دبیر کا خاندان دہلی میں ایک ممتاز خاندان تھا اور آغا جان کاغذ فروش سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

مرزا دبیر اور میر ضمیر کی ناچاقی کی داستان جو آب حیات میں ہے اور جس کو بلا تحقیق دوسروں نے بھی نقل کر دیا ہے اس کی حقیقت بھی میر ظہیر نے تفصیل سے لکھی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

جنوری ۱۹۵۸ء میں جب میں بین الاقوامی اسلامی مذاکرہ کے سلسلے میں لاہور میں تھا تو ایک شام میں ڈاکٹر صفدر حسین سجاد رضوی اور سجاد باقر رضوی کے ساتھ عابد علی عابد مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ ایک یادگار شام تھی جو زیادہ تر مرزا دبیر مرحوم اور اُن کے مراثی کے تذکرے سے مخصوص رہی۔ اس میں میں نے عرض کیا تھا کہ شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر کسی بدنیتی سے نہیں لکھا تھا بلکہ وہ تقابلی تنقید کی ایسی سعی تھی جس کے نتیجہ میں ۱۴ انادی کتابیں لکھی گئیں۔ مگر اس ہنگامہ میں مثبت نقطۂ نظر گم ہو گیا اور اُن لوگوں کی بن آئی جو ادبی حمایت مخالفت کے سہارے اپنی ترویج کی سعی کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ میر انیس اور مرزا دبیر کو عربی کے شعراء

جریر و فرزدق کی طرح سمجھ لیا گیا جو ایک دوسرے کی زندگی بھر ہجو کیا کئے۔ حالانکہ معاملہ برعکس ہے۔ یہ دونوں عظیم شعرا ہمعصر ضرور تھے مگر وہ ایک دوسرے کا بے حد احترام کرتے تھے البتہ زوال آمادہ معاشرے کے لوگ جو زندگی کے ہر شعبے میں بٹیر بازی، مرغ بازی، پہلوانی کی ذہنیت رکھتے ہیں وہ بالعموم علم و ادب میں بھی یہی رویہ اختیار کرتے ہیں۔ پھر جاگیرداری نظام میں کچھ نسلی وابستگیاں ہو جاتی ہیں کسی ایک عالم اور مجتہد کے ماننے والے اُس کے بعد اُسی کی اولاد کو اپنا پیشوا مانتے ہیں خواہ وہ نااہل ہی کیوں نہ ہو اور دوسرے اہل علم و کمال سے استفادہ "روایت" کے خلاف سمجھتے ہیں۔"

میر انیس، مرزا دبیر کے کمال اور اُن کی شاعرانہ عظمت کا مثبت تذکرہ بنیادی امر ہے اور تقابل ثانوی چیز ہے۔ پھر اگر تقابل ہو تو اس میں اُس عہد کے دوسرے مرثیہ نگاروں اور پورے ماحول کا جائزہ شامل ہونا چاہیئے۔ اور یہ اُن کا کام ہے جو مرثیے کے مبادیات سے آگاہ ہوں جن میں فارسی اور عربی زبان کی آگاہی کے ساتھ فنون شعر و شاعری اور موضوع کے پس منظر کا مکمل علم ضروری ہے میر انیس کے پس منظر میں مثنوی میر حسن، رنگ تغزل، شاہ نامہ، حملۂ حیدری ملا باذل اور مسلمانان برصغیر کی سیاسی زندگی کی تبدیلیاں بھی آتی ہیں۔ مرزا دبیر نے عربی، فارسی اور اردو کے قدیم مراثی ملا ابی شیرازی کی مثنوی سحر حلال کے ساتھ دہلی پر مرہٹوں اور جاٹوں کے حملے اور برصغیر کے مسلمانوں کی پستی اور زوال کے زیر اثر اپنی مرثیہ گوئی کی عظیم عمارت خود بنائی ہے اور اس عمارت میں فقط اپنے اہل خاندان ہی کو جگہ نہیں دی ہے بلکہ اُس میں پورے برصغیر کے تشنگان استفادہ کو جگہ دی ہے جس کی جھلک "دربار حسین" میں بھی نظر آتی ہے۔

میر انیس اور مرزا دبیر دونوں اپنے کمال اور خداداد صلاحیتوں کی تعمیر ہیں۔ وہ سلاطین اور دربار کی سرپرستی سے بلند نہیں ہوئے ہیں۔ دونوں میں استغنا ہے، عزت نفس ہے اگر وہ بادشاہ کی ستائش کرتے ہیں تو اس لیئے کہ وہ تحریک آزادی اور اقتدار ملت کی علامت ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی جتا دیتے ہیں کہ اُن کا ممدوح فقط وہ ہستی ہے جو مرثیوں کا موضوع ہے۔

میر انیس اور مرزا دبیر دونوں کا مقصد ایک ہے۔ وہ المیۂ کربلا کے سوز و گداز سے دلوں کو موم بنا کے اور آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے بہا کے مجالس عزائے حسین کی تکمیل کرتے ہوئے اسلام اور اخلاق کے وہ نقش جمانا چاہتے ہیں جو مظلوم کو احساس کمتری میں مبتلا نہ ہونے دیں اور حریت و عزت نفس کے لیئے قربانی پر کمربستہ رکھیں اور اسلام سے وابستہ رکھیں۔ اگر فرق ہے تو اسالیب اور لہجوں کا ہے اس لیئے دونوں کا موازنہ کرنے سے پہلے دونوں کو اور اُن کی تخلیقات کو پڑھنا، سمجھنا اور دونوں میں جائزہ کرنا ضروری ہے۔

جب ہم کلام و مراثی مرزا دبیر کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم کو اُن کے اولیات و امتیازات کے عجیب و غریب مناظر نظر آتے ہیں۔

دبیر نے خطبات امام حسین علیہ السلام نظم کیئے ہیں۔
"لعل لب شبیر گہر بار ہے رن میں" یہ غیر منقوط مرثیہ ہے اور تمام صنائع و بدائع کا مجموعہ ہے)
دبیر نے فارسی شاعری کی برتری کے دور میں اُردو شاعری کو معیاری اور فارسی شاعری کا ہم پلہ بنا دیا۔
دبیر نے بارگاہ رسالت کی مدح و ستائش کے عنصر کا اضافہ کیا۔
دبیر نے زوال پذیر اُردو شاعری کی

تطہیر کی اور صحت بخش ادب کی تخلیق کی

دبیر نے سیاسی اسلامی اور اخلاقی شاعری کی جس کو مقدمۂ شعر و شاعری میں مولانا حالی نے اعلیٰ درجے کی اخلاقی شاعری کے نام سے یاد کیا ہے۔

دبیر نے مرثیے کی اثر انگیزی میں حیرت انگیز اضافہ کیا۔ سوز خوانی یا تحت لفظ خوانی میں منتخب چند بند پڑھے جاتے ہیں تو مستقل اور طویل مرثیے کا کمال حاصل ہوتا ہے۔

دبیر نے فضائل محمدؐ و آل محمدؐ نظم کرتے ہیں دوسرے مرثیہ نگاروں پر اپنے تفوق کا ثبوت دیا ہے۔

دبیر نے میر ضمیر کی منتخب کردہ چار بحور کے علاوہ چند مزید طویل اور مختصر بحور میں کامیاب مرثیہ نگاری کی۔

دبیر نے مرثیے کے حدود میں رہتے ہوئے اپنے عصر کے سیاسی حالات نظم کئے۔ انہوں نے فرزند مرزا اوج نے اس رنگ کو مزید استادی اور اصلاحی بنایا اور یہی رنگ بہ کو حالی اور اقبال کی نظموں تک لے جاتی ہے

دبیر نے قبل واقعۂ کربلا اور بعد واقعۂ کربلا کے اہم حالات پر بھی مرثیے کہے۔

دبیر نے مرثیے کا آغاز حمد و نعت و منقبت سے کیا۔

دبیر نے چہاردہ معصومین کے متعلق مستقل مراثی کہے

دبیر نے حضرت فاطمہ زہراؑ اور حضرت امّ البنین کی شادی نظم کی۔

دبیر نے حضرت عباسؑ اور حضرت علی اکبرؑ کی ولادت نظم کی۔

دبیر نے مراثی میں نعتیہ مسائل نظم کئے اور ایک مرثیہ قربانی کے احکام پر کہا۔

دبیر نے مراثی میں مہذب مناظرہ اور استدلال کا آغاز کیا اور مخالفت عزاداری کے ایک رسالہ کا استدلالی جواب نظم کیا۔

دبیر نے مسدس کے علاوہ مخمس کی شکل کے مرثیے بھی نظم کئے اور اپنے شاگردوں کے سلاموں کی تضمین بھی کی۔ مراثی کے علاوہ محافل کے لئے بشکل مثنوی "احسن القصص" احوال ولادت و فضائل چہاردہ معصومین نظم کئے۔

دبیر نے مرثیہ سے "سمعی بصری" فن پارے کا کام لیا اور اُن کو مصوری اور عکاسی اور صوت و آہنگ کا مجموعہ بنا دیا۔ دبیر کا کلام علم معانی و بدیع صنائع و بدائع کا بے مثال مجموعہ ہے۔

دبیر کا سلسلہ شاگردی پورے برصغیر میں پھیلا ہوا ہے اور بالواسطہ شاگردوں کو شامل کرکے یہ تعداد صدہا سے متجاوز ہے۔

یہ چند نکات ہیں جن میں سے ہر ایک مستقل مقالہ کا طالب ہے اور یہ ثبوت فراہم کرتا ہے کہ مرثیہ کا دوسرا نام دبیر ہے۔

مرزا دبیر نے حمد و نعت و منقبت میں چند وہ مرثیے ایسے کہے ہیں جن میں سے ایک ایک مرثیہ "دفتر ماتم" کی ایک جلد کا پہلا مرثیہ ہے۔

جلد اول: "طغرا نویس کن فیکون ذوالجلال ہے۔"

حمد و نعت رسول (۴۴) بند۔

جلد دوم: اے روزہ دار آہ دُبکا کے یہ روز ہیں
درحال حضرت علیؑ ۴۰ بند

جلد سوم: بلقیس پاسباں ہے یہ کس کی جناب ہے
درحال جناب فاطمہؑ ۱۰۱ بند

جلد چہارم: مجموعۂ صد واقعہ یہ ماہ صفر ہے
درحال امام حسنؑ ۷۰ بند

جلد پنجم: "یارب مجھے مرقع خلد بریں دکھا" درحال امام حسین۔ ۱۰۹ بند۔

جلد ششم: کربلا کا بھی کیا فیض عام ہے۔
درحال امام زین العابدین ۶۳ بند۔

جلد ہفتم: ہے قصد کچھ فضائلِ باقرؑ رقم کروں
درحال امام محمد باقرؑ ۳۲ بند

جلد ہشتم: جعفر صادقؑ کا رتبہ خلق میں مشہور ہے
درحال امام جعفر صادقؑ ۳۱ بند

جلد نہم: کیا موسیٰ کاظمؑ کے فضائل کا بیاں ہو۔
درحال امام موسیٰ کاظمؑ ۴۳ بند

جلد دہم: کیا شاہِ خراساں کی زیارت کا شرف ہے
درحال امام رضاؑ ۴۳ بند

جلد یازدہم: جب زہر سے شہید جناب رضا ہوئے
درحال امام محمد تقیؑ ۲۵ بند

جلد دوازدہم: شہیدِ ظلم و ستم ہیں سبط و صیائے علیؑ
درحال امام علی نقیؑ ۲۰ بند

جلد سیزدہم: شہرہ جہان میں حسن عسکریؑ کا ہے
درحال امام حسن عسکریؑ ۲۲ بند

جلد چہاردہم: جب قبل حشر ہو گا ظہورِ امام عصرؑ
درحال امام عصرؑ ۱۰۹ بند

ان مرثیوں کے متعلق جناب افضل حسین ثابت مرحوم لکھتے ہیں۔

"ان مرثیوں کی تصنیف کی نسبت مرزا اوج کہتے تھے کہ نواب نادر مرزا فیض آبادی (شاگرد آتش) نے مرزا دبیر کو فیض آباد میں زمانہ شاہی اودھ میں بلوایا تھا یہ بزرگوار خاندانِ اُمرائے پشت پدر کے ایک معزز فرد تھے (چودہ ہزار روپیے ماہوار وثیقہ پاتے تھے۔ خود بھی اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ غزل میں آتش کے اور مرثیہ میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے) اُنھوں نے مرزا دبیر سے فرمائش کی تھی کہ چودہ معصوموں کے حال میں کچھ مختصر مرثیے کہہ دیجئے کہ ہر معصوم کی ذات کے دن میں مجلس کیا کرتا ہوں۔ پڑھا کروں گا۔ مرزا دبیر جب فیض آباد سے چلے ہیں تو ان نادر مرزا کے چند نوکر ہمرکاب آئے تھے۔ مرزا دبیر پالکی میں آئے تھے۔ راستے میں یہ تمام مرثیے کہتے آئے تھے لکھنؤ آکر جب اُن کے ملازم رخصت ہونے تو دو تمام مرثیے مرزا دبیر نے اُن کے ہاتھ نواب نادر مرزا کو بھجوا دیئے۔ از بسکہ یہ مرثیے رواداری میں بہت جلد مختصر کہے تھے۔ مرزا دبیر کا ارادہ یہ تھا کہ ہر معصوم کے حال میں ایک ایک مرثیہ طولانی اور کہوں گا۔ پنجتن پاک کے حالات میں اس کے بعد چند مرثیے کہے تھے۔ باقی ائمۂ اطہار کے حالات میں پھر مرثیے کہنے کی نوبت نہیں آئی حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے حال میں ایک مرثیہ بہت بڑا کہا جو چند مرتبہ مرزا دبیر نے پڑھا اور شائع نہیں ہوا۔ اس مرثیہ کی یہ تشبیب بہت مشہور ہوئی:-

حضرت پہ انتہائے اسیری گزر گئی
زندان میں جوانی دبیری گزر گئی

(حیات دبیر جلد اول صفحہ ۲۶)

مرزا دبیر کے مطبوعہ مراثی کے اکثر مطلعے "جب" یا "جو" ایسے الفاظ سے شروع ہوتے ہیں مثلاً لفظ "جب" ایک سو سے زیادہ مراثی کے آغاز میں ہے مثلاً ؎

"جب فاطمہؑ سے عقدِ شہ لافتیٰ ہوا"

یا ؎ "صبح عاشور نے جب چاک گریبان کیا۔"

اسی طرح لفظ "جو" تیس سے زیادہ مراثی کے مطلعوں میں آیا ہے۔ مثلاً ؎

"اکبر نے طلب کی جو رضا شبِ دغا کی"

کیا عجب ہے کہ آغاز کا یہ اسلوب اُن کے گہرے مطالعۂ قرآن کا نتیجہ ہو جس میں بعض آیات اور سورتوں کا آغاز "اذا" کے لفظ سے ہوا ہے۔ اذا اور اذا کا ترجمہ "جب" ہوتا ہے۔ مطالعہ قرآن و حدیث نبوی کے گہرے اثرات مرزا دبیر کے اکثر مراثی میں نظر آتے ہیں جن کے مصرعوں میں آیات و احادیث کے ٹکڑے نظم کئے گئے ہیں۔ مثلاً

ع جب ختم کیا سورۃ اللیل تم نے
؎ اے صبح زنا کرنا تو اشمس ضحیٰ ہے
؎ اے مومنو یعقوب کے بارہ جو پسر تھے
؎ جب عرش "کن" سے زینتِ لوحِ بقا ہوئی
؎ شق کیا چاند کو انگشت سے پیغمبر نے
؎ طغرا نویس "کن فیکون" ذوالجلال ہے۔
؎ قرآں سے فضیلت دُرِ مرجان کی عیاں ہے
؎ ہے عقد کی تاکید احادیثِ نبیؐ میں
؎ ہوتا ہے عیاں مصحفِ ربِ دوسرا سے
؎ یا رب کریم وہ ہے جو وعدہ وفا کرے

(الکریم اذا وعد وفیٰ)

یہ تو صرف چند مطلعے ہیں۔ مرثیے کے چہروں اور

مختلف عناصر میں آیات و احادیث کے اشارے ظاہر کرتے ہیں کہ مرزا دبیر کی نظر فنونِ شاعری کے علاوہ قرآن و تفاسیر و احادیث پر بھی گہری تھی اور اُن کے کلام پر جا بجا ثقالت کا جو الزام لگایا جاتا ہے وہ اُن کے علم اور اُس ماحول کا نتیجہ بھی تھی جس میں مشکل پسندی کے علاوہ علمی اشارے اور قرآن و شگفت کے ٹکڑے نظم کرنا بہترین کا تقاضا سمجھا جاتا تھا۔ زیر آید درست جیسے محاورہ کو مرزا دبیر نے آنحضرت کے خاتم المرسلین ہونے کے سلسلے میں یوں استعمال کیا ہے :۔

بعد آئے ہیں پر سب سے نخست آئے ہیں مولا
زیر آئیں نہ کیوں کر کہ درست آئے ہیں مولا

اس عہد کے ماحول اور تقاضائے حال کے علاوہ جب مرزا دبیر سہلِ ممتنع کی منزل پر آتے ہیں تو یوں گہر افشاں ہوتے ہیں :۔

؎ کیوں عرشِ کبریا نہ گرا اس گناہ پر
تلوار بوسہ گاہِ رسالت پناہ پر
؎ واللہ کہ کچھ بھی نہ تھا اور تھا بھی تو کیا تھا
بس ایک خدا اور دوسرا محبوب خدا تھا
؎ رکھو نہ تمنائے بہشت اور کسی سے
جنت کا تعلق ہے حسین ابن علیؑ سے
؎ تم غم میں مرے نالہ و فریاد کروگے
اس سال ہمیں حج میں بہت یاد کروگے
؎ ننھی کلائیوں میں تشنج سے بل پڑے
ہچکی جو آئی منہ سے انگوٹھے نکل پڑے
؎ لو ملکِ امامت کی امیری بھی مبارک
زنداں بھی یتیمی بھی اسیری بھی مبارک
؎ خالق کے سوا دھیان کسی کا نہ رہا تھا
فرزندِ پیمبر ہمہ تن محوِ خدا تھا۔
؎ رُخ سے مسافروں کے عیاں حق کا نور تھا

نزدیک تھی بہشت وطن اُن سے دور تھا

گیارہ برس کی عمر میں مرزا دبیر کے والد مرزا غلام حسین اُن کو میر ضمیر (متوفی ۱۲۷۲ھ ۱۸۵۵ء) کے پاس لے گئے پہلی رباعی جو استاد کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کی اور اُستاد نے اُس میں کوئی تبدیلی نہ کی وہ یہ تھی ؎

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے
کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس پر شام و سحر
کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

دبیر کی غزل کا ایک شعر ہے ؎

چمن کی بے ثباتی پر جو اس کا دھیان جاتا ہے
تو کیا روتی ہے شبنم منھ پہ رکھ کے گل کے دامن کو

وعظ و نصیحت اور وہ بھی بادشاہوں کو بڑی ہمت و استقلال کا کام ہے۔ ایک مرتبہ امجد علی شاہ، شاہ اودھ کے سامنے مرزا دبیر نے روز قیامت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ؎

جب روز کبریا کی عدالت کا آئے گا
جبار بادشاہوں کو پہلے بلائے گا

اور پھر جب یہ بیت پڑھی ؎

گردن جھکائے گا ہر ایک محتاج کی طرح
قبروں سے شاہ نکلیں گے محتاج کی طرح

تو امجد علی شاہ کی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں اور اس مجلس کے بعد انھوں نے "رد مظالم" کا محکمہ قائم کیا تاکہ اُن کی انتظامیہ سے جو عوام متاثر ہوئے ہوں اور جن کی حق تلفی ہوئی ہو اس کی تلافی کی جائے۔

مرزا دبیر کی شاہان اودھ کے نزدیک کیا عظمت تھی یہ اس واقعے سے بھی معلوم ہوتی ہے جو تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ تیز ہوا سے منبر کا شامیانہ اُڑ گیا تو واجد علی شاہ نے منبر کے قریب کھڑے ہو کر خود چھتر لگایا اور آخر مجلس تک کھڑے رہے۔

جن لوگوں نے ادب مراثی کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اکثر بڑے مرثیہ نگار بعض ایسے مضامین کو جو دوسرے شعرا نے نظم کئے ہیں اُن سے بہتر انداز میں نظم کرنے کی سعی کرتے تھے اور ہم نے ایسے باذوق سامعین بھی دیکھے ہیں جو ایک ہی موضوع پر نظم کئے ہوئے متعدد اساتذہ کے صدہا اشعار سنا دیتے تھے اور اس ترتیب کے ساتھ کہ فلاں مرثیہ نگار نے یہ مضمون یوں باندھا ہے اور فلاں نے اس سے بہتر اور فلاں نے اس سے بھی بہتر شان کے طور پر میر انیس اور مرزا دبیر کے دو شعر ایک ہی موضوع پر ہیں جن میں ایک نے دوسرے سے بہتر طریقے سے ادائے مقصد کی سعی کی ہے۔

میر انیس فرماتے ہیں ؎

عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے
اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

اور مرزا دبیر فرماتے ہیں:

انصاف کہاں سے ہو کوئی دل صاف نہیں ہے
دل صاف کہاں سے ہو کہ انصاف نہیں ہے

ان دونوں اشعار کی اپنی اپنی خوبیاں اور محاسن ہیں جن کی تفصیل اساتذہ کی زبانی سنی تو اندازہ ہوا کہ فقط ان دو شعروں پر ایک رسالہ لکھا جا سکتا ہے اور بحث کی جائے تو کبھی ایک کا پلہ گراں نظر آئے گا کبھی دوسرے کا۔

"مرزا غالب نے ایسے ہی آثار عظمت
دیکھ کے کہا تھا اور کیا خوب کہا تھا کہ ہندوستان
میں انیس و دبیر جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے
نہ آئندہ ہوگا۔"

(یادگار غالب)

مختصر حالات زندگی کے بغیر یہ مضمون تشنہ رہ جاتا اس لئے ذیل میں مرزا دبیر کی زندگی کی جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔

مرزا دبیر ۱۱ جمادی الاول ۱۲۱۸ھ مطابق ۲۹ اگست ۱۸۰۳ء کو دہلی کے محلہ بلی ماران میں پیدا ہوئے۔ اُن کے مورث اعلیٰ ملا ہاشم شیرازی کے بھائی تھے جو اپنی مثنوی سحر حلال کی وجہ سے عظیم شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ شیراز سے یہ خاندان دہلی آیا اس کے اکثر افراد سلاطین مغلیہ کے درباروں سے متعلق رہے۔ ملا رفیع رضا جو مرزا دبیر کے پردادا تھے مغل دربار کے میر منشی تھے۔ جب دہلی اجڑنے لگی تو مرزا دبیر کے والد مرزا غلام حسین نے اہل خاندان کے ساتھ لکھنؤ کا رخ کیا۔ اُس وقت مرزا دبیر کی عمر تقریباً سات سال کی تھی۔ مرزا صاحب کی تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ شاعری کا رجحان دیکھ کے اُن کے والد نے ان کو میر ضمیر کی شاگردی میں دے دیا۔ مرزا دبیر کی تعلیم اُس عہد کے لحاظ سے بہت بلند تھی اور اردو فارسی اور عربی ادب کے علاوہ مذہبی عقلی اور نقلی علوم پر بھی ان کی دستگاہ تھی۔ علم کے علاوہ زہد و تقویٰ اور حسن اخلاق کے زیور سے بھی آراستہ تھے۔ کاشف الحقائق میں شمس العلماء مولانا امداد امام اثر نے اُن کی عظمت و فضیلت کے تذکرے میں لکھا ہے "رفتار گفتار کردار سب میں یکتائے روزگار تھے" مرزا دبیر کا عقد سیدانی کی نواسی سے ہوا تھا جس سے دو بیٹے مرزا محمد جعفر اوج اور مرزا ہادی حسین عطارد پیدا ہوئے۔ ایک صاحبزادی بھی تھیں جو میر زین العلی ضیا کے فرزند میر بادشاہ علی بقا سے منسوب تھیں۔ نوجوانی ہی میں مرثیہ نگاری میں اُن کو وہ شہرت نصیب ہوئی کہ شاہ اودھ غازی الدین حیدر نے ان کو شاہی امام باڑے میں مرثیہ پڑھنے کی دعوت دی۔ نصیر الدین حیدر کا زمانہ آیا تو اُن کی شہرت عروج پر تھی اور متعدد شہزادے اور شہزادیاں اُن کی شاگرد ہو چکی تھیں اور رجب علی بیگ سرور نے ضمیر، خلیق، فصیح، مسکین، گدا، سکندر کے ساتھ دبیر کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ (فسانۂ عجائب)

اس کے بعد محمد علی شاہ کا زمانہ آیا۔ مرثیہ گوئی کے آسمان پر ضمیر و دبیر ماہ و مشتری کی طرح چمکنے لگے۔ (یادگار انیس)

اسی عہد میں میر انیس فیض آباد سے لکھنؤ تشریف لے آئے اور ظاہر ہے کہ اُن کی کامیابی سے مرزا دبیر کو پہلے سے زیادہ جی لگا کر مرثیہ نگاری کرنا پڑی اور بڑے بڑے شعرا اسی عہد میں ان کے شاگرد ہوئے جن میں منیر، عظیم، قدیر، صغیر، شاد، دائم جیسے لوگ بھی شامل ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی کے سلسلہ میں جو فساد کی آگ بھڑکی اس نے مرزا دبیر کو لکھنؤ ترک کرکے سیتا پور میں پناہ لینے پر مجبور کیا اور جب وہ واپس آئے تو چمنستان لکھنؤ کی بہار خزاں سے بدل چکی تھی۔ معاشی پریشانیوں سے ہراساں ہو کے وہ کانپور گئے اور پھر امام باندی بیگم کی دعوت پر عظیم آباد جانے لگے اور انہی کے نذرانے پر گذر بسر ہونے لگی۔ آخر عمر میں آنکھیں مزید بیٹھ گئیں۔ تو معزول شاہ اودھ واجد علی شاہ نے مٹیا برج کلکتہ آنے کی دعوت دی اور ایک خصوصی معالج سے علاج کرایا جس سے بصارت عود کر آئی۔

جولائی ۱۸۷۳ء میں پہلے جوان بیٹے مرزا ہادی حسین عطارد کا داغ اٹھایا اور اپریل ۱۸۷۴ء میں بڑے بھائی مرزا نظیر کی وفات ہوئی۔ یہ ماہ صفر ۱۲۹۱ھ کا واقعہ ہے۔ اسی سال شوال کے مہینے میں میر انیس دنیا سے کوچ کر گئے اور بقول مرزا دبیر اُن کے دونوں بازو ٹوٹ گئے۔

تا در لیا علیمی و دنی دو بازویم شکست
بے نظیر اول شدم و اسالی دا آخر بے انیس

انیس و دبیر کی باہمی آویزش کی افسانہ طرازی کرنے والے کاش کبھی اس نظم دبیر کا یہ شعر بھی غور سے پڑھتے ؎

یادگار رفتگان ہستیم و مہمان جہان
چند روزہ چند ہفتہ بے برادر بے انیس

ان صدمات نے مرزا دبیر کو بیمار کر دیا۔ دو ماہ کے بعد محرم آ گیا عظیم آباد گئے۔ وہاں علالت میں اضافہ ہو گیا واپس آئے اور ۲۹ محرم ۱۲۹۲ھ ۶ مارچ ۱۸۷۵ء کو انتقال فرما گئے اور اپنے مکان مسکونہ میں دفن ہوئے جس کی تصویر اس شمارہ میں شامل ہیں۔

اس سلسلہ میں مرزا دبیر اور اُن کے استاد میر ضمیر میں ناچاقی کی جو روایت آب حیات میں شائع ہوئی ہے اور جس کو بلا تحقیق دو روایت بعض اور مولفین نے بھی درج کر دیا ہے اور اب تک بعض "مورخین ادب" اس کی نقل کرتے ہیں اُس کی نقاب کشائی ضروری ہے۔ یہ کہنا کہ مرزا دبیر کا ایک مرثیہ اُستاد کو پسند آ گیا تھا اور وہ اُسے اپنے نام سے پڑھنا چاہتے تھے مگر لوگوں کے بھڑکانے سے وہی مرثیہ جو مرزا دبیر اُستاد کی نذر کر چکے تھے۔ ایک مجلس میں اپنے استاد سے قبل پیش خوانی کرتے ہوئے مرزا دبیر نے پڑھ دیا اور اس پر استاد اور شاگرد کے تعلقات خراب ہو گئے۔ یہ درایت کے خلاف تو ہے ہی اگر صحیح روایت کے بھی خلاف ہے اور اُس میں جائے تعجب اس لئے نہیں کہ یہ تو شعرا کی باتیں ہیں۔ بزرگانِ دین کے متعلق مشہور اور مستند مسلمانوں کی کتب حدیث میں ایسی ایسی روایتیں آ گئی ہیں جن سے مستشرقین اور دشمنانِ اسلام نے اُن کی سیرت کا غلط نقشہ پیش کرنے میں ناجائز فائدہ اُٹھایا ہے۔ مرزا دبیر اور میر ضمیر کے شاگردی اور استادی کے تعلقات کی تاریخ نہیں بلکہ لکھنؤ اور مسلم ہندوستان کی تہذیب کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ روایت خلافِ عقل ہے۔ جس مرثیہ نگار نے دو ہزار مراثی کہے ہوں اگر اس کا ایک مرثیہ اُس کا شفیق اُستاد اُس سے مانگے اور وہ استاد کی نذر بھی کر دے اور پھر عہدہ خلافی، بد عہدی اور کم ظرفی کا ایسا مظاہرہ کرے کیا یہ قرینِ عقل ہے؟ پھر کم از کم میں تو یہ ماننے کو تیار نہیں کہ ضمیر جیسا کہنہ مشق اور صاحبِ کمال استاد جس نے مرزا دبیر اور میر انیس کو کمال کی راہ دکھائی ہو وہ اپنے شاگرد سے اُس کا مرثیہ اس لئے طلب کرے گا کہ اپنے نام سے پڑھے اور سالہا سال کی آزمائش کے بعد بھی شاگرد کی کم ظرفی سے آگاہ نہ ہو۔ اس سلسلہ میں درایت کا تقاضا پورا کیا جائے تو ضمیر کی مدح میں دبیر کی رباعی دونوں کی عمر کا فرق اور بہت سے حقائق پر گفتگو ضروری ہوگی اس لئے طوالت سے بچنے کے لئے مرزا دبیر کے دوست اور شاگرد میر محمد رضا ظہیر کے رسالہ "تنقید آب حیات" کی روایت کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور دوسرے مستند راویوں کے اقوال کا جائزہ لینا چاہیے۔

ظہیر مرزا دبیر کے بے تکلف دوست اور شاگرد تھے اور ان کے متعلق "بلبل ان دبیر" (ص ۱۸۶) میں لکھا ہے کہ "مشہور ہے کہ مرزا صاحب کا جو مرثیہ پسند آ جاتا ہے تکلف لے لیتے اور اپنا تخلص ڈال کے پڑھ دیا کرتے۔ مرزا صاحب بھی اُن سے انکار کرنا نہیں چاہتے تھے اس لئے کہ بچپن کے دوست بھی تھے اور شاگرد بھی۔"

غور طلب یہ بات بھی ہے کہ جو اپنے شاگرد کو ایک نہ متعدد مرثیے عطا کر دیا کرے کیا وہ اپنے اُستاد سے ایک مرثیے کے لئے رنجش اور بد عہدی کر سکتا ہے؟

اب ان روایات کی حقیقت یہ ہے کہ میر عابد علی بشیر جو لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور پہلے میر ضمیر کے شاگرد تھے پھر اُستاد کی ہدایت پر مرزا دبیر کو اپنا کلام دکھانے لگے انہی کی سازش سے استاد اور شاگرد میں وہ غلط فہمی پیدا ہوئی جس کو آب حیات کی روایت کہا جاتا ہے۔

مرزا دبیر کی تیرا فی یہ بھی ہے عزو ... شعر ... کے آسمان پر روشن سے روشن تر ستارہ بنتے جا رہے تھے جو کسی حاسد کو منظور نہ تھا ... چاہا کہ وہ اُستاد کی شفقت اور تربیت سے محروم ہو جائیں اور اُن کی اصلاح کے بغیر مرثیے پڑھیں تو ان کے مرثیے میں فرق پڑے۔ میر عابد علی بشیر اس سازش کے سرغنہ تھے اور موقع کی تاک میں تھے۔

۸ رمضان کی انیس، بیس اور اکیس تاریخ کو نواب

افتخار الدولہ بہادر کے ہاں دھوم دھام کی مجلسیں ہوتی تھیں۔ میر ضمیر اور مرزا دبیر پڑھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب صاحب نے ۱۹ اکتوبر کو یہ فرمائش کی کہ ۲۱ کو دونوں بزرگوار نئے مرثیے پڑھیں۔ مرزا دبیر کی زندگی اور شاعری دونوں کا شباب تھا۔ اُنھوں نے دو دن میں نیا مرثیہ کہہ لیا جس کا مطلع ہے سہ

ذرہ ہے آفتاب در بوتراب کا

اُستاد نے سُنا تو بہت داد دی مگر مرزا دبیر کو جب علم ہوا کہ استاد نے مرثیہ پورا نہیں کیا تو ادب سے عرض کیا کہ حضور یہ مرثیہ پڑھ دیں۔ میں صرف چند رباعیاں پڑھ دوں گا۔ میر ضمیر اس سعادت مندی سے خوش ہوئے مگر یہ پسند نہ کیا کہ شاگرد اپنی محنت کی داد سے محروم ہو جائے بڑے اصرار کے بعد میر ضمیر اس پر راضی ہوئے کہ فضائل کا حصہ مرزا دبیر پڑھیں اور مصائب کے بند میر ضمیر مجلس میں مرزا دبیر نے اعلان کیا کہ میں نے نیا مرثیہ نہیں کہا ہے حضرت استاد کے تصنیف مرثیے کا ابتدائی حصہ میں پڑھوں گا اور آخری حصہ وہ خود ارشاد فرمائیں گے۔ اس اعلان کے دوران میر عابد علی بشیر نے میر ضمیر سے کہا فضائل کا حصہ بہت پُر زور ہے اگر دبیر نے پڑھا تو مجلس انھی کے ہاتھ میں رہے گی۔ میں اُن کو منع کئے دیتا ہوں کہ مرثیہ نہ پڑھیں۔ میر ضمیر نے منع کیا مگر حضرت بشیر فوراً منبر کے پاس پہنچے اور مرزا دبیر کے کان میں کہا حضرت اُستاد فرماتے ہیں کہ تم یہ مرثیہ نہ پڑھو کوئی دوسرا مرثیہ پڑھ کے اُتر آؤ۔ مرزا دبیر کو اس بات کا یقین نہیں آیا۔ اُنھوں نے کہا اگر حضرت استاد خود مجھے اشارہ سے منع کریں تو میں منبر سے اُتر آؤں گا اس لئے کہ اس وقت میرے پاس کوئی اور مرثیہ نہیں ہے۔ بشیر پلٹ کر آئے اور میر ضمیر سے کہا دبیر کہتے ہیں کہ آج ہی تو مجھے اُستاد کا امتحان مقصود ہے دیکھوں میرے پڑھنے کے بعد وہ کیا کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ میر ضمیر یہ بات سُن کر آگ بگولا ہو گئے ادھر مرزا دبیر منبر پر بیٹھے اُستاد کے حکم کے منتظر تھے اُدھر اُستاد سر جھکائے بیٹھے تھے اور مرزا دبیر کے اشارہ کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد مرزا دبیر نے مرثیہ شروع کیا اور اعلان کے مطابق فضائل پڑھ کے اُتر آئے۔ اب میر ضمیر منبر پر گئے اور کہا کہ مرزا دبیر نے جو مرثیہ میرے نام سے پڑھا ہے وہ دراصل خود اُن کا ہے طبیعت برانگیختہ و افسردہ تھی کسی پُرانے مرثیے کے چند بند پڑھ کے منبر سے اُتر آئے۔ نواب افتخار الدولہ نے دونوں کے لئے خلعت منگوائے میر ضمیر طیش میں خلعت کی کشتی کو ٹھوکر مار کے اُٹھ گئے۔ مرزا دبیر نے بھی استاد کے احترام میں خلعت سے انکار کر دیا۔ شرپسندوں کو موقع ملا اور اُنھوں نے میر ضمیر کو بدظن کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی مرزا دبیر اُستاد کی خفگی پر حیران و پریشان تھے اور اس سارے کھیل سے لاعلم تھے۔ حقیقت حال معلوم کرنے کی غرض سے استاد کے گھر گئے۔ میر بشیر اور اُن کے ساتھیوں نے اس ڈر سے کہ سازش بے نقاب نہ ہو جائے مرزا دبیر پر لعن طعن شروع کر دی اور اُستاد سے گفتگو کی نوبت ہی نہیں آئی۔ مرزا دبیر واپس چلے آئے اور اُستاد کی خدمت میں حاضری کا سلسلہ بند کر دیا۔ شرپسند سمجھے کہ اس کے بعد دبیر کا ستارہ زوال کے برج میں آ جائے گا۔ مگر اس کے برعکس اُن کی مقبولیت بڑھتی گئی۔ اسی زمانے میں میر انیس لکھنؤ آئے اور سامعین نے اُن کے ادبی معرکوں سے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ چند سال بعد واجد علی شاہ کا عہد آیا اودھ کے وزیر اعظم حضور عالم نے جو مرزا دبیر کے شاگرد تھے ایک عظیم الشان مجلس کی۔ میر ضمیر بھی تشریف لائے مرزا دبیر نے اپنے مشہور مرثیہ سہ

اے عرش بریں تیرے ستاروں کے تصدق

کو شروع کیا اور ہر طرف سے تحسین و آفرین کی صدائیں بلند

ہونے لگیں۔ اچانک مرزا دبیر منبر پر کھڑے ہو گئے اور ہاتھ باندھ کے عرض کی: "یہ سب حضرت استاد کا صدقہ ہے"۔ اس پر استاد کا دل اتھوں بڑھ گیا۔ مرزا دبیر منبر سے اُترے تو میر ضمیر نے گلے سے لگا لیا اور اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ وہاں گفتگو میں سازش کا حال کھلا تو میر ضمیر نے میر عابد علی کو گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ مگر مرزا دبیر نے اُستاد سے کہہ سُن کے خطا معاف کرا دی اور خود بھی اُن کو گلے سے لگایا۔

اس کے بعد میر ضمیر نے کئی شاگردوں کے منجملہ میر عابد علی کو بھی مرزا دبیر سے اصلاح لینے کی ہدایت فرمائی۔ یہ صحیح روایت کو جو درایت پر بھی پوری اُترتی ہے "دبستانِ دبیر" میں بھی نقل کیا گیا ہے۔

مرزا دبیر اور اُن کے بیٹے اور پوتے یعنی مرزا اوج اور مرزا محمد طاہر رفیع نے مرثیہ گوئی اور شاعری کی اشاعت میں حصہ لیا اس کا اندازہ ان کے صدہا شاگردوں کی فہرست سے ہوتا ہے جن میں سے اکثر کے مراثی اور احوال کے لئے علیحدہ علیحدہ کتابیں درکار ہیں اور بعض کے متعلق اہلِ قلم نے کتابیں لکھی بھی ہیں۔

عفیر بلگرامی۔ شاد عظیم آبادی شیخ نقیر حسین عظیم منیر شکوہ آبادی سید ظفر مہدی گہر جرولی میر بادشاہ علی بقا قدیر دہلوی صفدر نجف آبادی سید باقر مہدی بلیغ زکی بلگرامی سید گوہر علی مشیر نواب محمد رضا خاں رضا دریاسی اختر لکھنوی شیخ امداد علی عشیر مونس حسین عندلیب زید پوری اور اُن کے باکمال فرزند یونس اکمل اور سخنور حسین دہلوی نواب سلطان بیگم سید اولاد حسین مداح پہرسری میر محمد رضا ظہیر نواب حیدر آبادی امام باندی بیگم عفت شہزادی زیب النساء حاجی تاج العلماء فراست زید پوری میر افضل حسین ثابت سید نظیر الحسن فوق نسیم جرولی مرزا محمد ہادی رسوا سید اعجاز حسین اعجاز سید سرفراز حسین خبیر غلام عباس خاں ناصر زید پوری نجم آفندی دریابادی طالب حسین طالب اور دوسرے نامور مکتب مرزا دبیر نے قدیم جدید انفرادی اصلاحی انقلابی ہر رنگ میں مرثیے کہے ہیں اور اردو شاعری کے فروغ میں جو حصہ لیا ہے جس کو اگر تفصیل سے کرنے کی شکل میں جمع کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اردو کسی شاعر کے آفتاب کمال نے اتنی کرنیں نہیں پھوڑی ہیں جتنی کہ جو مرزا دبیر کے ہاں ہیں۔ سارے دور تصور کو شاداب کر گئیں دبستانِ دبیر کے شعراء نے اتنے مختلف اسالیب اور رنگ پیش کئے ہیں۔ تاریخی روایات کی صحت کا خیال یعنی شاعری کو تاریخ سے ہم آہنگ رکھنے کی سعی، دعاؤں اور سورہ ہائے قرآنی کے مطالب سے مرثیوں کے چہرے کی تشکیل، فلسفیانہ مرثیے مرثیے کہنا مقامی رنگ، ملت کے عروج و زوال کے منظر کا اضافہ، اپنے عصر کے اہم اجتماعی حالات نظم کرنا غرض انہی تجربے اس مکتب مرثیہ نگاری کے وابستگان نے کئے ہیں جو شاید کسی اور صنفِ سخن میں ہوئے ہوں میرے اُستاد حضرت ناصر زید پوری مرحوم نے ۱۹۴۷ء سے قبل کے فسادات صوبۂ بہار کے پس منظر میں مسلمانوں کی تباہی کو ایک مرثیہ کا چہرہ قرار دیا تھا اور اس کا یہ مصرع اب تک کانوں میں گونجتا ہے ؎

چولھے ٹھنڈے ہیں مگر دل سے دھواں اُٹھتا ہے

وہ رنگ ہے جس کے موجد مرزا دبیر کے فرزند مرزا اوج ہیں۔ اس مقالے کا فطری اختتام مرزا اوج اور مرزا محمد طاہر رفیع کے تذکرہ کمال پر ہونا چاہیئے مگر ؎

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

اوج اور رفیع

مرزا دبیر کے فرزند مرزا محمد جعفر اوج جو سید انشاء کے

نواسے تھے۔ ۶ جمادی الاول ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۸۵۳ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور چھیاسٹھ سال کی عمر میں ۲۵ جمادی الثانیہ ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۸ اپریل ۱۹۱۷ء کو انتقال فرمایا اور اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے (معراج الکلام)

مرزا اوج فطری شاعر تھے اور والد کی توجہ نے اُن کی فطرت کے جوہر ایسے نکھارے کہ مرزا دبیر کے انتقال کے بعد بائیس سال کی عمر ہی میں مجتہد فن تسلیم کر لیا گیا۔ اودھ اخبار مورخہ ۱۴ اپریل ۱۸۷۵ء کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"۲۲ صفر کو مرزا دبیر کا چہلم ہوا۔ مجلس میں صدہا رئیس اور شہزادے اور امیر امرا جمع تھے۔ مرزا اوج نے رباعیاں تو تصنیف پڑھیں تمام محفل میں وجد کا عالم تھا۔ بعدہٗ تذکرہ تاریخ وفات پڑھا یہ معلوم ہوتا تھا کہ بعینہٖ مرزا صاحب پڑھ رہے ہیں اس کے بعد حضرت امام زین العابدین کے دربار میں تشریف لے جانے اور حاکم کے انصاف نہ کرنے کا حال پڑھا اس وقت گویا قیامت برپا ہوگئی آخر وہ مرثیہ نہ پڑھ سکے۔"

۲۰ اپریل ۱۸۷۵ء کے اودھ اخبار میں داروغہ میر واجد علی تسخیر کے گھر میں محفل میلاد کی خبر میں مرزا اوج کے مولود پڑھنے کا حال درج ہے جس کا پہلا بند یہ تھا۔

گردش ہے آج ساغر صہبائے نور کی
لہریں جھلک رہی ہیں شراب طہور کی
عنبر نشاں شمیم ہے گیسوئے حور کی
جھونکے نسیم کے ہیں کہ موجیں سرور کی
روشن زمیں ہے نور رسالتمآب سے
ذرے ملا رہے ہیں نظر آفتاب سے

اسی محفل میں میاں عشق اور جناب مونس بھی تشریف فرما تھے اور نہایت تعریف فرمائی اور بقول نامہ نگار ہر شخص کا قول تھا کہ اُن کے کلام میں دونوں رنگ ہیں۔ مرزا دبیر کا بھی اور میر انشاء اللہ خاں کا بھی۔ جس کا آغاز یہ تھا اُس سرو چمنستان مرثیہ گوئی کا عروج کیا ہوگا۔ اُس کے پورے اندازے کے لیے تذکروں کی ورق گردانی ضروری ہے۔ نوجوانی ہی میں یعنی ۱۲۹۲ھ میں مرزا اوج نے "مقیاس الاشعار" تحریر کی جو فن شاعری، عروض و قافیہ، تاریخ گوئی کی بلند معیار کتاب ہے اور بڑے سائز کے ۳۲۶ صفحات پر مشتمل ہے جس کے متعلق داغ دہلوی نے فرمایا کہ "آج علم عروض کا ماہر مرزا اوج سے بڑھ کر کوئی ہندوستان میں نہیں" (معراج الکلام)

مرزا اوج شاعری کے مجتہد تھے۔ اُنھوں نے مختلف نئے تجربے بھی کیے اور اُن کے مراثی میں انشا، دبیر اور انیس تینوں کے محاسن ملتے ہیں۔ روایتی علمی رنگ بھی، سہل ممتنع زبان بھی اور خیال آفرینی بھی۔ اُنھوں نے فلسفہ و معقولات کا عنصر بھی مرثیے میں اضافہ کیا اور قومی اور اصلاحی رنگ میں بھی مرثیے کہے۔ صحت روایات کی پابندی بھی کی اور فن و قواعد کے التزام پر بھی زور دیا اور مرثیہ شاعری کو بھی آگے بڑھایا۔ صاحب معراج الکلام نے مولانا شبلی نعمانی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "انصاف یہ ہے آج مرزا اوج سے بڑھ کر نہ کوئی شاعر ہے نہ مرثیہ گو" (ص ۱۴) صاحب موازنہ انیس و دبیر کا یہ قول اس لیے بھی اہم ہے کہ اوج نے شبلی سے یہ کہلوا لیا کہ اُنھوں نے صنعت مرثیہ نگاری اور شاعری میں وہ مقام حاصل کر لیا ہے جو ارتقائی ہے اور موازنہ سے بلند ہے اور مولانا شبلی نے اپنے ذوق پر ثابت کر دیا کہ وہ اعتراف کمال میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔

نواب شجاعت علی خاں کی دعوت پر مرزا اوج حیدرآباد دکن گئے اور ریزیڈنسی کے سامنے اُن کے قصر میں مجلسیں پڑھیں جس میں آصف سادس میر محبوب علی خاں نظام حیدرآباد بھی مسلسل سات دن تک شریک ہوئے اور اپنا سلام مرزا اوج کو دیا کہ وہ اصلاح دے کر پڑھیں اور اثنائے مجلس میں باآواز بلند کہا "مرزا صاحب

آپ واقعی یکتائے فن ہیں۔ میرے والد مرحوم سید نجم الحسن نجم میری ان مجلسوں میں شریک تھے اور فرماتے تھے کہ مجلس کے فرش پر جو خصوصی قالین میر محبوب علی خاں کے لیے بچھایا گیا تھا اُس کو انھوں نے چھڑی سے اُلٹ دیا اور چاندنی پر دیگر شرکاء کی طرح بیٹھے اُن کے اس احترام مجلس سے تمام شرکاء بہت متاثر ہوئے مرزا اوج اپنے شاگردوں سے محبت بھی کرتے تھے اور اُن کی تربیت سخن پر محنت بھی اس لیے اُن کے شاگردوں نے حیات دبیر، مرزا حسین اور المیزان جیسی گرانقدر تنقیدی کتابیں تصنیف کیں۔ خود مرزا اوج نے ۱۹۰۱ء میں "قواعد حامدیہ" کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا جو اردو رسم الخط کی اصلاح اور رسم املا سے متعلق تھا۔ انجمن ترقی اردو اور دیگر افراد نے اردو املا میں جو اصلاحیں کی ہیں اُن کا محرک یہی رسالہ تھا اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا اوج زبانوں کے تقابلی علم کے بھی ماہر تھے۔ اُن کے فلسفۂ الٰہیات کا ایک نمونہ ہے

بے کنایہ ہے مقصد یہ آپ ہی پیدا ۔ نہیں گر دو رہے خالق کی احتیاج اصلا
ہے اک وجود کی حاجت سو وہ ہے بے ہمتا ۔ کہاں ہے بابِ تصوّر کی عقل وا کچھ بھی
نہیں تھیوں کے قابل کہ عجز قدرت ہو
یہ ہے کمال کہ وحدت میں عین کثرت ہو

شبِ عاشور کی منظر کشی ہے

وہ رات تھی آغاز شہادت کا سرانجام ۔ برسوں کی تمنا دلِ عاشق ناکام
جنت کی خبر حوروں کے وصل کا پیغام ۔ دلخواہ دل افروز دلآویز دل آرام
گویا تھی وہ حد خاتمۂ صبر و رضا کی
اک رات وہ تھی عمر بہتر شہدا کی

فوج حسینی اور لشکر یزید کے تذکرے زبان کا تقابل ہے

یہ اوج انکسار وہ شان غرور ہے ۔ وہ میل سر ہے تو یہ آنکھوں کا نور ہے
وہ جان کا وبال یہ دل کا سرور ہے ۔ وہ غول شام کفر تو یہ شمع طور ہے
وہ شبہ کی دلیل یہ دعویٰ یقین کا
تشنہ وہ کفر کا تو یہ تمغہ ہے دین کا

اصلاحی رنگ قومی زبان کی اہمیت:-

پڑھو تم اپنی زبان میں کہ فن کی تسہیل ۔ مترجموں کی ہو محنت ذریعۂ تحصیل
تمہاری منزل مقصود کی یہی ہے سبیل ۔ ہر ایک قوم کے پہلے یہی ہوئے ہیں کفیل
زبان غیر کو پڑھ پڑھ کے وقت کھوتے ہو
یہ تم ترقیوں کے حق میں کانٹے بوتے ہو

غلط نظام تعلیم اور ملائیت پر نقد ہے

غرض ادبیات نفسیات سے بہرہ ور ہوتے ۔ کچھ اپنے دین و شریعت سے بہرہ ور ہوتے
فنون صنعت و تجارت سے بہرہ ور ہوتے ۔ اور اپنے خلق سے حکمت سے بہرہ ور ہوتے
مراحم اور مظالم کو یہ سمجھ لیتے
محاسن اور مکارم کو یہ سمجھ لیتے

شہرت پسند ذاکرین پر طنز ہے

ہیں ذاکرین کی مجلس کے رقعے بھی آیا ۔ لکھے ہیں آپ نے اپنے بڑے بڑے القاب
وحید عصر نہیں جن کا شش جہت میں جواب ۔ بلند مرتبہ کیواں شکوہ عرش جناب
پیمبروں میں تو اصلا نہ بیش و کم ہوتا
خدا یہ آپ کو لکھتے جو دسترس ہوتا

پست ہمت کی تباہ حالی کا مرثیہ:

وہ کم نصیب ہے سونے سے جو عزیز نہیں ۔ بڑے بڑوں سے ہے دعویٰ برابری کا ہمیں
نہ کچھ خیال عدو کی ترقیوں کا ہمیں ۔ نہ کچھ ملال ذرا اپنی بے بسی کا ہمیں
وہ بے خبر کہ کہیں ہم نیک و بد بھی نہیں
حسد بُرا ہے پہ ہم قابل حسد بھی نہیں

آج سے نصف صدی سے بھی زیادہ پہلے مرزا اوج کی یہ ترقی پسندی اور اصلاح طلبی مرثیے کو ہر زمانے سے ہم آہنگ کرنے کی رہنمائی ہے اور یہاں وہ حالی اور اقبال کے معنوی ہمعصر بھی معلوم ہوتے ہیں اور ہم عصر بھی۔

مرزا محمد طاہر رفیع

مرزا اوج کے فرزند اور مرزا دبیر کے پوتے تھے ۱۷ رمضان ۱۲۸۳ ہجری مطابق ۲۸ جنوری ۱۸۶۷ء کو پیدا ہوئے اور مرزا دبیر نے تاریخ کہی ہے

آرام جان مبارک باشد دبیر را

آخر عمر میں بڑے رنج اُٹھائے۔ جوان فرزند مرزا ذاکر حسین عزت اغن صاحب کی موت نے کمر توڑ دی اور ۱۳۶۷ھ ۱۹۴۸ء میں انتقال کیا۔ جناب سرفراز حسین خبیر نے تاریخ کہی۔ ع

بزم گردوں ہے مسیح در رحلِ منبر بے رفیع
۱۳۶۷ھ

سوداگر کے امام باڑے میں اُن کی سالانہ مجالس کی شان و شوکت کا میں عینی شاہد ہوں۔ مقررہ وقت پر میرے بابا شمس العلماء مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ تشریف لائے مجمع تعظیم کے لئے کھڑا ہو جاتا وہ تشریف فرما ہوتے اور مجلس شروع ہو جاتی اُن کی آواز گرفتہ تھی مگر معلوم ہوتا تھا کہ وہ منبر کے لئے اور منبر ان کے لئے ہے۔ رخصت امام حسینؑ کے وقت بارگاہِ حسینی کی ویرانی ہر مرثیہ گو نے نظم کی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرثیے میں مرزا محمد طاہر رفیع نے اربابِ ذوق اور مرثیہ شناس سامعین کو مخاطب کر کے اس مضمون کا ایک بند پڑھا جس کا آخری مصرعہ یہ تھا ؎

ڈیوڑھی پکارتی ہے کہ دربان کہاں گئے

تو یہ حال ہو گیا سامعین دیواروں سے سر ٹکرا رہے تھے ستائش سے بھرپور اثر انگیزی کا وہ منظر الفاظ میں سمونا ناممکن ہے۔ رفیع کو پانچ سال کی عمر میں مرزا دبیر سے بیعت خوانی کا شرف عطا کیا تھا۔ مرزا اوج کی تعلیم و تربیت نے اُن کو سلف کا مایۂ ناز خلف بنا دیا۔ عہدِ مرزا دبیر سے اردو شاعری کے جدید رجحانات تک انھوں نے شاعری اور مرثیہ گوئی میں آنے والی تبدیلیاں دیکھیں اور ظاہر ہے کہ انھوں نے اس کا اثر قبول کیا اور مرثیے کا روایتی قالب اور اسلوب کو برقرار رکھتے ہوئے مواد اور مضامین میں جدت اور ندرت پیدا کی۔ امام حسین علیہ السلام کی آخری جنگ کے سلسلے کا ایک [illegible]

[illegible]

یہ محبت کی ہیں باتیں یہ وفا کے انداز
پئے تسلیم جھکائے ہوئے ہے فرقِ نیاز
اپنے محبوب کی مرضی پہ ہے راضی جانباز
بھرتے ہیں خون میں دم عشق کا بھرنے والے
زندگی جانتے ہیں موت کو مرنے والے

انھوں نے بہار اور ساقی نامہ کو بھی اپنایا اور ثابت کر دیا کہ سلسلہ میر انیس و میر عشق تھے اس میدان سے بھی وہ کم نہیں۔

مرزا محمد طاہر رفیع نے وضعداری قائم رکھنے میں دربارِ رام پور کی ملازمت ترک کر دی۔ چونکہ نواب صاحب عشرہ محرم کی مجالس بھی ان سے پڑھوانا چاہتے تھے اور وہ اپنے والد اور دادا کی طرح عظیم آباد کی مجالس پڑھنے پر مصر تھے اور آخرکار انھوں نے مالی فوائد پر روایات اور وضعداری کو ترجیح دی اور زمانے کے ناملائم حالات اور پریشانیوں کے باوجود بڑی بے نیازی اور آن بان کی زندگی بسر کی اور یہ حقیقت ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد مرثیہ گوئی کے اسلوب کو برقرار رکھتے ہوئے جدید مراثی کی تخلیق میں مرزا محمد طاہر رفیع کے شاگردوں کا حصہ دوسرے سلسلوں کے شعراء سے کہیں زیادہ ہے۔ اس مقالہ کا اختتام مرزا محمد طاہر رفیع کے اس بند پر کرتا ہوں۔

تجھ سے اے یارِ خدا جان نہ یہ سر ہے عزیز
نہ تو اصغر ہے عزیز اور نہ اکبر ہے عزیز
نہ علم اور نہ علمدارِ لشکر ہے عزیز
تجھ سے کوئی نہیں شبیر کو بڑھ کر ہے عزیز
تیری سرکار میں سر نذر کو لاتا ہے حسین
تیرے دربار میں اب آپ ہی آتا ہے حسین



مرزا دبیر اور ان کے استاد میر ضمیر سے ملاقاتیں

عظیم آباد پٹنہ کے ایک ادیب نجات حسین خاں نے ۱۸۴۳ء میں لکھنؤ کے مذہبی مقامات کی زیارت اور مسلم الثبوت شعراء سے ملاقات کرنے کے لیے سفر کیا تھا۔ لکھنؤ میں اپنے قیام کے زمانہ کے واقعات انھوں نے ایک روز نامچہ کی شکل میں قلم بند کیے ہیں، اسی روز نامچہ کی بنیاد پر پروفیسر سید حسن صاحب نے ایک مبسوط مضمون قلم بند کیا جو قومی آواز لکھنؤ کی دو قسطوں میں شائع ہوا ہے۔

ہم ۲۲ راگست ۱۹۷۶ء سے مرزا دبیر اور میر ضمیر سے ان کی ملاقات کا حال درج کر رہے ہیں۔

(ایڈیٹر سرفراز)

مرزا دبیر کا مرثیہ سننے کے شوق میں نجات حسین خاں ۲۰ر مارچ ۱۹۴۳ء کو نواب مرزا صاحب کے ساتھ مولوی محمد مرزا صاحب کے امام باڑے میں حاضر ہوئے، لیکن ان کے پہونچنے کے قبل مرزا دبیر اپنا کلام سنا کر منبر سے نیچے اتر چکے تھے، یہ ایک عام مجلس تھی تقسیم شربت کے بعد نواب مرزا صاحب نے خاں صاحب کا مرزا دبیر سے تعارف کرایا، اس وقت مرزا دبیر منبر کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ خاں صاحب کا بیان ہے۔

"دبیر کا جثہ سخنی، قامت میانہ اور رنگ سبز مائل بہ سیاہی تھا۔ کاندھے پر سرخ رنگ کا ایک رومال رکھے ہوئے تھے۔"

نواب مرزا صاحب نے خاں صاحب کو دبیر سے ملاتے ہوئے کہا۔

"یہ زیارت تعزیہ وعزا داران و مرثیہ گویان و کملائے عصر و ممتازان دہر کی زیارت کو تشریف لائے ہیں۔"

یہ سن کر دبیر نے خاں صاحب کو نزدیک بلایا اور اپنی قربت سے مفتخر فرمایا۔ اس ملاقات میں کیا باتیں ہوئیں، روزنامچے میں کچھ مرقوم نہیں ہے۔

دوسری مرتبہ خاں صاحب خود مرزا دبیر کے مکان پر مجلس عزا میں شریک ہوئے۔ یہ ایک خاص مجلس تھی اور اس میں دبیر نے اپنا تازہ کلام سنایا۔

خاں صاحب کا بیان ہے کہ مرزا دبیر تا رہینے کی گیارہویں تاریخ کو اپنے گھر میں مجلس منعقد کرتے تھے اور اس میں نئے نئے مرثیے تحت اللفظ سنایا کرتے تھے اسی مجلس میں انھوں نے اپنے ایک شاگرد متخلص بہ ضمیر کا بھی مرثیہ خود پڑھ کر سنایا اور حاضرین نے خوب خوب داد دی، خاں صاحب کہتے ہیں۔

"اگر اس مرثیے میں محض قدرے قلیل اصلاح تھی تو ضمیر نے بہت اچھا مرثیہ لکھا تھا اور یقین ہے کہ استاد کے بعد نام روشن کرے گا بلکہ گمان ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں جس طرح دبیر نے اپنے استاد سے سبقت لے کر اپنے طور پر ناموری حاصل کی تھی اسی طرح ان کا شاگرد بھی استاد کی پیروی کرے گا۔"

پچیسویں ربیع الثانی ۱۲۵۹ھ ۲۶ رمئی ۱۸۴۳ء کو خاں صاحب پھر مرزا دبیر کی مرثیہ خوانی کی مجلس میں شریک ہوئے یہ مجلس امام باڑہ میر باقر میں منعقد ہوئی تھی۔ امام باڑے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

اس کی عمارت نہایت وسیع اور رنگا رنگ جھاڑ فانوس دیوار گیروں اور انواع تکلفات سے آراستہ تھی۔"

تقریباً دس بجے دن کے وقت مرزا دبیر منبر پر تشریف لائے اور ایک طولانی مرثیہ بکمال متانت و بلاغت شہدائے کربلا رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دردناک احوال میں پڑھا اس مرثیے میں انھوں نے تازہ واقعات کا بھی تذکرہ کیا تھا جو ماہ ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ میں کربلائے معلیٰ میں پیش آئے تھے۔ مجلس میں سامعین کی تعداد دو ہزار کے قریب تھی، سب پر گریہ کا عالم طاری تھا۔ خاں صاحب لکھتے ہیں:

"مرزا شاعرانہ طبیعت، طلاقت بیانی پر گوئی اور خوش خوانی میں اپنا جواب نہیں رکھتے"

میر انیس سے مرثیہ سننے کے لیے نجات حسین خاں ۲۳ ربیع الاول ۱۲۵۹ھ مطابق ۲۷ اپریل ۱۸۴۳ء کو حسن علی خاں کے تعزیے خانے پہنچ گئے یہ مقام ان کی جائے اقامت سے دور تھا۔ لیکن اشتیاق نے راستہ آسان کر دیا۔ مجلس میں مجمع کثیر تھا۔ پہلے ایک شخص نے منبر پر آکر حدیث و فضائل امام بیان کیے پھر انیس نے بکمال فصاحت و بلاغت و متانت اور غایت تکلفات شاعری سے آراستہ مرثیہ سنا کر حاضرین میں گریہ و بکا پیدا کیا، ہر چہار طرف سے واہ واہ اور سبحان اللہ کی آواز بلند ہوتی رہی۔ خاں صاحب لکھتے ہیں:

"انیس کے کلام کی خوبی میں کوئی شبہ نہیں خاندانی شاعر ہیں، آج کل دبیر کے سوا ان کا کوئی نظیر نہیں بلکہ خواص تو انھیں کو ترجیح دیتے ہیں۔"

ضمیر: میر ضمیر کا کلام سننے کا خاں صاحب کو زبردست اشتیاق تھا چنانچہ ۱۱ ربیع الاول ۱۲۵۹ھ، ۱۲ اپریل ۱۸۴۳ء کو وہ حاجی مولانا سید حسن رضا صاحب کے یہاں مجلس میں ضمیر کا کلام سننے کے لیے شریک ہوئے۔ یہ مجلس مرثیہ خوانی کی تھی۔ حاضرین کا اتنا ہجوم تھا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی بہت سے لوگ خیموں کی طنابیں پکڑے کھڑے تھے، مردوں کے علاوہ عورتیں بھی کلام سننے کو آئی تھیں اور ان کے لیے قنات باندھ کر الگ جگہ بنا لی گئی تھی۔

اس کے علاوہ آس پاس کے مکانوں کی چھتوں پر بھی بے شمار عورتیں موجود تھیں حاضرین کے لیے پان بھی لائے گئے لیکن بھیڑ کی وجہ سے انھیں ٹھیک سے تقسیم کرنا ممکن نہ تھا، لہٰذا بانٹنے والوں نے گلوریوں کو ہاتھ میں لے کر مجمع میں پھینکنا شروع کیا۔ کسی کو گلوری ملی کسی کو نہ ملی۔ خاں صاحب کو مجمع کے وسط میں جگہ ملی تھی جہاں ایک تخت بچھا ہوا تھا اور اس پر ایک کرسی بچھی ہوئی تھی چار بجے شام کے قریب مرزا دبیر کے استاد میر ضمیر تشریف لائے اور کرسی پر بیٹھے، پہلے انھوں نے چند ظریفانہ رباعیاں پڑھیں۔ اس کے بعد اپنا نو تصنیف مرثیہ پڑھنا شروع کیا، مجمع میں ہر طرف خندہ اور قہقہے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں چار گھنٹے تک یہی کیفیت رہی۔ پھر میر ضمیر نے پڑھنا ختم کیا اور اس کے ساتھ ہی مجلس بھی برخاست ہوئی۔

پانچ دن کے بعد یعنی ۱۶ ربیع الاول کو نجات حسین خاں میر ضمیر کی ملاقات کے لیے ان کے گھر گئے۔ میر ضمیر ان کے ساتھ اخلاق و محبت سے پیش آئے اور ان کے حالات دریافت کیے پھر "زبان ریختہ" میں انھوں نے جو سات بند تصنیف کیے ہیں ان میں سے چند خاں صاحب کو سنائے اور وعدہ کیا کہ جمعہ کے دن مع بیاض خاں صاحب کے یہاں آئیں گے اور مزید کلام سنائیں گے میر ضمیر سے دوبارہ ملاقات ہوئی یا نہیں اور انھوں نے حسب وعدہ انھیں اور کلام سنایا یا نہیں اس کے بارے میں خاں صاحب نے پھر کچھ نہیں لکھا۔ نجات حسین خاں نے مرثیے کے الفاظ نہیں لکھے ہیں۔

قابل: سید علی جان قابل، اصلاً عظیم آبادی ہیں لیکن ان کی شاعری کا بیشتر زمانہ لکھنؤ اور کانپور میں گزرا، نواب قدسیہ کے یہاں ملازم تھے نجات حسین خاں کی ان سے پہلی ملاقات ۲۸ صفر ۱۲۵۹ھ کو راستے میں ہو گئی جبکہ خاں صاحب مرزا دبیر کی مجلس مرثیہ خوانی سے واپس آ رہے تھے اس وقت دونوں میں مختصر گفتگو ہوئی لیکن ایک نے دوسرے کے مکان کا پتہ نشان پوچھ لیا چنانچہ ۱۵ ربیع الاول کو صبح کے وقت قابل خاں صاحب کے یہاں بغرض ملاقات آئے اور دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتے رہے انھوں نے بتایا کہ وہ ناسخ کے شاگرد رشید مرزا مہدی مقبول کے مکان واقع محلہ مفتی گنج میں رہتے ہیں۔

شرف ازل سے جو ازدواج مرتضیٰ کو ملا

ذیل کا مرثیہ مرزا دبیر کے مراثی کی جلد نہم میں ۷۷ بند پر مشتمل ہے اور اسی جلد میں ایک دوسرے مطلع سے یہی مرثیہ ۷۵ بند کا ہے جبکہ اس مخطوطے میں جو ہمارے زیدپور میں موجود ہے یہ مرثیہ ۱۱۴ بند کا ہے۔ اس مرثیہ کا مطلع اول "شرف ازل سے جو ازدواج مرتضیٰ کو ملا" اور دوسرا ثانی مطلع "محرمان شکست دل رسول خدا" ہے مرزا دبیر پر تحقیق و تنقید کرنے والوں اور اصحاب شغف مرثیہ کا ذوق رکھنے والوں کو اس مرثیہ سے ایک شاہراہ مل سکتی ہے۔ (سید دلشاد حسین زیدپوری)

(جگہ کی تنگی کی وجہ سے ۱۰۱ بندوں میں سے بعض بندوں کو حذف کرنا پڑا ——— ایڈیٹر)

شرف ازل سے جو ازواج مرتضیٰ کو ملا　　کہاں وہ مرتبہ ناموس اوصیا کو ملا
جو کچھ شرف تھا وہ سب اشرف النسا کو ملا　　نہ ہاجرہ کو یہ رتبہ نہ آسیا کو ملا
مگر یہ درجہ بھی حصہ میں کس کے آیا ہے
جو بعد فاطمہؑ ام البنینؑ نے پایا ہے

نہ کیوں بتول کی ہو ہمنشیں یہ عرش وقار　　وہ ماں حسینؑ کی یہ مادرِ علم بردار
کیا حسینؑ کو امت پہ فاطمہؑ نے نثار　　حسینؑ پر کیے قربان اس نے بیٹے چار
امام فاطمہؑ کے نورِ عین کو سمجھی
پسر حسینؑ کو آقا حسینؑ کو سمجھی

دمِ فنا جو علیؑ نے اسے یہ دی تھی خبر　　کہ ہوں گے فدیۂ شبیرؑ تیرے چار پسر
وہ اپنے بیٹوں کی تعظیم کرتی تھی اٹھ کر　　پسر جو پاؤں چھوتے تو کہتی تھی میں فدا تم پر
نہ کیوں میں فخر کروں فخرِ والدین ہو تم
غلام فاطمہؑ ہو فدیۂ حسینؑ ہو تم

رہے مدینہ میں جب تک امامِ ہر دوسرا　　مثالِ فاطمہؑ ام البنینؑ تھی شیدا
گیا جو کوفہ کو فرزندِ فاطمہ زہرا　　رہی یہ شام و سحر صرفِ خدمتِ صغرا
بنا کے ہاتھ سے اپنے اسے دوا دیتی
دوا پلا کے شفا کی اسے دعا دیتی

شبیہ فاطمہ تھی جو حسینؑ کی دختر　　یہ بوسہ اس کے کفِ پا کا لیتی تھی اکثر
بخار سے کفِ پا گرم دیکھتی تھی اگر　　تو اشکِ گرم سے پاشویہ کرتی تھی رو کر

جو شب کو فاطمہ بیمار سویا کرتی تھی
تو مثل شمع پہ بالیں پہ رویا کرتی تھی

مگر وہ پوچھتی تھی ایک ایک سے ہر چند — نہ ملتی تھی خبر بادشاہ پست و بلند
گیا تھا لشکر کوفہ نے بسکہ ظلم پسند — یہاں تو راہ تھی بند اور واں تھا پانی بند
کوئی بھی حال نہ شبیر کا سناتا تھا
نہ آنے پاتا تھا کوئی نہ جانے پاتا تھا

یہاں حسینؑ کو تھا انتظار شام و پگاہ — وہاں حسینؑ پہ یہ تھی جفا معاذاللہ
سپاہ کشتۂ بیداد اہل بیت تباہ — حرم میں العطش اور دل میں فاطمہ کی آہ
بھرے عزیزوں کے داغوں سے سینہ و دل تھے
حسینؑ ایک تھے اور چار لاکھ قاتل تھے

اگرچہ تھے بدن و دل پہ زخم سرتاسر — مگر حسینؑ ہوئے چار زخموں سے مضطر
وہ دو تو زخم بدن پر تھے دو کلیجہ پر — ادھر تو کانپتا تھا جسم اور ادھر کو جگر
یہ چار زخم تھے یا نشتر رگ جاں تھے
دو آشکار تھے یہ زخم اور دو پنہاں تھے

کروں کلیجہ کے دو زخموں کا بیاں میں کیا — وہ ایک زخم پسر تھا نہ دے کسی کو خدا
جو جانتے ہو زخم دوسرا کیا تھا — وہ داغ مرگ علمدار تھا پیام قضا
تڑپ تڑپ کے ہوا درد سے جگر ٹکڑے
جگر کے بعد ہوئی شاہ کی کمر ٹکڑے

جراحت جگر شاہ کا تو حال سنا — رہے دو زخم بدن ماجرا سنو ان کا
وہ ایک تیر سہ شعبہ تھا جو جبیں پہ لگا — جبیں پہ تیر کا روزن پڑا درم سے سوا
فلک کو دیکھ کے شبیرؑ آہ کرتے تھے
خدا کو درد پر اپنے گواہ کرتے تھے

بیان زخم دگر کیا کروں خدا کی پناہ — سنان ابن انس کی سنان و سینۂ شاہ
وہ اک وجب نکل آیا تھا شہ کی پشت سے آہ — ہوا جو درد بہت دل میں بولے بسم اللہ
سنان ابن انس نیزہ کی کشاکش میں
ادھر ابن زہرا قبلہ کی سمت کو غش میں

ادھر تو ہوتی تھی پامال رن میں لاش امام — ادھر شہیدوں کا اسباب لٹ رہا تھا تمام
کہیں تو آگ سے جلتے تھے شاہ دیں کے خیام — کہیں لباس حرم لوٹتا تھا لشکر شام

کسی کو نیزہ کسی کو طمانچہ مارتے تھے
حرم حسینؑ کے سب یا علیؑ پکارتے تھے

غرضکہ عصر سے تا وقتِ شام واویلا — جلے بھی اور لٹے بھی خیامِ آلِ عبا
حرم کو لا کے نظربند ظالموں نے کیا — خوشی کی نوبتیں بجتی تھیں فوج میں ہر جا
مگر یہ آتی تھی آواز شادیانے سے
ہزار حیف اٹھے پنجتن زمانے سے

وہ شب سیاہ تھی مانندِ روئے شمرِ شریر — نہ آسمان پہ تارے تھے نام کو نہ قمر
زمیں کی سیر کریں انجم و قمر کیونکر — حسینؑ بے کفن اور اہلبیت سب بے پردہ
سرِ حسینؑ کا بالائے نیزہ مسکن تھا
شبِ سیاہ میں یہ ماہتاب روشن تھا

حرم کے پیشِ نظر ہر طرف تھا گلشنِ داغ — ادھر جلا ہوا خیمہ ادھر کٹا ہوا باغ
صدائے شمر تھی ہر گام یہ ہوا ہے فراغ — چراغِ فاطمہؑ گل ہو چکا جلا دو چراغ
نہ کوئی تذکرہ دفنِ شہِ پاک کرو
بس اپنی فوج کے مردے سپردِ خاک کرو

ہوئے تھے قتل جو کچھ ساکنانِ کوفہ و شام — وہ دفن ہو گئے مشعل کی روشنی میں تمام
امام بے کفن و گور اور فوجِ امام — کفن کو پھاڑ رہے تھے رسولِ خیرِ انام
وہاں لعینوں کی قبروں پہ تو اجالا تھا
یہاں شہیدوں کا کوئی نہ رونے والا تھا

محرّرانِ شکستہ دلِ رسولِ خدا — خطِ شکستہ سے لکھتے ہیں حالِ ہر شب کا
بلا کے منشیوں کو ابنِ سعد نے یہ کہا — کہ فتح نامے لکھو جلد جلد دیر ہے کیا
حقیقت اپنی جدال و قتال کی لکھنا
شکستِ فاتحِ خیبر کے لعل کی لکھنا

مدینہ و یمن و روم و شام و مصر و حلب — ہوں ملک ملک میں ارسال فتح نامے اب
ہر ایک نامہ میں ہو مندرج یہی مطلب — حسینؑ قتل ہوئے بے ردا ہوئی زینبؑ
نگوں امامتِ سرور کا تخت و تاج ہوا
جو پوچھو تخت کا مالک یزید آج ہوا

مری طرف سے لکھو عرضداشت بہرِ یزید — کہ لے ہوا ترے اقبال سے حسینؑ شہید
میں نذرِ فتح کی دوں گا سرِ امامِ سعید — ہیں چند عورتیں اور لڑکیاں بقیدِ شدید

شہ نے تو علی اصغر کو بھی اماں بخشی
یہ تیرے ہاتھ ہے سیدانیوں کی جاں بخشی

جدا عریضہ لکھو اک برائے ابن زیاد
کہ نام پنجتن اب مٹ گیا مبارکباد
جو مجھ سے وعدے کئے تھے زیادہ رکھیو یاد
کیا ہے میں نے تجھے خوش تو مجھ کو کیجیو شاد
نہ لایا دھیان میں خیر النسا کے رونے کو
نہال فاطمہ کاٹے نہال ہونے کو

مگر مدینہ کے خط میں مبالغہ ہو رقم
خیال جنگ سے پہلے یہ ہم کو تھا ہر دم
کہ دو مہینہ لڑیں گے حسین کم سے کم
بہادران عرب ہیں شریک شاہ امم
علی کے سینہ کا ہے زور ان کے سینوں میں
سر حسین کٹے گا کئی مہینوں میں

مگر ہوئی جو لڑائی بروز عاشورا
سحر تھی جمعہ کا دن تھا مہ محرم تھا
نہ دو مہینے لگے اور نہ ایک دن گزرا
شہید لشکر شبیر دو پہر میں ہوا
تمام ظہر تلک شہ کے نور عین ہوئے
شہید چار گھڑی دن رہے حسین ہوئے

نماز عصر پڑھی کاٹ کر سر شبیر
حرم کو لوٹ کے مغرب کی پھر کہی تکبیر
ہماری فوج میں سیدانیاں تو سب ہیں اسیر
خدا کے شیر کا پوتا ہے بستۂ زنجیر
مدد کو اہل حرم کی علی نہیں آتے
پکارتے ہیں نبی کو نبی نہیں آتے

غرضکہ نامے کئے منشیوں نے سب ترقیم
لفافے کر کے رکھے پیش ابن سعد لئیم
عمر نے صبح کئے قاصدوں کو سب تقسیم
کمر میں نامے رکھے قاصدوں نے کی تسلیم
خط مدینہ لئے اک شتر سوار چلا
مگر حسین کے ماتم میں اشکبار چلا

گیا مدینہ کی مسجد میں قاصد ناچار
وطن میں آمد قاصد کا غل ہوا اک بار
گھروں سے جانب مسجد چلے صغار و کبار
زباں سے کہتا تھا ہے ہے حسین قاصد زار
نبی کی قبر کا گنبد تمام ہلتا ہے
ستون مسجد خیر الانام ہلتا ہے

کسی نے فاطمہ صغرا سے یہ کہا آ کر
مبارک آپ کو پردیسیوں کی آئی خبر
ابھی ابھی کوئی آیا ہے شہ کا نامہ بر
رسول پاک کی مسجد میں کھولتا ہے کمر

خدا نے چاہا تو اکبر بھی یونہی آتے ہیں
خبر حسینؑ کی سب پوچھنے کو جاتے ہیں

یہ حال سنتے ہی اٹھ بیٹھی خود وہ آزادی   کہا بس اب ہوئی صحت گئی یہ بیماری
میں آج سمجھی کہ میں بھی پدر کی ہوں پیاری   یہ خالی آیا ہے یا ساتھ ہے کچھ اسواری
خدا کرے کہ سواری بھی ساتھ لایا ہو
ہو بیاہ ابن حسنؑ کا تمہیں بلایا ہو

وہ بولی یہ نہیں دریافت جو میں عرض کروں   کسی کو بھیجئے پوچھ آئے نامہ کا مضموں
پکاریں حضرت ام البنین میں جاتی ہوں   کہا یہ فاطمہ صغرا نے میں بھی ساتھ چلوں
وہ بولی داری جلا تم میں اتنی طاقت ہو
میں پوچھ آتی ہوں بابا ترا سلامت ہو

یہ کہہ کے اوڑھ لی چادر اٹھایا اپنا عصا   رواں ہوئی طرف مسجد رسولؐ خدا
زنان ہاشمیہ ساتھ تھیں برہنہ پا   قریب پہونچیں جو مسجد کے دیکھتی ہیں کیا
وہ کون شخص ہے جس کا کہ حال غیر نہیں
پکاری خیر ہو پردیسیوں کی خیر نہیں

ابھی وہ خط لئے منبر پہ نامہ بر تھا گیا   پڑھا تھا ایک ہی فقرہ کہ حشر تھا برپا
کہ ناگہاں در مسجد سے غلغلہ یہ اٹھا   عزیز و راہ دو آتی ہے ثانی زہرا
زنان ہاشمیہ نے جو اہتمام کیا
تو نامہ بر نے بھی تعظیم کی سلام کیا

عصا پہ ہاتھے کو رکھ کر کھڑی ہوئی وہ آہ   کہا کہ بھائی یہ خط پیچھے پڑھیو خاطر خواہ
زباں سے پہلے یہ کہہ دے کہ خیر سے ہیں شاہ   وہ رو کے کہنے لگا لا الٰہ الا اللہ
بہت حسینؑ کی عاشق ہو اور شیدا ہو
مگر جہان میں اب تم بجائے زہرا ہو

پکاری وہ کہ بھلا میں کہاں بتولؑ کہاں   میں خادمہ ہوں وہ مخدومہ زمین و زماں
جو پوچھا اسم شریف آپ نے کیا یہ بیاں   علیؑ کی بیوہ ہوں عباسؑ نامدار کی ماں
ابھی نہ ماں ہوں میں اس کی نہ وہ پسر میرا
جو کچھ حسینؑ کے کام آئے ہے جگر میرا

ہے بات کرنا بھی نامحرموں سے مجکو عار   علیؑ کی لونڈیوں کا یہ چلن نہیں زنہار
مجھے حسینؑ کی الفت نے کر دیا ناچار   نکل پڑی میں ردا اوڑھ کر سر بازار

خبر حسینؑ کی کہہ آرزو میں ہوں جس کی
قرار دل کو نہیں جستجو میں ہوں جس کی

میں ہول کھاتی ہوں بھائی تو ہے گریباں چاک
بہ شکلِ ماتمیاں سر پہ ڈالے ہے تو خاک
وہ بولا کم ہے جو کچھ غم کرو میں اے غم ناک
ہوئی حسینؑ پہ بیداد لشکرِ سفاک
جگر ہو سنگ کا فولاد کی زبان ہوئے
تو ایک پیاس کا اُس پیاسے کی بیاں ہوئے

پکاری مادرِ عباسؑ جان کی تو ہے خیر
وہ بولا کہتا ہوں ٹھہرا لوں دل کو حال ہے غیر
وہ بیکسی وہ غریبی وہ قتل گاہ کی سیر
نہ میسرہ پہ حبیب اور نہ میمنہ پہ زہیر
نگاہ کرتے تھے دریا کو پیاس سے شبیرؑ
زبان چاٹتے تھے اپنی پیاس سے شبیرؑ

وہ لاکھ خنجر خونخوار اور ایک حسینؑ
زمانہ سر کا خریدار اور ایک حسینؑ
ہزاروں تیر جفا کار اور ایک حسینؑ
ہجوم صدمہ و آزار اور ایک حسینؑ
نہ ایک پانی کا قطرہ دیا ہے اعدا نے
جسے پلائی تھی بتیس دھار زہراؑ نے

میں کون کون سے صدمے سناؤں اے غم ناک
نہ تھا کوئی کہ جو تھامے رکاب سید پاک
بہن حسینؑ کی خیمے سے نکلی دامن چاک
وہ دونوں ہاتھوں سے بالوں پہ ڈالتی تھی خاک
عدو کی فوج میں اُس وقت رو دیا سب نے
جب اپنے بھائی کی تھامی رکاب زینبؑ نے

یہ اُس کا کہنا کہ ام البنین کو رعشہ ہوا
پکاری غصے سے عباسؑ کو ہوا کیا تھا
رکاب تھامنے کو ننگ و عار کچھ سمجھا
یہاں اُٹھاتا تھا نعلین سید الشہدا
غرور کی تو مرے نسل میں نہ عادت تھی
رکاب تھامنا تو فخر تھا سعادت تھی

پکاری سوئے نجف مڑ کے یا علیؑ فریاد
لو خوب آپ کے عباسؑ نے کیا دل شاد
اسے کہ اہل وفا آپ کرتے تھے ارشاد
حقوق پالنے کے میرے کر دیئے برباد
کچھ آپ سنتے ہیں یہ نامہ بر جو کہتا ہے
غلام خدمت آقا میں یوں ہی رہتا ہے

وہ نامہ بر یہ پکارا سنیں تو آپ ذرا
خدا گواہ کہ عباسؑ پر ہے ختم وفا
یہ دوپہر کی سواری کا میں نے ذکر کیا
سوار ہونے لگے تھے جو صبح کو آقا

علم تھا طبل تھا مجرائی تھے سواری میں
تمہارا فعل تھا حاضر رکابداری میں

نشان کو تھامے ہوئے اکبرؑ خجستہ خصال   بچا کے فرق پہ قاسمؑ ہلاتے تھے رومال
جلو میں فوج حسینی کی پشت پر اقبال   سحر کو تو یہ تجمل تھا اور وقت زوال
نہ لشکر ہے نہ سپاہ ہے نہ کثرت الناس ہے
نہ قاسم ہے نہ علیؑ اکبر ہے نہ عباسؑ ہے

وداع ہو کے نبیؐ زادیوں سے وہ مولا   کھڑا تھا ڈیوڑھی پہ تنہا وہ بیکس و تنہا
رکاب تھامنے کو تھا نہ کوئی واویلا   حسینؑ دیکھتے تھے سوئے مقتل و دریا
بلاتے تھے علی اکبرؑ کو اور روتے تھے
پکارتے تھے برادر کو اور روتے تھے

نہ کر تو شکوۂ عباسؑ اے حمیدہ صفات   رکاب تھامے وہ کیونکر کٹے ہوں جس کے ہات
پڑا تھا بے کفن و گور وہ کنار فرات   صدا یہ لاش سے آتی تھی اے شہ خوش ذات
جو ہو رضا یہ شہنشاہ کربلائی کی
رکاب تھاموں کٹے ہاتھوں سے میں بھائی کی

حرم پہ فرق جو پانی کا ساتویں سے پڑا   تو بیں کو جا کے کنوئیں کھودے اس نے خود تنہا
بنا وہ دسویں کو بانی سکینہؑ کا سقا   ملا نہ پیاسوں کو پانی قصور اس کا کیا
امید زندگی شاہ بحر و بر ٹوٹی
ادھر دم اس کا ادھر شاہ کی کمر ٹوٹی

یہ سن کے خوش ہوئیں ام البنین اور یہ کہا   یہ ہیں ہے پاک تفاوت ہو کچھ قسم تو کہا
وہ بولا جیسی قسم چاہو مجھ سے لو بخدا   دروغ گو نہیں قاصد ہوں میں شہیدوں کا
جو کچھ میں کہتا ہوں تجھ دل ملول کے آگے
خدا کے آگے کہوں اور رسولؐ کے آگے

نہ پایا تھا شمر نے اس کو پیام سالاری   نہ ترک اس نے کی شبیرؑ کی علمداری
تمہارے لال پہ جب حال نزع تھا طاری   تو اس نے شہ سے یہ پوچھا بہ منت و زاری
ہوئے غلام سے یا شاہ کربلا راضی
حسینؑ بولے میں راضی مرا خدا راضی

سجود شکر بجا لائی پھر تو وہ بے آس   کہا میں خوش ہوئی عباسؑ آفریں عباسؑ
تمہاری قبر رہے سر دشہ کے رتبہ شناس   غذا ہو میوۂ طوبیٰ تو حُلّے ہوں لباس

بہشت میں غم محشر سے بے ہراس رہو
غلام سبطِ نبیؐ ہو انھیں کے پاس رہو

میں سرخرو ہوئی شبیرؑ کے تو کام آیا   جو کچھ کہ تم پہ مرا حق تھا میں نے بھر پایا
ہزار شکر یہ مژدہ خدا نے سنوایا   علیؑ کی پوتی کا سقّہ بنا مرا جایا
خدا گواہ کہ تم نے مجھے نہال کیا
لو اپنا دودھ بھی ماں نے تمھیں حلال کیا

کیا خطاب یہ قاصد سے تب بحالِ تباہ   لے اب سنا خبر بادشاہ عرش پناہ
وہ بولا حال سنو اپنے نورِ عینوں کا آہ   گیا جہاں سے بڑا ارمان تیرا عبداللہ
غریب مر گیا برچھی کلیجہ پر کھا کے
وہ بولی صدقے کلیجہ پہ ابنِ زہراؑ کے

خبر حسینؑ کی اب دے مجھے برائے حسینؑ   وہ بولا عون بھی تیرا ہوا فدائے حسینؑ
پکاری وہ کہ یہ قربان تھا کیا ئے حسینؑ   سعادت اُس کی تھی اب کہہ تو ماجرائے حسینؑ
وہ بولا خون میں جعفر بھی تیرا لال ہوا
گلا بھی کٹ گیا لاشہ بھی پائمال ہوا

یہ بات سُن کے ہوئی غصہ زوجۂ حیدرؑ   کہا سوال دگر تھا صدا جواب دگر
میں تجھ سے پوچھتی ہوں ابنِ فاطمہؑ کی خبر   تو حال عون کا کہتا ہے قصۂ جعفر
ہیں کون بیٹوں کی ماں اور کس کے چار پسر
فدا حسینؑ پہ ایسے مرے ہزار پسر

جگر پہ مار کے ہاتھ اپنا نامہ بر نے کہا   جو حال سننا ہو بی بی حسینؑ بیکس کا
تو اب کھڑی نہ رہو بیٹھ جاؤ رکھ دو عصا   زنانِ ہاشمیہ کو بٹھاؤ گرد ذرا
کلیجہ تھام لو تم اپنا دونوں ہاتھوں سے
کہ اب غش آئے گا یاں سب کو میری باتوں سے

علیؑ کی زوجہ کو حلقہ میں بی بیوں نے لیا   اور ان کو گود میں سب لے کے بیٹھیں واویلا
ہر اک کو فکر تھی یارب کہے گا قاصد کیا   عمامہ قاصد مغموم نے بھی پھینک دیا
طمانچے منہ پہ لگا مار نے برائے حسینؑ
زمیں پہ گر پڑا منبر سے کہہ کے ہائے حسینؑ

اور اُڑا کے خاک کہا اے ضعیفہ ہو آگاہ   ہزاروں ششصد و پنجاہ زخم اک تن شاہ
اور ایک حلق پہ ہفتاد زخم خنجر آہ   چڑھا حسینؑ کے سینہ پہ قاتل بدخواہ

سرا ماتم تو اُس بدگمان نے کاٹا
غضب ہے ہاتھوں کو پھر ساربان نے کاٹا

یہ سُن کے غش ہوئی اُم البنین عالیجاہ　　اُٹھا یہ شور کہ فریاد یا رسول اللہ
ہوا جو غش سے افاقہ علیؑ کی زوجہ کو آہ　　تو پوچھا حال سے زینبؑ کے بھی تو ہو آگاہ
وہ ساتھ مر گئی بھائی کے یا اسیر ہوئی
دیا حسینؑ کے مرقد پہ وہ فقیر ہوئی

سر اپنا پیٹ کے وہ نامہ بر یہ چلایا　　حسینؑ نے تو کفن بھی ابھی نہیں پایا
رسولؐ زادیوں پر سخت حادثہ آیا　　برہنہ سر ہیں اُٹھا جب سے بھائی کا سایا
گلے میں طوق ہے عابدؑ کے شدت تپ میں
ہیں زخم نیزوں کی نوکوں کے پشت زینبؑ میں

قدم اٹھا نہیں سکتا ہے ضعف سے سجادؑ　　زمیں پہ گرتا ہے ہر دم وہ بیکس و ناشاد
سپاہ شام یہ اُس وقت کرتی ہے بیداد　　سناں چبھوتے ہیں آ آ کے تن میں سب جلاد
ہر ایک صدمہ پہ صدمہ اُسے دکھاتا ہے
کسی کو رحم نہیں ناتواں پہ آتا ہے

پکاری پھینک کے اُم البنین چادر کو　　ہے خاک پردہ پہ بے پردہ جبکہ زینبؑ ہو
زنانِ ہاشمیہ سے کہا یہ پھر رو رو　　مرا حسینؑ بھی بن ماں کا بیٹا ہے لوگو
بتاؤ سوگ میں بیٹے کے ماں ہو کیا کرتی
بتولؑ ہوتی تو کس طرح سے عزا کرتی

زنانِ ہاشمیہ سُن کے یہ اُٹھیں غمناک　　ملی کسی نے تو اُم البنین کے منہ پر خاک
کیا کسی نے گریبان اس غریب کا چاک　　لے آئی گھر سے کوئی اپنے ماتمی پوشاک
خبر یہ اتنے میں پہونچی یہاں یہ ماتم ہے
وہاں حسینؑ کی بیٹی کا مرنے پر دم ہے

پڑی تھی ڈیوڑھی پہ بے ہوش فاطمہ صغرا　　یہ سُن کے گھر کو چلی خاک اُڑاتی وہ دکھیا
سر اپنا پیٹتا قاصد بھی ساتھ ساتھ چلا　　یہاں مریض کی آنکھیں تھیں سوئے مسجد وا
ہوائی اُڑتی تھی چہرہ پہ تھرتھراتی تھی
کبھی کھڑی تو کبھی در پہ بیٹھ جاتی تھی

یہ دیکھا دور سے صغرا نے اتنے میں ناگاہ　　کہ روتی آتی ہیں اُم البنین عالیجاہ
جبیں پہ خاک ملے ایک شخص ہے ہمراہ　　ہے سب میں غل کہ یہی قاصد حسینؑ ہے آہ

خبر حسینؑ کے مرنے کی آج آئی ہے
دوہائی ہے شہِ لولاک کی دوہائی ہے

پکاری فاطمہ صغرا بتاؤ دادی جان
ہے خیر سے مرا پدر دکھیا باپ اور مری ماں
وہ بولی خیر کہاں گھر کا گھر ہوا ویران
سفر میں لٹ گیا بالکل علیؑ کا نام و نشان
تو چھوٹی باپ سے اور میں پسر سے چھوٹ گئی
ہماری اور تری آس آج ٹوٹ گئی

قریب آن کے قاصد نے بھی کیا مجرا
اٹھا کے لایا تھا جو خاکِ مشہدِ شہدا
وہ خاکِ سرخ دی صغرا کو اور یہ رو کے کہا
ترا مسیح ہوا قتل یہ بچی خاکِ شفا
لگا تو آنکھوں سے یہ خاکِ پاک ہے صغرا
ابوتراب کے بیٹے کی خاک ہے صغرا

یہ کہہ کے سونگھی جو وہ خاکِ قتل گاہِ حسینؑ
سر اپنا خاک پہ دے پٹکا ہو گئی بے چین
منھ اپنا ڈھانپ کے کرتی تھی وہ یہ رو کر بین
اور آس پاس تھیں ہمجولیاں بہ شیون و شین
زنانِ ہاشمیہ رو رہی تھیں چلا کے
بپا قیامتِ کبریٰ تھی گھر میں صغرا کے

یہ نوحہ کرتی تھی رو رو کے بے پدر صغرا
میں کس کے آنے کے اب دن گنوں گی اے بابا
میں کس کی پوچھوں گی اب خیر و عافیت مولا
مجھے بھی پاس بلا لو سکینہؑ کا صدقا
مریض بیٹی سے ہر طرح منھ کو موڑ گئے
گئے تو چھوڑ گئے اب تو آس توڑ گئے

یہ کیا ستم ہے کہ اب تک تمھیں کفن نہ ملا
تمھارا مردہ اور اس قابل آہ واویلا
سرِ آپ کا ہے سناں پر زمیں پہ تن ہے پڑا
تمھاری لاش کے صدقے تمھارے سر کے فدا
تمھارے حلق پہ شمشیر بے دریغ چلی
میں اس گلے کے تصدق کہ جس پہ تیغ چلی

نثار آپ کی اس بیکسی پہ ہو صغرا
نہ تین روز تمھیں ایک قطرہ آب ملا
اور اس پہ آہ یہ کی بے حیا نے جور و جفا
گلوئے خشک کو ظالم نے تیغ سے کاٹا
ہزار حیف یہ صدمہ اٹھایا حضرت نے
کہ مرتے مرتے نہ پانی بھی پایا حضرت نے

جوانا مرگ برادر مرے علی اکبرؑ
تمھاری مرگِ جوانی پہ صدقے یہ خواہر
صغیر بھائی مرے بے زباں علی اصغرؑ
بہن نثار ہو ننھے سے تیرے لاشہ پر

کہاں سے چھوٹی سی میت تمہاری پاؤں میں
کہ سہرا باندھ کے گہوارہ میں جھلاؤں میں

یہ بین کرتے ہی وحشت ہوئی جو اس کو سوا — سر اپنا پیٹتی باہر کو دوڑی ننگے پا
لپٹ کے دادی پکاری کدھر کدھر صغرا — وہ بولی رو کے میں جاتی ہوں سوئے کرب و بلا
نہ روکو صاحبو جنگل کی خاک اڑانے دو
پدر کے لاشہ پہ جاتی ہوں مجھکو جانے دو

میں جا کے دیکھوں گی لاش امام نیک خصال — سنا ہے خاک پہ اصغر پڑے ہیں خوں میں لال
میں چھوٹے بھائی کے سلجھاؤں گی جھنڈولے بال — اسیر کنبہ کا پوچھوں گی قید میں احوال
نہ جب تلک شہ مظلوم دفن ہوویں گے
ہم اپنے باپ کے لاشہ پہ رن میں سوئیں گے

پکاری مادر سلمہ سنو تو اے صغرا — ہوئے ہیں دن کئی میں نے یہ خواب میں دیکھا
کہ نکلی ایک کفن لے کے قبر سے زہرا — پکارتی ہیں کہ یہ کیا حال ہو تو رو کے کہا
حسینؑ مر گیا دسویں سے خاک اڑاتی ہوں
اب اس کی لاش کو میں دفن کرنے جاتی ہوں

مزار فاطمہؑ سے آئی یہ صدا ناگاہ — کہ اے حسینؑ مسافر کے رونے والو واہ
حسینؑ کے لئے روتے ہو بیٹی کے ہمراہ — میں کیا حسینؑ کی کوئی نہیں ہوں لوگو آہ
دیا نہ مجھکو مرے نور عین کا پرسا
میں بیبی ہوتی تو دیتی حسینؑ کا پرسا

سنی یہ جبکہ فغان بتول نیک صفات — کہی مریض نے سب لڑکیوں سے رو کے یہ بات
سکینہ ہوتی وہ بابا کو روتی میرے ساتھ — چلو بتولؑ کے مرقد پہ تھام لو مرا ہات
اب ان کو جا کے ہم ان کے پسر کا پرسا دیں
مریض پوتی کو دادی پدر کا پرسا دیں

یہ سن کے اور بھی مضطر ہوئی وہ زار و حزیں — دبیر ناطقہ کو طاقت کلام نہیں
دعا یہ مانگ کہ اے رب آسمان و زمیں — سوا ہو روز بروز اوج ماتم شہ دیں

ہمارا ہاتھ ہو اور شاہ دیں کا ماتم ہو
ہمارا دل ہو اور ابن بتول کا غم ہو



جناب مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ

حشر میں جو ہری اشکِ عزادار ملے — ایک اک اشک کے بدلے دُرِ شہوار ملے

شیرِ خاتونِ قیامت کی جسے دھار ملے — مجرئی ٹھہرے اُس حلق سے تلوار ملے

متفقِ حُبِّ علیؑ پر ہوں جو سب اہلِ جہاں — ایک بھی پھر نہ قیامت میں گنہگار ملے

حشر میں نذرِ غمِ شاہ کا بازار ہوا خوب — جس نے یاں اشک دیئے واں دُرِ شہوار ملے

حال صغراؑ نے جو پوچھا تو یہ زینبؑ نے کہا — دُکھ پہ دُکھ غم پہ غم آزار پہ آزار ملے

دی جگہ آبلوں میں تا نہ خلش غیر کو ہو — پائے سجادؑ کو رستے میں جہاں خار ملے

یوں تو ایک ایک سے رخصت ہوئے مل مل کے حسینؑ — پر سکینہؑ کے گلے رو کے کئی بار ملے

بولے سجادؑ سپاہِ پسرِ حیدرؑ کو — جام کوثر کے ملے خلد کے گلزار ملے

شکوہ لازم نہیں معصوم پہ اپنا اپنا — بیڑیاں ہم کو ملیں طوق ملا خار ملے

بانو کہتی تھیں تیرا فاتحہ دلواؤں گی — دودھ کے کوزے جو لے اصغرِ دلدار ملے

لاشِ اکبرؑ پہ یہ چلاتے تھے رو رو کے حسینؑ — ہو نہ بینائی تو کیا لذتِ دیدار ملے

شام تک راہ میں عابدؑ کو تمنا تھی یہی — دم میں لے لوں جو کہیں سایۂ دیوار ملے

کیوں نہ گل چاک گریباں ہوں زمیں سے پیدا — خاک میں فاطمہ زہراؑ کا جو گلزار ملے

شہ سے صغراؑ نے کہا یہ دمِ تسلیم و وداع — جیتے جی خاک میں اے کاش یہ بیمار ملے

لونڈیوں کو بھی لیا قبلۂ حاجات نے ساتھ — اک ہمیں دردِ جدائی کے سزاوار ملے

دی دعا ماں نے یہ عباسؑ کو ہنگامِ سفر — ہا تجھے مرتبۂ جعفرِ طیار ملے

روتی ہیں گنجِ شہیداں میں یہ کہہ کر زہراؑ — ہیں اسی خاک میں میرے دُرِ شہوار ملے

اب تلک تربتِ صغراؑ سے یہ آتی ہے ندا — ایسے بچھڑے کہ نہ پھر سیدِ ابرار ملے

ذرّہ خوابِ اجل کے لئے پاؤں جو دبیرؔ — آنکھ کھل جائے کہ اب طالعِ بیدار ملے

نوحہ جات

مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ

مجرائی کہا شاہ نے پیارا نہیں اصغرؑ
چھوڑیں تمھیں جنگل میں گوارا نہیں اصغرؑ

شاباش ہوئے قتل سدھارے علی اکبرؑ
تم بھی گئے اب کوئی ہمارا نہیں اصغرؑ

گہوارے میں گھر جا کے جو میت کو لٹایا
ماں بولی کہ اب ضبط کا یارا نہیں اصغرؑ

اے لال مرے کس کی نظر لگ گئی تم کو
دنیا کا جو اب تم کو نظارہ نہیں اصغرؑ

میت کو بھی چھاتی سے لگائے ہوئے رکھوں
پر زندوں میں مردے کا گزارا نہیں اصغرؑ

بیکس کہوں، تشنہ کہوں، یا بے کفن اے لال
نام اتنے ہیں اک نام تمھارا نہیں اصغرؑ

پھر لاش کو لپٹا کے کلیجے سے یہ بولیں
واللہ ترا ہجر گوارا نہیں اصغرؑ

ظالم نے کلیجے پہ مرے تیغ پھرائی
یہ تیر گلے پر تمھارے مارا نہیں اصغرؑ

کیا بھولا بھلاؤں تمھیں ہو خواب اجل میں
تابوت ہے گہوارہ تمھارا نہیں اصغرؑ

نے دودھ بڑھایا نہ تری سالگرہ کی
نکلا کوئی ارمان ہمارا نہیں اصغرؑ

کرنا نہ گلہ تیرے ماں نے نہ بچایا
کیا میرا گنہ تم نے پکارا نہیں اصغرؑ

پانی کو ترستا ہوا بے شیر جہاں سے
تم سا کوئی کم عمر سدھارا نہیں اصغرؑ

نہلاؤں تری چھوٹی سی میت کو میں کیونکر
کوثر کا تو نزدیک کنارا نہیں اصغرؑ

ناگاہ صدا فاطمہ زہرا کی یہ آئی
کیا تیرے برابر مجھے پیارا نہیں اصغرؑ

تھا درد یہ بانو کا دبیر جگر افگار
تم مر گئے اب کوئی ہمارا نہیں اصغرؑ

بتولؑ کہتی ہے رو رو کر صدا حسینؑ حسینؑ

کہے نہ مجرئی کیوں دائما حسینؑ حسینؑ
بتولؑ کہتی ہے رو رو کر صدا حسینؑ حسینؑ

ہر اک مرض کی سلامی دوا حسینؑ حسینؑ
برائے دیدۂ حق بیں ضیا حسینؑ حسینؑ

کہے جو مجرئی وقت فنا حسینؑ حسینؑ
صدا مزار سے نکلے صدا حسینؑ حسینؑ

نسیم غنچہ تسنیم زیب باغ نعیم
بہار گلشن صبر و رضا حسینؑ حسینؑ

حواس خمسہ زہراؑ قرار شیر خدا
امام خامس آل عبا حسینؑ حسینؑ

ہر اک نبی نے کیا ورد پنجتن کا نام
بہت سا رو دیا مگر جب کہا حسینؑ حسینؑ

نہ پوچھو رحلت اصغرؑ کا حال اے یارو
کہ کیسے پیار سے اس نے کہا حسینؑ حسینؑ

زبان دل سے بوقت فنا بھی صغراؑ نے
بجائے شربت تسکین سنا حسینؑ حسینؑ

یہ اپنی بیوہ کو عباسؑ نے وصیت کی
تو ورد کیجیو صبح و مسا حسینؑ حسینؑ

مرا شہید مرا بے گنہ مرا سید
مرا امام مرا مقتدا حسینؑ حسینؑ

سنے یہ فاطمہ زہراؑ نے بین آ کے مقتل میں
کہاں پڑا ہے مرا دلربا حسینؑ حسینؑ

پڑا ہے بے کس و بے ساز زیست آہ
غریب و بے کس و بے آشنا حسینؑ حسینؑ

کہوں میں بے کفن اس کو کہ بے وطن یارب
شہید کہہ کے اسے رو دیا حسینؑ حسینؑ

دبیر ختم سوال و جواب پھر کیا ہے
جواب نالے میں گر ہو لکھا حسینؑ حسینؑ

نوحہ در حال حضرت علی اکبرؑ

(ماں کی زبانی)

کہا ماں نے میں قربان میرے نامراد اکبرؑ
جوانی میں ہوئے بے جان میرے نامراد اکبرؑ

کہاں ڈھونڈوں کدھر جاؤں کہاں سے تم کو لے آؤں
پھوپھی کے دل پدر کی جان میرے نامراد اکبرؑ

دلھن اب کس کی لاؤں گی کسے دولہا بناؤں گی
مرے بن بیاہے پر ارمان میرے نامراد اکبرؑ

جبیں پر خون انگوٹھی منہ میں پھل برچھی کا سینے میں
نہ بھولے گی کبھی یہ شان میرے نامراد اکبرؑ

جناں میں یاد فرماؤ نہ در در ماں کو پھراؤ
مری مشکل کرو آسان میرے نامراد اکبرؑ

جگر پر ہاتھ دھرتے ہو تڑپ کر آہ بھرتے ہو
یہاں برچھی ہے یا پیکان میرے نامراد اکبرؑ

اٹھو ہاتھوں کو پھیلاؤ اٹھو ماں سے لپٹ جاؤ
غریبوں پر کرو احسان میرے نامراد اکبرؑ

جو مرضی ہو جوانان وطن کو یاں بلا بھیجو
سوم کو سب پڑھیں قرآن میرے نامراد اکبرؑ

دبیر اک حشر تھا برپا یہی بانو کی زاری تھی
مرے غازی مرے ذیشان میرے نامراد اکبرؑ

نوحہ امام بہ زبان جناب زینبؑ

کہتی تھی شہ کی بہن ہائے حسینؑ حسینؑ
بے کفن و بے وطن ہائے حسینؑ غریب

ہائے مرے بے سپاہ ہائے مرے بے گناہ
ہائے مرے خستہ تن ہائے حسینؑ غریب

اختر برج رسول گوہر درج بتول
نائب خیبر شکن ہائے حسینؑ غریب

پانچ گئے ایک تیغ ہائے غضب وا دریغ ذبح ہوئے پنجتن ہائے حسینؑ غریب
قتبلۂ اہلِ ولا فخرِ ذبیحِ خدا یوسفِ گل پیرہن ہائے حسینؑ غریب
سینہ پہ شمرِ لعیں حلق پہ شمشیرِ کیں تجھ پہ یہ رنج و محن ہائے حسینؑ غریب
رسم ہے وقتِ فنا دیتے ہیں آب و غذا تم مرے تشنہ دہن ہائے حسینؑ غریب
بھائی ترا گھر جلا بھائی مرا سر کھلا بیچے ہیں عریاں بدن ہائے حسینؑ غریب
دیکھو تو زہراؑ کے لال کھولے ہیں اماں نے بال روتی ہیں سب نوحہ زن ہائے حسینؑ غریب
نانا نبیؐ روتے ہیں بابا علیؑ روتے ہیں کہتے ہیں بھائی حسنؑ ہائے حسینؑ غریب
بھائی کی بیوہ حقیر بھائی کا بیٹا اسیر شانوں میں میرے رسن ہائے حسینؑ غریب
پیاس کا صدمہ سہا کچھ نہ زباں سے کہا فاطمہ کے کم سخن ہائے حسینؑ غریب
آگے کہے کیا دبیرؔ ہلتا ہے عرشِ قدیر
کہتی ہے شہ کی بہن ہائے حسینؑ غریب

نوحہ بہ زبانی جنابِ سیدہؑ

یہ رن میں کہتی تھی زہراؑ حسینؑ من حسینؑ من مرے بے کس مرے تنہا حسینؑ من حسینؑ من
غریب و بے وطن میرے یتیم و بے وطن میرے شہید و خستہ تن میرے حسینؑ من حسینؑ من
سکینہؑ غش میں تھی پیارے طمانچے شمر نے مارے حرم سر ننگے ہیں سارے حسینؑ من حسینؑ من
ملا پانی نہ دریا سے گیا پی کر نہ دریا سے مرے بھوکے مرے پیاسے حسینؑ من حسینؑ من
مرے غازی مرے عابدؑ مرے صفدر مرے زاہد مرے صابر مرے سید حسینؑ من حسینؑ من
نہ بے کس تجھ سا ہوئے گا ترا غم ہوش کھوئے گا زمانہ تجھ کو روئے گا حسینؑ من حسینؑ من
تمہاری لاش گر پاؤں گلے سے اپنے لپٹاؤں کدھر ڈھونڈوں کدھر جاؤں حسینؑ من حسینؑ من
یہ ماں رونے کو آئی ہے نبیؐ کو ساتھ لائی ہے دہائی ہے دہائی ہے حسینؑ من حسینؑ من
چڑھا جلاد سینے پر پڑا حلقوم پہ خنجر ہوا تو ظلم سے بے سر حسینؑ من حسینؑ من
قضا پردیس میں آئی نہ تم نے قبر بھی پائی یہ مظلومی یہ تنہائی حسینؑ من حسینؑ من
دبیرؔ آگے کہوں کیا میں قیامت رن میں تھی برپا یہی فریاد تھی زہراؑ حسینؑ من حسینؑ من



جناب اوجؔ اعلی اللہ مقامہ

ہم اوجِ فلک آج اپنا سخن ہے
کہ مدحِ رواقِ امامِ زمن ہے

مرے دل میں داغِ غمِ پنجتنؑ ہے
صلا اس کا خلدِ بریں کا چمن ہے

ہوئے جلوہ افگن جو عباسؑ رن میں
اُٹھا غل یہ فرزندِ خیبر شکن ہے

زمیں تھرتھراتی ہوئی ہے رعب ایسا
یہاں گردِ رستم کا بھی بانکپن ہے

سرِ شاہ کہتا تھا دیکھو نہ ان کو
پیمبرؐ کا کنبہ اسیرِ رسن ہے

جسے حلۂ خلد پہنائے حق نے
غضب ہے کہ وہ خاک پہ بے کفن ہے

کہا شہ نے زینبؑ سے یہ کربلا میں
یہی تا قیامت ہمارا وطن ہے

سکینہ کی تربت پہ بانو نے لکھا
یہ قبرِ اسیرِ غریب الوطن ہے

خدا جس کا بندہ دل سے طالب ہو اے اوجؔ
وہ گنجینۂ اُلفتِ پنجتنؑ ہے

سلام

(جناب رفیع اعلی اللہ مقامہ خلف مرزا اوج مرحوم)

جیتے جی منظور ہے جنت کا منظر دیکھنا
جلوۂ حق روضۂ پُرنورِ سرور دیکھنا

عشق والو شانِ معراجِ پیمبر دیکھنا
قربِ اللہ و نبیؐ اللہ اکبر دیکھنا

حشر کے دن مدحتِ حیدرؑ سے ہوگا یہ وقار
میری خاطر خود کھُلے گا خلد کا در دیکھنا

تیرے صدقے اے خدائی کر تو فردا اے رسولؐ
میری جانب بھی ذرا اے بندہ پرور دیکھنا

گھیر لیں گے ڈھونڈھ کر ساقی کو پیاسے حشر میں
جمگھٹے ہوں گے لبِ تسنیم و کوثر دیکھنا

اُن پہ عاشق تھی زلیخا اُن پہ عاشق ہے خدا
حُسنِ یوسف دیکھ کر حُسنِ پیمبر دیکھنا

توڑتے ہیں کس طرح کعبہ میں بُت دستِ خدا
پائے حیدر دیکھنا دوشِ پیمبر دیکھنا

ہو رہا ہے عاشق و معشوق میں رازِ نیاز
کون ہے پردے کے اندر کون باہر دیکھنا

یا علیؑ تجھ سا جو ساقی ہوئے گا اور مجھ سا رند
اپنے میکش کو پلا کر جامِ کوثر دیکھنا

بوترابی ہوں میری مٹی بھی ہوگی خاکِ پاک
آئیں گے جس دم مرے مرقد میں حیدرؑ دیکھنا

پڑھتے ہیں کیونکر نماز آخری سبطِ رسولؐ
سر ہے سجدے میں تہہ محرابِ خنجر دیکھنا

روزِ محشر دوزخ و جنت سے کیا مطلب رفیعؔ
ہم فقیروں کا درِ حیدرؑ پہ بستر دیکھنا

حضرت دبیر اعلی اللہ مقامہ

نتیجۂ فکر بلند جناب ڈاکٹر رفیق حسین صاحب رفیقؔ سابق سول سرجن قیصر ہند

دلِ فدائے حسینؑ است در کنارِ دبیر

مرا شعور سخن کیوں نہ ہو نثارِ دبیر
مجھے رفیقؔ نے بخشی ہے رہگذارِ دبیر

کروں گا پیش میں تصویرِ کارزارِ دبیر
جو مل گیا مری فکر کو اختیارِ دبیر

سناؤں آپ کو میں ذکرِ نوربارِ دبیر
نظر میں آپ کی پھرنے لگے وقارِ دبیر

یہ مختصر سی ہے ان کے کمال کی تعبیر
اساتذائے معظم میں ہے شمارِ دبیر

تھا اختیار ہر اک شعبۂ سخن پہ مگر
ہے صنفِ مرثیہ گوؤں میں شاہکارِ دبیر

کلام ان کا نہ کیونکر رلائے دنیا کو
دلِ فدائے حسینؑ است در کنارِ دبیر

غمِ حسینؑ کے ہمراہ وہ بھی زندہ تھے
کلام ارفع و اعلیٰ ہوا افتخارِ دبیر

جہاں میں بڑھتے گئے جیسے عز و جاہ و کمال
انھیں کے ساتھ بڑھا اور انکسارِ دبیر

کلام تابع قولِ رسولؐ و قولِ خدا
زمانے بھر کو نہ کیوں کر ہو اعتبارِ دبیرؔ

وہ تاحیات رہی سوگوارِ سبطِ نبیؐ
جنابِ فاطمہ زہراؑ ہیں سوگوارِ دبیرؔ

بنے جو زینتِ ہر مجلسِ عزائے حسینؑ
کلام ایسا نہ کیوں کر ہو افتخارِ دبیرؔ

کمال آپ کو ہے علم دیں میں بھی حاصل
الگ ہے مرثیہ گویوں سے رہگذارِ دبیرؔ

ہے اُن کی مرثیہ گوئی میں دین کی تبلیغ
کھلا ہے گلشنِ ایماں میں لالہ زارِ دبیرؔ

غلط نہیں جو کہوں میں بہ فیضِ مدحِ حسینؑ
حسینؑ والوں کے اوپر ہے اختیارِ دبیرؔ

حمایتِ غمِ شہ میں یزیدیت کے خلاف
ہمیشہ چلتی ہی رہتی تھی ذوالفقارِ دبیرؔ

تھے علمِ دیں میں جو کامل تو زہد میں یکتا
سخاوتوں سے سنورتا رہا شعارِ دبیرؔ

جنابِ اوجؔ نے کسبِ کمال اُن سے کیا
رفیعؔ اوجؔ کے بیٹے تھے رشتہ دارِ دبیرؔ

ہزار حیف کہ وہ اکبر رفیعؔ کے فرزند
جو علمِ دیں میں تھے ہر طرح یادگارِ دبیرؔ

ہوئے حیات میں والد کی راہیِ جنّت
ہوئے رفیعؔ سے پہلے ہی ہمکنارِ دبیرؔ

جنابِ صادقؔ و گوہرؔ جئیں ہزار برس
انھیں کے دم سے ہے آباد اب مزارِ دبیرؔ

چمن دبیرؔ کا پھولے پھلے قیامت تک
دُعا رفیقؔ کی تجھ سے ہے کردگارِ دبیرؔ

شہنشاہِ اقلیمِ بلاغت مرزا دبیر مرحوم

از
شاعرِ ملت جناب باقر رضوی امانت خانی

تھا گلِ افکار سے بھرپور دامانِ دبیر
دیکھی تھی شاہِؑ دیں کو چشمِ گریانِ دبیر
حُبِ اہلبیتؑ تھی شمعِ شبستانِ دبیر
کیوں ہوا باندھیں نہ یہ دنیائے شعر و فکر میں
پھول ہیں جس میں فصاحت کے وہ ہے باغِ انیس
اُن کو تھا معلوم کہتے ہیں کسے وزنِ سخن
خوبصورت تھیں جو تشبیہیں کنیزیں بن گئیں
مرثیے میں ہے رقم تاریکیِ زنداں کا حال
مسکرانا تیر کھا کر اصغرؑ معصوم کا
مصحفِ حیدرؑ، فیضِ سرورؑ، فضلِ ربُّ العالمین
گوشِ دل سے سنتے تھے مَن کُنتُ مولا کی صدا
تشنہ کامِ اصغرِؑ بے شیر یوں لیتے رہے
جب دکھایا مرثیے میں جلتے خیموں کا سماں
وسعتِ میدانِ مدحِ مرتضیٰؑ اتنی بڑھی
دل کی حالت تھی تصور میں علی اصغرؑ کے یوں
کتبِ شاعر میں آنسو تھے تھے نامِ حسینؑ
ان کا میزانِ سخن میں وزن رکھتا ہے کلام
خلد سے اب بھی صدا دیتی ہے یہ روحِ انیس

بن گیا تھا مرثیہ گویا گلستانِ دبیر
تھے حسینؑ ابنِ علیؑ خود نوحِ طوفانِ دبیر
الفتِ شیرِ خدا تھی جانِ ایمانِ دبیر
نام ہے شبیرؑ کا نقشِ سلیمانِ دبیر
گُل بلاغت کے ہیں جس میں وہ گلستانِ دبیر
تُلتی تھی گوہرِ اشعار میزانِ دبیر
ہو گئے تھے استعارے دربہ دربانِ دبیر
مجلسِ شہؑ میں یہ ہے شمعِ فروزانِ دبیر
دیکھی تھی مرثیے میں چشمِ گریانِ دبیر
تھا یہی بس شاعری کا ساز و سامانِ دبیر
غم کا میداں کیوں نہ ہو میدانِ عرفانِ دبیر
تاکتا تھا حرملہ کا نام پیکانِ دبیر
ہو گئی موسومِ غم شامِ غریبانِ دبیر
کرتا تھا میدانِ غم سے بات میدانِ دبیر
سوختہ جھولا تھا گویا قلبِ سوزانِ دبیر
یا علیؑ پڑھنا سکھاتا تھا دبستانِ دبیر
کیوں نہ ہو اردو زباں پر بار احسانِ دبیر
میں ہی کر سکتی ہوں بس اندازہ شانِ دبیر

شاہِ اقلیمِ بلاغت وہ تھے باقر بالیقیں
یہ قصیدہ ہو نہیں سکتا ہے شایانِ دبیر

عمر انصاری

موازنۂ میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ

یہ بھی پیارے ہیں وہ بھی پیارے ہیں | دونوں اُستادِ فن ہمارے ہیں
نام جن کا کہ ہے انیسؔ و دبیرؔ | آسمانِ ادب کے تارے ہیں
یوں تو تارے ہیں بے شمار مگر | سب سے روشن یہ دو ستارے ہیں
کس کو کہیے قمر، کسے خورشید | دونوں ہی نُور کے منارے ہیں

پُوچھیے اُس سے کچھ مقام ان کا | جس عروسِ سخن کے مارے ہیں
یہ اگر اُس کا اک سراپا ہیں | رُوپ وہ بھی اُسی کا دھارے ہیں
اُس کی آنکھوں کی ہیں جو یہ تشبیہ | اُس کی نظروں کے وہ اشارے ہیں
ہیں جو اُس کے لبوں کا یہ ارشاد | اُس کے عارض کے وہ نظارے ہیں
آبرو یہ جو اُس کے ابرو کی | گیسوؤں کے وہی سہارے ہیں
یہ اگر اک حسین کنایہ ہیں | وہ بھی کیا خوب استعارے ہیں

ہیں زباں کی یہ دل نشیں موجیں — اور بیاں کے وہ بہتے دھارے ہیں
وہ صنائع ہوں یا بدائع ہوں — دونوں پر دونوں کے اجارے ہیں
ہوں فصاحت کے یا بلاغت کے — باغ دونوں کے یہ سنوارے ہیں
ادب ان کا یہ دو شگفتہ ہے — اور یہ دونوں ماہ پارے ہیں

کس کو ترجیح دیجیے کس پر — دونوں اک دوسرے کے پیارے ہیں
ایک دل، اک نگاہ، اک موضوع — ایک ہی غم کے دونوں مارے ہیں
ایک ہی درد دل میں دونوں کے — یہ انھیں، وہ انھیں پکارے ہیں
ہیں جو ان کے لیے وہ اک آہٹ — وہ کبھی ان کے بڑے سہارے ہیں
یہ زمیں کے اگر ہیں لالہ و گل — آسماں کے وہ چاند تارے ہیں
یہ چہیتے اگر امام کے ہیں — وہ بھی سرکار ہی کے پیارے ہیں
اک نے کاٹی ہیں جاگ کر راتیں — اک نے رو رو کے دن گزارے ہیں

وادیٔ شعر میں انیسؔ و دبیرؔ
ایک دریا کے دو کنارے ہیں

تاجدار سخن جناب دبیر مرحوم

(جناب ضیا رضوی)

فن سخن میں تھے وہ نغز گو جناب دبیر
سوا انیس کے جن کا نہ تھا کوئی بھی نظیر

شعاعیں آج بھی ان کے کلام کی ہیں عیاں
تھے آسمان سخن کے وہ آفتاب منیر

وہ بحر آب زلال کلام ہے ان کا
لبوں کو کرتے ہیں تر آج بھی صغیر و کبیر

اضافتوں کی ہے تکرار گو کہیں بھاری
مگر تخیل اعلیٰ ہر ایک عرش نظیر

غرابتوں کی ہیں گو جھلکیاں سر قرطاس
مگر مودت قربیٰ کی لفظوں میں تاثیر

ظہور مہر کا جس بند میں بیاں ہے نظام
ہے میرے قول کی اس میں ثبوت کی تنویر

یہ سب سہی پہ وہ پیچیدہ معنی دلکش
ہو جیسے چہرۂ زیبا پہ زلف کی زنجیر

وہ کون صاحب عصمت ہے آج اس فن میں
کبھی نہ جس سے ہو اس صنع میں کوئی تقصیر

بیان حسن سخن سے وہ روشنی بخشی
کہ مرثیوں کی چمک اٹھی دہر میں تقدیر

اگر فقیہوں نے بخشا فروغ اس دیں کو
تو شاعروں نے بتایا ہے اس کو مہر منیر

دیا انیس نے گر تاج زر نگار اسے
دبیر نے گہر فن کا بخشا اسکو سریر

قلم سے کی وہ ستائش کی آئینہ بندی
کہ نقطے میں آل نبیؐ کی ہے تصویر

عزیز پار گر مصطفےٰ نہ ہو کیونکر
تمام عمر رہا تو ثنا گر شبیرؑ

نہیں ہے آج پہ توصیف آل کے باعث
ہر ایک شیعہ کے سینے میں ہے تری توقیر

ثنائے آل نبیؐ پر وہ کی گل افشانی
صلے میں جس کے ملی تجھکو خلد کی جاگیر

صنم کدے ہیں جو سنتے ترے نوا کا فسوں
بتوں میں ہوتا ہر اک سمت نعرۂ تکبیر

دکھائی ایسی ہر اک بند میں جگر کا دی
ہر ایک بن گیا مقتل کی خون بھری تصویر

ہیں اس طرح سر کاغذ حروف کو مرکز
کبھی ہوں فوج [illegible] جس طرح [illegible] شمشیر

تو وہ مفسر قرآن معنی مدحت
ہر ایک مرثیہ تیرا ہے [illegible]

جمال معنی سے کیا کیا اٹھائی تو نے نقاب
ہے دست فن ترا دست خدائے رب قدیر

عزیز رکھیں نہ کیوں مرثیوں کو ہم اے ضیا
ہوئی انھیں سے عزائے حسینؑ کی تعمیر

پیغام

(ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی سابق صدر شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی)

مکرمی۔ آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا۔ یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ آپ امسال سرفراز کا دبیر نمبر شائع کرا رہے ہیں۔ دبیر پر جس تفصیل کے ساتھ تحقیقی کام ہونا چاہیے نہ ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ اُن کے بہت سے مراثی بھی ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔ اگر اُن کے تمام مراثی موجودہ معیار کے مطابق تدوین کرکے شائع ہو جائیں تو یہ ہمارے اُردو ادب کی بڑی اہم خدمت ہوگی۔

آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ انیس و دبیر ہماری صنعت مرثیہ نگاری کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ خود دبیر کا یہ احسان کیا کم ہے کہ اُنھیں کے مقابلے میں آکر انیس انیس ہوئے۔ جوش و خروش، طنطنہ اور رزمیہ انداز دبیر نے اختیار کیا اُسی نے مرثیے کو اُردو شاعری میں بلند مقام دلوایا۔ اس سے دبیر کی خدمات زبان و ادب کا کماحقہ جائزہ لینا ہمارے ناقدین کے لیے ازبس ضروری ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہمارے طلبہ کے نصابات میں عموماً انیس و دبیر کے مرثیے ضرور شامل کیے جاتے ہیں لیکن مرثیے طویل ہونے کے باعث پورے پورے شامل نہیں ہو سکتے اس لیے بڑی ضرورت ہے کہ دبیر کے مراثی کا ایک اچھا انتخاب بھی شائع کیا جائے تاکہ طلبہ اُس سے مستفید ہو سکیں۔

خیر اندیش
نورالحسن ہاشمی
۱۱ر نومبر ۱۹۷۶ء

بخدمت کاظم علی خاں صاحب
وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ

سرفراز لکھنؤ
ہفتہ وار
جلد ۵۵   ۱۷؍ دسمبر سنہ ۱۹۶۲ء   نمبر ۱

سرفراز کا دبیر نمبر

فروری سنہ ۱۹۶۲ء میں انیس نمبر شائع کرنے کے بعد ہمارا قصد تھا کہ جلد سے جلد دبیر نمبر بھی نکال دیا جائے لیکن معلوم ہوا کہ دبیر پر لکھنے والوں کی اتنی کمی ہے کہ ہماری کوشش کے بعد بھی بہ آسانی اس سلسلہ میں مضامین فراہم نہ ہو سکے۔ اب خدا خدا کرکے سنہ ۶۲ء میں ہمارا یہ برسوں پرانا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکا۔ ہمیں یہ اعتراف کرنے میں ذرہ برابر باک نہیں کہ اگر جناب مرزا کاظم علی خاں صاحب جو ادبیات میں حد درجہ انہماک و شغف رکھتے ہیں، اس سلسلہ میں ہم سے تعاون نہ کرتے تو مرزا دبیر پر اتنا بھاری بھرکم نمبر ہرگز نہیں نکل سکتا تھا۔ نہ صرف موصوف نے خود اپنا مضمون مرحمت فرمایا بلکہ دوسرے ممتاز اہل قلم سے مضامین بھی حاصل کرنے کی سعی فرمائی۔

اب ہم یہ دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ میر انیس نمبر کے بعد ہماری یہ دوسری خدمت جو دبیر نمبر کی شکل میں پیش کی جا رہی ہے ادبی و معنوی اعتبار سے انیس نمبر سے کمتر نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انیس نمبر کی ضخامت دبیر نمبر سے کہیں زیادہ تھی مگر مقالوں اور مضمونوں کے اعتبار سے دبیر نمبر کو بھی سرفراز کا ایک شاہکار ہی سمجھا جا سکتا ہے اس لئے کہ دبیر پر ابھی تک ہندوستان میں کسی دوسرے جریدے نے اپنا کوئی اسپیشل نمبر شائع نہیں کیا ہے۔ یہ پہلی کوشش ہے جو سرفراز ارباب ادب کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ اس میں جتنے مضامین شامل کئے گئے ہیں وہ بلند پایہ ادیبوں کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے اس نمبر کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔ پاکستان میں "ماہ نو" نے ضرور دبیر نمبر شائع کیا ہے مگر ہندوستان میں دبیر نمبر کے شائع کرنے کا فخر سرفراز ہی کو حاصل ہے۔ ہم نے "ماہ نو" کے بعض مضامین کو بھی اس نمبر میں شامل کر لیا ہے جس کے لیے ہم پاکستانی معاصر کے شکر گزار ہیں۔

اردو صحافت میں اسپیشل نمبروں کے شائع کرنے کی اولیت کا شرف سرفراز ہی کو حاصل ہے اور وہ اپنے یوم تاسیس ہی سے اسپیشل نمبر نکالتا رہا ہے۔ مگر ابتدائی برسوں تک اس کے نمبر بس چند صفحات پر مشتمل ہوتے تھے اور ان کا سائز بھی کتابی سائز سے بہت بڑا ہوتا تھا جس کی وجہ سے اس کی علیحدہ جلد بندی نہیں کرائی جا سکتی تھی اور اس طرح ان کی عمر بھی اتنی ہی کم ہوتی تھی جتنی عموماً سرفراز کے ہفتہ وار یا روزانہ پرچوں کی ہوا کرتی تھی۔

لیکن سنہ ۱۹۵۵ء سے جب کہ ہمارا اتفاق سرفراز سے دوبارہ از سر نو قائم ہوا۔ حسن اتفاق سے اسی زمانہ میں جناب سید انصار حسین صاحب رضوی بھی منیجر کے عہدہ پر آ گئے۔ ایڈیٹر اور منیجر دونوں نے یک دلی ہو کر سرفراز کے خزاں دیدہ شجر کی آبیاری بڑی تندہی سے کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت سے سرفراز بالالتزام وقت پر نکل رہا ہے۔ اس کی صوری اور معنوی حیثیتوں میں اضافہ ہوا ہے جس کی وجہ سے اخبار کی کھوئی ہوئی ساکھ پھر بحال ہو گئی اور افراد ملت کو یقین ہو گیا کہ سرفراز کی بنیادیں بڑی گہرائی تک پہونچ چکی ہیں اور وہ ان اخبارات کے زمرہ میں نہیں آتا جو وقتی جوش کے ماتحت نکالے جاتے ہیں اور چند دن ایک پھول کی طرح اپنی بہار جانفزا دکھلا کر ہمیشہ کے لیے کمھلا جاتے ہیں۔

جس طرح سرفراز نے اسپیشل نمبروں کے نکالنے کی پہل کی اسی طرح ہم نے اپنے اس ۲۴ سالہ دور میں مختلف موضوعات پر بڑے بڑے ضخیم نمبر نکالنے کی شاہراہ قائم کی۔ ان نمبروں نے یقیناً سرفراز کی مقبولیت و محبوبیت میں حیرت ناک اضافہ کیا ہے خصوصاً اس کے دو اسپیشل نمبر جو محرم اور رجب کے مہینوں میں محرم نمبر اور رجب نمبر کے نام سے نکالے جاتے ہیں اتنے مقبول ہیں کہ ناظرین کو سال بھر تک ان نمبروں کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ اور وہ حرزِ جان سمجھ کر انھیں اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں۔

سرفراز نے بعض شخصیتوں کے متعلق بھی مخصوص نمبر نکالے ہیں لیکن ہمیں دلی صدمہ ہے کہ فخر قوم مولوی سید کلب عباس نمبر اب تک شایع نہ ہو سکا۔ حالانکہ ہم نے مرحوم کے انتقال کے بعد ہی بہت جلد مضامین فراہم کر کے انھیں ایڈٹ کر دیا تھا اور بروقت منیجر صاحب سرفراز نے ان کی کتابت بھی کرائی تھی مگر بعض افسوسناک مجبوریوں کی وجہ سے کاپیاں نہ چھپ سکیں۔ حتیٰ کہ عرصہ تک وہ رکھے رکھے تقریباً بیکار بھی ہو چکی تھیں۔ اس کے بعد پھر امید بندھی کہ اب امروز فردا میں اس کی اشاعت کا بندوبست ہو جائے گا۔ اس لئے ان مضامین کو ازسرنو کتابت کرایا گیا مگر پھر یہ امید ناامیدی میں بدل گئی اور اگر جلد اس کی اشاعت کا انتظام نہ ہو سکا تو شاید یہ دوسری مرتبہ کی کتابت بھی خراب ہو جائے گی۔ اس کی طباعت و اشاعت میں سب سے بڑی رکاوٹ پیسہ کی ہے اور:

بے زری کرد زمن آنچہ ز تاروں نہ کرد

چنانچہ سرفراز مینیجنگ بورڈ اپنی دلی خواہش کے باوجود اس پر قادر نہ ہو سکا۔ اس لئے کہ کاغذات اور لوازمات طباعت کے نرخ اتنے چڑھ گئے ہیں کہ پہلے جو کام ایک روپیہ میں ہو جاتا تھا وہ اب دس روپیہ میں بھی نہیں ہو پاتا۔

بعض حضرات فخر قوم نمبر میں تکلیف دہ تعویق و تاخیر کا ذمہ دار ایڈیٹر کو قرار دیتے ہیں جیسے کہ مالیات کا سیاہ و سفید ایڈیٹر و منیجر ہی کے اختیار میں ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ سرفراز کا ایک مینیجنگ بورڈ ہے جس کا اپنا صدر و سکریٹری بھی ہوتا ہے۔ عملہ سرفراز اپنے بورڈ کی ہدایات پر عمل کرتا ہے۔ ایڈیٹر کا فرض تو صرف اتنا ہی تھا کہ وہ مناسب وقت کے اندر فخر قوم نمبر کو مرتب کر دے اور منیجر اس کی کتابت کا انتظام کر دیں۔ چنانچہ یہ دونوں کام ایک مرتبہ نہیں دو مرتبہ پایہ تکمیل کو پہونچا دیئے گئے۔ بہرحال ہمیں خود اس بات کا رنج ہے کہ اس مجوزہ نمبر کے اب تک شایع نہ ہونے کی وجہ سے سرفراز کی سبکی ہوئی اور اس کی ساکھ کو ٹھیس پہونچی۔ مگر اس میں ہم بھی مجبور ہیں اور بورڈ بھی۔

بہرحال سال میں یہ دو فریضے ہمارے اوپر عائد ہوتے ہیں ایک محرم نمبر اور دوسرے رجب نمبر۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم ان دونوں فریضوں کو گزشتہ ۲۴ سال سے بہ احسن الوجوہ انجام دے رہے ہیں اور اب مرزا دبیر نمبر بھی شایع کر کے ہم نے ایک بڑی کمی کو پورا کر دیا ہے۔ شاید یہ ہماری عمر کی ایک آخری اہم خدمت ہے اس لئے کہ اب ہمارا سن ۵۷ سال سے تجاوز کر چکا ہے اور سوائے دل و دماغ کے ہمارے تمام اعضاء و جوارح بیکار ہو چکے ہیں اور ہر لمحہ ہمارے کانوں میں "الرحیل الرحیل" کی صدائیں آتی رہتی ہیں۔

مرزا دبیر نمبر اگرچہ میر انیس نمبر سے صفحات میں کم ہے لیکن "بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر" کے مصداق مضامین کے اعتبار سے بہت زیادہ وقیع اور بھاری بھرکم ہے۔ یقین ہے کہ ہمارے گزشتہ تمام نمبروں کی طرح یہ نمبر بھی بہ نظر پسندیدگی دیکھا جائے گا۔

آہ علی یاور جنگ

یہ خبر اخبارات میں پڑھ کر سخت صدمہ ہوا کہ ہندستان کا

ایک سپوت اور شیعہ فرقہ کی ممتاز و موقر شخصیت جناب نواب علی یاور جنگ بہادر گورنر مہاراشٹر کا انتقال ۱۱ دسمبر ۱۹۷۶ء کو بمبئی میں ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مرحوم ۱۶ فروری ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہنے کے بعد نظام کی کابینہ میں کچھ عرصہ دستوری امور کے وزیر رہے پھر ۱۹۴۸ء میں نظام حکومت سے الحاق کے مسئلہ پر اختلاف کی بنیاد پر مستعفی ہو گئے۔ پھر حکومت ہند میں آپ نے سیاسی اور تعلیمی میدانوں میں بڑی قیمتی خدمات انجام دیں۔

آپ تین سال تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور اسی دوران میں بعض فرقہ پرستانہ ذہنیت رکھنے والے طلباء اور دوسرے عناصر نے باغیانہ روش اختیار کر لیا۔ حتی کہ ایک میٹنگ میں انھوں نے حملہ کر دیا جس میں علی یاور جنگ بہادر زخمی بھی ہوئے اس سرکشانہ رویہ میں پولیس نے آکر قابو حاصل کیا۔ اس وقت تمام مسلم پریس مرحوم کے خلاف اعتراضات و سب و شتم کی مہم جاری کئے ہوئے تھا لیکن ایک سرفراز تھا جو برابر ان کی حمایت و وکالت کرتا رہا۔ انتقال کے وقت وزیر اعظم اندرا گاندھی اور وزیر اعلیٰ مسٹر ایس بی چاون ان کے بستر مرگ کے پاس موجود تھے۔

لاش دو گھنٹہ تک دیدار عام کے لیے راج بھون میں رکھنے کے بعد بذریعہ ہوائی جہاز حیدر آباد لے جائی گئی جہاں میت کو آپ کے آبائی قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔

علی یاور جنگ بہادر ہندوستان ہی کے لیے قابل فخر نہ تھے بلکہ وہ شیعہ فرقے کے لیے بڑے افتخار کا سبب تھے آپ کے انتقال سے ہندوستانی قوم اور شیعہ فرقہ میں جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ مشکل ہی سے پر ہو سکے گی۔

خدا مرحوم کو بہ محمد و آل محمد اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

حسینیہ آغا باقر کی جدید تعمیر

امام باڑہ آغا باقر مرحوم لکھنؤ کا ایک قدیم اور مقبول امام باڑہ ہے جس کی تعمیر شجاع الدولہ بہادر کے عہد میں آغا باقر خان اصفہانی نے اپنے بھتیجے آغا امین دلاور جنگ کی خواہش پر کرائی تھی جو شجاع الدولہ بہادر کی فوج میں پانچ ہزار سواروں کے افسر اعلیٰ تھے۔ ابتدا میں یہ امام باڑہ چوک کی ترکاری منڈی کے قریب چند دوکانوں کے بہت سے مکانات حاصل کر کے ایک وسیع و عریض قطعہ اراضی پر بنوایا تھا۔ شروع میں یہ امام باڑہ کتنا خوبصورت اور شاندار ہوگا اس کا اندازہ صرف اس ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ محمد علی شاہ بادشاہ اودھ نے حسین آباد کا امام باڑہ جو حسین و دلکش اور عظیم الشان امام باڑہ بنوایا وہ اسی امام باڑہ کا نقش ثانی تھا لیکن نشیب و فراز زمانہ کے ہاتھوں وہ عالی شان امام باڑہ اپنی حالت پر باقی نہ رہ سکا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد انگریزوں نے امام باڑہ آصف الدولہ کو فوجی قلعہ کی حیثیت دے دی اور اس میں گورا فوج اتار دی گئی اور اس قلعہ کی حفاظت کی خاطر پانچ پانچ سو گز تک کی تمام عمارتوں کو کھدوا کر میدان بنا دیا۔ آغا باقر کا یہ عالیشان امام باڑہ بھی اسی توڑ پھوڑ کی نذر ہو گیا اور وہ حرف مکرر کی طرح صفحہ ارض سے مٹا دیا گیا۔

اسی امام باڑہ میں شاہ عالم شہنشاہ دہلی کے پوتے مرزا کاظم بخش خلف مرزا سلیمان شکوہ بھی دفن ہوئے تھے اس مناسبت سے کہ اس میں ان کے والد دفن ہوئے ہیں دہلی کے شہزادہ مرزا حیدر شکوہ نے اس قطعہ اراضی کو حاصل کر کے انجینیر صاحب کی اجازت سے امام باڑہ کی دوبارہ تعمیر کرا دی۔ مگر اب کی یہ عمارت بالکل سیدھی سادی بنائی گئی تھی۔ قطعہ اراضی کے بیچوں بیچ نالی دار

صحن کا ایک بنگلہ ڈلوا دیا گیا تھا۔ اس میں ایک خوشنما ستون کی پٹی لگی ہوئی تھی۔

پھر حالات زمانہ کے باعث امام باڑہ کی آدھی زمین اور مکان مسکونہ قرضہ کی ادائی میں ۱۸۶۲ء میں نیلام کرایا۔ دوسری مرتبہ اس کی تعمیر جناب راجہ شعبان علی خان صاحب مرحوم تعلقہ دار سلیم پور نے کرائی پھر تیسری بار ۱۸۰۸ء کے لگ بھگ راجہ امیر حسن خاں صاحب والی محمود آباد نے بنوایا۔ اس کے بعد چوتھی مرتبہ تقریباً ۱۹۰۴ء میں اس کی تعمیر ....

.... بمبئی کے ایک بوہرہ سیٹھ نے کرائی اور اب ۱۹۶۹ء کے اواخر میں لکھنؤ کے ایک مقبول و مشہور ڈاکٹر جناب سید علی رضا صاحب رضوی (قطب پور والا [illegible]) نے اپنے والد مرحوم جناب سید مظفر علی صاحب رضوی کو اس امام باڑہ میں دفن کیا اور ان کی قبر کو سفید اور رنگین ٹائل سے بڑا خوبصورت بنوایا اور اس خیال سے کہ ان کے والد مرحوم کی روح پُرفتوح کو دائمی طور پر ثواب پہونچتا رہے اس امام باڑہ کو تقریباً ازسرِ نو تعمیر کرایا۔ صحن کا سائبان ہٹا کر ۱۰۰ + ۵۰ فٹ کا سلیب لگوایا اور مشرق و مغرب کی صحنچیوں کا رقبہ ۲۰ × ۲۰ فیٹ رکھا گیا۔

اندر کا ہال بھی بڑا قابل دید ہو گیا ہے۔ رو کار بھی بہت خوبصورت بنوا دیا گیا ہے جس کا اس سے پہلے وجود نہ تھا۔ سنہری برجیاں قائم کی گئی ہیں اور اگلے حصہ پر بڑا دیدہ زیب ڈزائن بنوایا گیا ہے جو خود ڈاکٹر صاحب موصوف کی جدت پسند طبیعت کی اختراع ہے۔ ادھر ادھر برجیوں پر رنگین روشنی کے بلب لگائے گئے ہیں جو رات کی تاریکی میں امام باڑہ کی بہار کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ زائرین کی سہولت کے خیال سے صحن کے ایک گوشہ میں بیت الخلا اور حمام بھی تعمیر کرا دیئے گئے ہیں جن کی پہلے بہت کمی تھی۔ دروازوں پر آہنی کیواڑ لگوا دیئے گئے ہیں۔

غرضکہ یہ امام باڑہ پہلے کی بہ نسبت اب بہت پائدار اور خوشنما ہو گیا ہے جو انشاء اللہ عرصہ تک قائم و باقی رہے گا۔

خدا جناب ڈاکٹر رضوی صاحب کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے اس امام باڑہ کی تعمیر کر کے اور اسے لائق دید حیثیت میں منتقل کر کے اپنے والد مرحوم کے لئے ایک خیر جاریہ کا انتظام فرما دیا۔ اب جب تک یہ عمارت قائم رہے گی ڈاکٹر صاحب موصوف کا نام زندہ رہے گا اور ان کے والد مرحوم کو ہمیشہ ہمیشہ ثواب پہونچتا رہے گا۔

یہ امام باڑہ نواب شجاع الدولہ بہادر کے عہد معدلت عہد سے بہت مقبول اور مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔

یہ امام باڑہ حسینیہ آصفی سے بھی پرانا ہے جبکہ لکھنؤ میں اس سے پہلے ایک اور امام باڑہ حسین گنج کے قریب محلہ باغ بی بی آئینہ میں آغا ابو طالب خاں صاحب مرحوم نے بنوا دیا تھا جسے لکھنؤ کا پہلا عزاخانہ ہونے کا شرف حاصل تھا اس کے بعد آغا باقر خاں صاحب کے امام باڑہ کی تعمیر کی نوبت آئی جب انھوں نے اپنے بھتیجے آغا اسمٰعیل خاں پنج ہزاری کی خواہش پر "نڈی میں مارکیٹ" کی جانب مشرق متصل مسافرخانہ تعمیر کرایا جو ایسی نیک نیتی اور خوش اعتقادی کے ساتھ بنوایا تھا جس کی مقبولیت میں اتنے طویل زمانہ کے بعد کوئی کمی نہیں آئی ہے بلکہ اس میں دن رات حاجت مند اپنی حاجت براری کے لیے دعا مانگنے آتے رہتے ہیں۔ اور ان کی مرادیں پوری ہوتی رہتی ہیں۔

امام باڑہ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس میں اب تک برابر مومنین کی میتیں دفن ہوتی رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ اردو کے مایۂ ناز شاعر مرزا سوداؔ بھی اسی امام باڑہ میں مدفون ہیں جن کا انتقال ستر سال کی عمر میں ۱۱۹۵ھ میں ہوا اور جن کی تاریخ وفات مصحفی نے حسب ذیل مصرعے نکالی تھی:

سوداؔ کجا و آں سخن دل فریب او

مگر اب ان کی قبر کا نشان بھی مٹ چکا ہے۔

عرض مرتب

۱۷ دسمبر ۱۹۷۶ء کو منظر عام پر آنے والا ہفت روزہ سرفراز لکھنؤ کا مرزا دبیر نمبر کسی ہندستانی جریدے کا شایع ہونے والا پہلا دبیر نمبر ہے۔ میری محدود اطلاع کے مطابق اس سے قبل کسی ہندستانی رسالہ کا کوئی دبیر نمبر شایع نہیں ہوا ہے۔ ہر نقش اول کی طرح ہماری یہ کوشش بھی خامیوں اور کوتاہیوں سے یکسر بری نہیں۔ وقت اور وسائل دونوں ہی کی کمی کے باعث اس میں ابھی بہت کچھ ترمیم و اصلاح کی گنجائش ہے۔ وقت کی کمی کے سبب سے اس کی خاطر خواہ پروف ریڈنگ بھی ممکن نہ تھی۔ رسالہ کو محرم سے قبل وقت مقررہ پر شایع ہونا تھا۔ میں نے مضامین حاصل کرنے کی پوری لگن کے ساتھ کوشش کی۔ میں ان اہل قلم کا ممنون ہوں جنھوں نے میری استدعا پر اپنے گرانقدر مقالے مرحمت فرمائے۔

پیش نظر دبیر نمبر میں نئی اور پرانی دونوں قسم کی چیزیں شامل ہیں۔ نئے مضامین کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ دبیر نمبر کے بعض مندرجات سے اختلاف کی بھی گنجائش ہے۔ مثلاً ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب نے ازراہ کرم اس نمبر میں دبیر کا جو مرثیہ "جب کوفے میں پابند بلا ہوگئے مسلم" غیر مطبوعہ کے دعوے کے ساتھ شایع کرایا ہے وہ راقم کی اطلاع کے مطابق دبیر کے مطبوعہ مرثیوں میں شامل ہے۔

محترم ڈاکٹر نیر مسعود صاحب نے مرزا دبیر کا جو اصلاح شدہ مرثیہ شایع کرایا ہے وہ دبیر کے مطبوعہ مرثیوں میں موجود ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود صاحب کے حکم کی تعمیل کے طور پر آئندہ کبھی اس مرثیے کے مطبوعہ اور قلمی نسخے کے موازنے اور مقابلے کی کوشش کروں گا۔

بہرحال آخر میں ان حضرات کا میں پھر شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے مضامین کے لئے میری استدعا کو صدا بصحرا نہ ہونے دیا۔

(خاکسار) کاظم علی خان (ریسرچ اسکالر)
۲۰۱ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

اعلان تعطیل

محرم نمبر کے بعد دفتر اخبار میں حسب معمول تعطیل ہو جائے گی پھر آئندہ پرچہ ۱۲ محرم کو دفتر کھلنے کے بعد ۹ جنوری کو نکالا جائے گا۔ البتہ پریس میں ۵ محرم تک کام ہوتا رہے گا جس کے بعد پریس بھی ۱۲ محرم تک کے لئے بند ہو جائے گا۔

ذوالفقار ... زندہ باد

... اپنا ، جانا ، چھپانا

مکتبہ مبارک ۸۹ باغ مکا لکھنؤ ۳

[illegible] حضرت صاحب آپ لکھنؤ تشریف لئے جا رہے ہیں۔ جی ہاں سنئے: ارے صاحب کہنا کیا ہے آپ تو جانتے ہیں [illegible] اور مجھ کو کچھ کتابوں کی اشد ضرورت ہے اس لئے آپ برائے مہربانی یہ کتابیں لیتے آئیں۔ دیکھئے اس ادارے کا نام [illegible] مکتبہ مبارک ۸۹ باغ مکا لکھنؤ ۳ اور یہ اس ادارے کی کتابوں کی مختصر فہرست آپ کی ملاحظہ کیلئے

فہرست کتب مکتبہ مبارک

نہج البلاغہ مترجم مولوی ظفر مہدی صاحب	35/-	قلزم عزا	6/-	قضایا حضرت امیر المومنین	6/-
" [illegible]	35/-	اشک دیدہ	7/50	ذوالفقار (از نجم کراہانی)	1/-
" نہج البلاغہ مکمل	35/-	مجالس الشیعہ	3/50	دینیات پہلی	-/50
حسن طلب	6/-	عمدۃ المجالس	3/-	تفسیر قرآن	10/-
[illegible] الابرار مترجم	6/-	ذخیرۂ مناقب	3/-	ام المومنین حضرت عائشہ کی مکمل	
تحفۃ العوام مجلد	10/-	مرادی پھول (دس مناجاتیں)	1/-	اسوانح حیات	15/-
در مجالس	7/-	دامن مراد	1/50	(نوحہ جات)	
عرفان رسالت	5/-	سٹ مرادی کہانیاں	1/50	سرکار محشر	-/75
مفتاح البیان (حصہ اول)	4/50	تصویر کربلا (مراثی)	2/-	بیاض غم	1/-
مجلس خواتین	5/50	داستان کربلا (")	2/-	انجام وفا	1/-
مجلس خاتون مکمل	3/-	بدر العزا	7/50	پیغام وفا	1/-
فاطمہ کا چاند	3/50	شمشیر عزا	7/50	سیلاب غم (از ہاشمی رامپوری)	1/-
گنجینۂ مصائب	3/-	چہار دہ سورہ	2/50	گلدستۂ ۱۔۶ (")	1/-
سیدہ [illegible]	1/50	ہفت سورہ	1/50	کربلا کی آواز	2/-
[illegible]	3/-	دین حق	7/50	سحاب غم	1/-

[illegible] سید شہنشاہ حیدر نوگانوی ۸۹ باغ مکا لکھنؤ ۳ — باغ زہرا و جذبات زہرا 40P./-

آپ کی آسانی کیلئے



ادارہ تبلیغ و اشاعت نے ایک کتاب گھر قائم کیا ہے جس میں آپ کو تمام علوم و فنون کی کتابیں آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہیں. مثلاً قرآن مجید، دُعاؤں کی کتابیں، تعویذات، ترجمہ نہج البلاغہ، نوحے، سلام اور مرثیوں کی کتابیں، تاریخ نیز سوانح و سیرت کی کتابیں۔

چاہے یہ کتابیں ہندوستان کے کسی مطبع کی چھپی ہوں ادارہ آپ کے لئے فراہم کر دے گا. ڈاک اور وی، پی کے اخراجات آپ کو برداشت کرنا ہوں گے آرڈر کے ساتھ کُل رقم کے ایک چوتھائی حصہ کا منی آرڈر پیشگی بھیجنا ضروری ہے۔

پتہ

ادارہ عالیہ تبلیغ و اشاعت

۳۹۰/۲۰۱ درگاہ حضرت عباسؑ روڈ، رستم نگر لکھنؤ ۳

(باسمہ سبحانہ)

ماہر تعلیم علماء دین کا مرتب کردہ
شیعہ دینیات کورس

اردو ہندی گجراتی

میں تیار

تنظیم المکاتب کے خدمات سے گھر گھر فائدہ اٹھائیں

نمبرشمار	نام کتب	رسم الخط	قیمت (روپیہ — پیسہ)	تعداد جلد
۱	دینیات مکمل سٹ	اردو	۱۴ —— ۲۵	
۲	مکاتب کے رجسٹروں کا مکمل سٹ	اردو	[illegible] —— ۰۰	
۳	دینیات مکمل سٹ جوانوں کے لئے	اردو	۵ —— ۰۰	
۴	" " "	ہندی	۴ —— ۵۰	
۵	دینیات اول، دوم، سوم	گجراتی	۲ —— ۲۵	
۶	صلح حسن	اردو	۵ —— ۰۰	
۷	پیاس	"	۶ —— ۰۰	
۸	روضہ ہائے مبارک کے بہترین رنگین سات تصاویر سائز ۲۲×۲۸ مکمل سٹ		۱۰ —— ۰۰	
	ایک تصویر	-	۱ —— ۵۰	

نوٹ: کمیشن تاجروں کے لئے ۲۵ فیصدی، مکاتب کے لئے ۲۰ فیصدی، ڈاک خرچ بذمہ خریدار رہے گا۔

تنظیم المکاتب ۴/۷، جوہری محلہ لکھنؤ ۳

قومی معجزہ ــــ تنظیم المکاتب

جس کا ــــ منصوبہ ملک میں ایک ہزار مکتب قائم کرنا ہے۔

جو ــــ دینی تعلیم پر دو لاکھ روپیہ سالانہ خرچ کر رہا ہے

جو ــــ ہر مکتب کو حسب ضرورت کم از کم تیس روپیہ ماہوار اور زیادہ سے زیادہ سَو روپیہ ماہوار امداد دیتا ہے۔

جس کی ــــ نگرانی میں ملک کے نو صوبوں میں ۱۹۷ مکاتب قائم ہیں جن میں ۱۰ہزار طلاب دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

جس کا ــــ سرمایہ محفوظ دو لاکھ روپیہ ہے جو یونین بینک میں فکسڈ ڈپازٹ ہے جس سے بیس ہزار روپیہ سالانہ ادارہ کو ملتے ہیں۔ سرمایہ محفوظ صرف لائف ممبروں کی فیس سے جمع کیا جاتا ہے۔

جسے ــــ اعلم وقت سرکار آقائے خوئی مدظلہ، سرکار آقائے شریعتمدار مدظلہ قم سرکار آقائے سید باقر صدر نجف مدظلہ اور دیگر علمائے عراق و ایران کی طرف سے خمس، زکواۃ، فطرہ، قربانی کی کھال، امام ضامن اور دوسرے رقوم شرعیہ کو لینے کی اجازت حاصل ہے۔

جس کی ــــ لائف ممبری کی فیس ہزار روپیہ ہے۔ سَو روپیہ سال کر کے ادا کی جا سکتی ہے اور عمومی ممبری کی فیس ۲۵ روپیہ سالانہ ہے۔

جس کی ــــ مستقل آمدنی صرف بیس ہزار روپیہ سال ہے اور خرچ دو لاکھ روپیہ سال ہے۔

تنظیم المکاتب قومی حیات کا زندہ ثبوت ہے اس کی بھرپور مدد کیجئے تاکہ گاؤں گاؤں اور شہر شہر مکتب کھل جائیں۔

(آپکے تعاون کا منتظر)

سید غلام عسکری

سکریٹری تنظیم المکاتب ۴۷ ۔ جوہری محلہ لکھنؤ